ماہنامہ

حکایت

لاہور

نومبر 2014ء

سخت باریک ہیں امراضِ امم کے اسباب
کھول کر کہیے تو کرتا ہے بیاں کوتاہی

نورِ مُبین

تو جو لوگ آخرت (کو خریدتے اور اس) کے بدلے دُنیا کی زندگی کو بیچنا چاہتے ہیں اُن کو چاہئے کہ اللہ کی راہ میں جنگ کریں اور جو شخص اللہ کی راہ میں جنگ کرے پھر شہید ہو جائے یا غلبہ پائے ہم عنقریب اس کو بڑا ثواب دیں گے (74)

سورة النساء

جلد: 44 | نومبر 2014ء | شمارہ: 03

قانونی مشیر
وقاص شاہد ایڈووکیٹ

شعبہ تعلقات عامہ
میاں محمد ابراہیم طاہر

بانی
عنایت اللہؒ
شاہد بن عنایت اللہ

مدیر اعلیٰ: صالحہ شاہد
مدیر: عارف محمود
منتظم: سعد شاہد

سرکولیشن منیجر
فضل رزاق
عرفان جاوید

شعبہ اشتہارات
خرم اقبال
محمد اشفاق مومن

کمپوزنگ
پرائم کمپیوٹرز - لاہور

مجلس مشاورت
ابدال بیلا
عظمت فاروق
میم الف
ڈاکٹر شبیر حسین
ڈاکٹر نصیر اے شیخ
ڈاکٹر نغمہ علی
ڈاکٹر رانا محمد اقبال

قیمت -/80 روپے

مدیر: عارف محمود 0323-4329344
وقاص شاہد 0321-4616461
سرکولیشن منیجر: فضل رزاق 0343-4300564
عرفان جاوید 0322-4847677

ہیڈ آفس
26- پٹیالہ گراؤنڈ لنک میکلوڈ روڈ لاہور 042-37356541

مضامین اور تحریریں ای میل کیجیے: primecomputer.biz@gmail.com

اس شمارے میں

اس شمارے میں

پاکستان کو پاکستان نہ بننے دیا!

عرصہ دراز سے یہ پاک سرزمین بحرانی کیفیت سے دوچار ہے۔ بحران بھی ایک آدھ نہیں بلکہ بحرانوں کا انبار ہے۔ حالیہ دنوں کا ہی جائزہ لیں تو ایک طرف تقریباً اڑھائی ماہ سے دو جماعتوں نے شہر اقتدار میں دھرنے سے معیشت کو اربوں کا نقصان کا پہنچایا۔ دوسری طرف اس دھرنے میں سے ایک جماعت اب مخصوص جگہ سے ہجرت کر کے ملک کے دوسرے بڑے شہروں کے مکینوں کی اپنے دھرنے میں شمولیت سے اپنے حامیوں کا اندازہ لگائیں گے۔ اپوزیشن اپنی دُھن میں مصروف ہے اور صاحب اقتدار اپنی چاندی کو سونا بنانے میں مگن۔ اس کے لئے اسے چاہے چین جانا پڑے یا اپنے ہمسایہ ملک۔

ہمارا یہ ہمسایہ ایک ایسا ہمسایہ ہے جو پورا سال امن کی آشا کا راگ الاپتا ہے اور پھر شکرانے کے طور اپنے ڈیموں کا منہ کھول کر ہماری زراعت، معیشت اور جان و مال کو نقصان پہنچاتا ہے۔ چوکیوں کا ناجائز استعمال کرتا ہے۔ اس کے ایجنٹ گاہے بگاہے خودکش دھماکوں سے کئی گھروں کو لرزا دیتے ہیں اور ہمارے اقتدار پسند پھر بھی اُس ہمسائے کو فائدہ پہنچانے پر مُصر ہیں۔ اپنی بنیادوں کو کھوکھلا کر کے اُسے مضبوط بنا رہے ہیں۔ اپنی معیشت کا پہیہ جام کر کے اُسے فروغ دینے میں کوشاں ہیں۔ کیا یہ کھلا تضاد نہیں؟

اپوزیشن نے دوران دھرنا گاہے بگاہے اس سوئی ہوئی عوام کو جگانے کے لئے پورے ثبوت کے ساتھ صاحب اقتدار افراد کا نامۂ اعمال کھول کھول کر بیان کیا۔ اس دھرنے میں ہر اُس فرضی اور نقلی بحران کا بھی آپریشن کیا گیا جس کا عوام بُری طرح سے شکار ہے لیکن چکنے گھڑے — بابر عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست — وہی ڈھاک کے تین پات وغیرہ وغیرہ۔

انتخابات میں دھاندلی، لٹیروں کا اقتدار، مہنگائی کا جن، کرپشن کا واویلا، معیشت کا جنازہ، جاگیرداروں اور وڈیروں کی اجارہ داری، بجلی، پانی اور گیس کی قلت پر تڑپنا اپنی جگہ موجود تھا کہ سیلاب جس کا پانی اب تقریباً اتر چکا ہے لیکن اس کی تباہ کاری سے متاثرہ افراد ابھی بھی کھلے آسمان تلے بیٹھے اپنی قسمت کو کوس رہے ہیں۔ ہزاروں افراد ایک بار پھر لقمۂ اجل بن گئے۔ ہزاروں ایکڑ اراضی، ڈھور ڈنگر اور کھڑی فصلیں ضائع اور تباہ و

برباد، ہمارے بدترین انتظامی ڈھانچے کی فرسودگی کا منہ چڑا رہی ہیں۔ چڑھتے پانی کے ساتھ سب کی ہمدردیاں ہیں لیکن پانی کے اترتے ہی ذہنوں سے اُس کی تباہ کاریاں بھی اتر جاتی ہیں۔ جگہ جگہ ڈوبے، زخموں سے چُور، حالات کے مارے ہوئے افراد کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ ہر قدرتی آفت منجانب اللہ ہوتی ہے اس میں ہمارا ہمسایہ اور ہم بے قصور ہیں۔ اس آفت کو برداشت کرنا، اس کا مقابلہ کرنا اور شکر ادا کرنا ہی اُن کا فرضِ اولین ہے۔ صاحبِ اقتدار نے اربوں ڈالر لاہور کو پیرس بنانے میں لگا دیئے لیکن پاکستان کو پاکستان نہ بننے دیا۔

انسان جس کو اس خالق کائنات نے اشرف المخلوقات بنایا ہر صاحبِ اقتدار نے اسے جانوروں کی طرح زندگی گزارنے پر مجبور کیا۔ اس کی سوچ کو محدود کر دیا۔ روٹی، کپڑے اور مکان کے چکر میں الجھا دیا۔ وقت اور حالات کا تقاضا تھا کہ ہر صاحبِ اقتدار اپنے ہاتھ کمر کے پیچھے باندھ کر انتظامی ڈھانچے میں مناسب تبدیلیاں کر کے اس پاک سرزمین کو ہر آلائش سے پاک کرتا۔ قدرتی آفات سے نمٹنے اور مقابلہ کرنے کے لئے ترجیحی بنیادوں پر توجہ دی جاتی بلکہ عملی جامہ پہنایا جاتا۔ ڈیمز تعمیر کر کے اضافی پانی سے بجلی پیدا کرتے اور گاڑیوں کو گیس فراہم کرنے کی بجائے گھروں اور کارخانوں کو آباد کر کے معیشت کے رکے پہیے کو چلایا جاتا تاکہ عوام کو ریلیف ملتا اور روزگار کو بے روزگار نہ کیا جاتا تاکہ اُن سے پیدا ہونے والے خطرات جنم نہ لیتے۔

بس ایک ہی غلطی پیہم کرتے رہے ساری زندگی ہم\
دھول چہرے پہ تھی، صاف آئینہ کرتے رہے ہم

صالحہ شاہد بنت عنایت اللہ

ایصالِ ثواب

16 نومبر 2014ء کو بانی ''حکایت'' محترم عنایت اللہ کی 14ویں برسی ہے۔ قارئین ''حکایت'' سے التماس ہے کہ وہ مرحوم کی روح کو ایصالِ ثواب بھیج کر ثواب دارین حاصل کریں۔

(ادارہ)

میں کس کے ہاتھ پہ تیرا لہو تلاش کروں؟

سی ایس پی عیبہ کی پُراسرار موت

پولیس اور تفتیش کرنے والوں نے عیبہ کی موت کو "عشق میں ناکامی" پر خودکشی قرار دیا ہے مگر حقائق و شواہد کچھ اور کہانی سنا رہے ہیں۔

☆ .... سید بدر سعید

وہ "سرکاری خودکشی" سے قبل ہنستے ہوئے کیک کھا رہی تھی؟

زیادہ تر شواہد اس ہلاکت کو قتل ظاہر کر رہے ہیں

دروازہ اندر سے بند تھا لیکن کھڑکی کے ٹوٹے شیشے پر خون کے دھبے کوئی اور داستان سناتے ہیں

جلنے سے پندرہ منٹ قبل عیبہ اپنی بہن سے لیپ ٹاپ پر خوشگوار موڈ میں بات کر رہی تھی

کراچی کے ایک نمبر سے عیبہ کو دھمکی آمیز پیغامات بھیجے جا رہے تھے

عیبہ کے والد کو بھتہ خوروں کے خلاف کھڑے ہونے پر قتل کیا گیا تھا

یہ عجیب خودکشی تھی کہ مرنے سے قبل عیبہ خوشگوار موڈ میں کیک کھاتی رہی

خاتون آفیسر نے مٹی کا تیل تین دن قبل منگوایا تھا اور خودسوزی کے وقت آدھی بوتل بچا کر رکھ لی

جلتے وقت عیبہ نے نہ تو کسی کو مدد کے لئے پکارا اور نہ ہی باقی تیل کی بوتل کو آگ لگی۔

عیبہ کو آگ لگانے سے قبل بے ہوش کر دیا گیا تھا؟

خاتون افسر کو کسی نے خودسوزی کرتے نہیں دیکھا لیکن پولیس نے آتے ہی اسے خودکشی قرار دے دیا۔

اس سے قبل نیب کے افسر کامران فیصل کی تشدد زدہ لاش کو بھی خودکشی قرار دیا جا چکا ہے

☆☆☆

لاہور کی تربیتی اکیڈمی میں سی ایس پی افسر کی پُراسرار ہلاکت اب خودکشی قرار دی جا رہی ہے۔ اس سے قبل نیب کے افسر کامران فیصل کی تشدد زدہ لاش کو بھی خودکشی میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ کامران فیصل کی طرح عیبہ کی پُراسرار ہلاکت بھی ایسے کئی سوال اٹھا رہی ہے جو

ظاہر کرتے ہیں کہ اس کیس کو خودکشی قرار دے کر اپنی نااہلی اور سازشوں پر پردہ ڈالا جا رہا ہے یا تو قاتل نے دستانے پہن رکھے ہیں یا پھر اسے بچانے والے اس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جن کے نزدیک کسی کی موت کوئی معانی نہیں رکھتی۔ اگر چند سوالوں کو حل کر لیا جائے تو یقیناً یہ واضح ہو جائے گا کہ یہ خودکشی تھی یا پھر ایک بھیانک قتل؟

اکتوبر کے تیسرے ہفتے کراچی کی سی ایس پی خاتون افسر لاہور کے ہوسٹل میں پُراسرار طور پر آگ سے جل کر ہلاک ہو گئی تھی۔ یہ واقعہ گلبرگ لاہور میں آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کے ہاسٹل میں پیش آیا جس نے بہت سے سوال اٹھا دیے ہیں۔ یہ ایک پُراسرار واقعہ ہے جسے پہلے خودکشی پھر قتل اور پھر دوبارہ خودکشی قرار دیا گیا ہے۔ عیبہ کراچی کی رہائشی اور 41 ویں کامن کی آفیسر تھی۔ اسے سات ماہ کی ٹریننگ میں بہترین ٹرینی کا ایوارڈ ملا تھا۔ اس کی ساتھی آفیسرز کے مطابق وہ مذہبی ذہن کی مالک مضبوط اعصاب کی لڑکی تھی۔

اس قتل یا خودکشی نے اپنے پیچھے متعدد سوال چھوڑ دیے ہیں جو ابھی تک حل طلب ہیں۔ سوال یہ ہے کہ پاکستان کے سب سے بڑے سول سروسز کے امتحان میں کامیاب ہونے والی ایسی لڑکی جو دوران تربیت بیسٹ ٹرینی کا ایوارڈ بھی حاصل کر لیتی ہے اس قدر مایوس کیسے ہو سکتی ہے؟ اس کے سامنے بھرپور کیریئر تھا۔ اس نے بیسٹ ٹرینی ایوارڈ جیت کر یہ بھی ثابت کیا کہ وہ اس دوران کسی ایسی الجھن یا پریشانی کا شکار نہیں تھی جس سے اس کی کارکردگی پر فرق پڑتا۔ خودکشی کے دن بھی وہ اپنی کلاس میں نظر آئی اور سب معمول کے مطابق تھا۔ اس دن اس کی اپنے گھر والوں سے بات بھی ہوئی اور وہ ان سے ہنسی مذاق کر رہی تھی۔

اس کی بہن جویریہ کا کہنا ہے کہ فون پر گفتگو کرتے ہوئے وہ کیک بھی کھا رہی تھی۔ ایسا کم از کم خودکشی کرنے والے کے ساتھ نہیں ہوتا کہ وہ خودکشی سے قبل ہنسی مذاق کرے اور کیک کھائے۔ خودکشی کسی انتہائی مایوسی کی علامت ہے۔ ایسا شخص کم از کم کچھ لمحے قبل تک تو پریشانی کا شکار نظر آتا ہے۔ عیبہ کیس میں ایسا کچھ سامنے نہیں آیا۔ وہ مکمل اطمینان سے اپنی کلاس میں آتی ہے سارا وقت معمول کے مطابق گزارتی ہے اور شام کو اس کی جلی ہوئی لاش ملتی ہے۔ ایک اور اہم بات یہ بھی ہے کہ اس حادثے سے پندرہ منٹ قبل عیبہ اپنی بہن سے خوشگوار موڈ میں لیپ ٹاپ پر بات کر رہی تھی۔

اس کیس کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ اس نے کپڑوں پر گریس کا داغ لگنے کا کہہ کر ایک لٹر مٹی کا تیل منگوایا یہ مٹی کا تیل اس کے کمرے میں تین دن سے تھا۔ ان تین دنوں میں اس نے نہ تو خودکشی کی اور نہ ہی اس کی حرکات و سکنات سے ایسا محسوس ہوا۔ تین دن بعد جب وہ مری تو معلوم ہوا کہ یہی مٹی کا تیل اس پر چھڑکا گیا تھا۔ اس کی جلی ہوئی لاش کے ساتھ کمرے سے مٹی کے تیل کی آدھی بوتل بھی ملی۔ یہ بوتل سامنے ہی رکھی ہوئی تھی۔

اب ہم خودکشی کے نفسیاتی پہلو کو دیکھتے ہیں عموماً مٹی کا تیل چھڑک کر خود کو آگ لگانے والا اپنے اوپر ساری بوتل خالی کر لیتا ہے۔ وہ آدھی بوتل بچا کر نہیں رکھتا۔ ایسے کئی مناظر آپ نے سرعام خودسوزی کرنے والوں کی ویڈیوز میں دیکھے ہوں گے۔ ایسی ویڈیوز پاکستان کے نیوز چینلز پر بھی چلائی جا چکی ہیں۔ عیبہ نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے آدھی بوتل اپنے اوپر چھڑکی اور آدھی بچا کر رکھ لی۔ اس لیے سوال اٹھتا ہے کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟ دوسری جانب یہ ممکن ہے کہ قاتل نے جلدی جلدی اس پر مٹی کا تیل چھڑکا اور بوتل ایک طرف رکھ کر اسے آگ لگا دی۔ اس عمل میں آدھی بوتل بچ جانے کا جواز نظر آتا ہے کیونکہ قاتل کو جلدی ہوتی ہے اور اسے اپنا کام مکمل کر کے فرار ہونا ہوتا ہے۔ عیبہ کے

کمرے سے آدھی بوتل کا برآمد ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس پر مٹی کا تیل چھڑکنے والا کوئی اور تھا۔

عیسیٰ کیس میں ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ حالات و واقعات کے مطابق جلنے سے قبل عیسیٰ اپنے ہوش وحواس میں نہیں تھی۔ دیگر الفاظ میں وہ بے ہوش تھی یا پھر پہلے ہی مر چکی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب عیسیٰ آگ میں جل رہی تھی تو کسی نے اس کی چیخ و پکار نہیں سنی وہ دروازے کے قریب تھی لیکن اس نے نہ تو دروازہ کھولنے کی کوشش کی اور نہ ہی دروازہ کھٹکھٹایا۔ کمرے میں عیسیٰ تو آگ میں جل کر ہلاک ہوگئی لیکن اس آگ نے کمرے کے سامان کو اس طرح نہیں جلایا جیسا کہ ایسے کیسز میں ہوتا ہے۔ اب آگ میں جلنے والے کی عمومی کیفیت دیکھیں فرانزک ٹیسٹ کے ماہرین کے مطابق خودسوزی کرنے والا کتنا ہی مضبوط اعصاب کا مالک کیوں نہ ہو، وہ آگ کا سامنا نہیں کر پاتا جب کسی شخص کو آگ لگتی ہے اور اس کا جسم شعلوں کی زد میں آتا ہے تو وہ اپنا ارادہ بدل دیتا ہے۔ خودسوزی کرنے والا نہ صرف چیختا چلاتا ہے بلکہ اپنے آپ کو بچانے کی بھی کوشش کرتا ہے۔ وہ مختلف چیزوں سے ٹکراتا ہے۔ عیسیٰ کیس میں ایسا کچھ نہیں ہوا۔

یہ انتہائی افسانوی اور غیر حقیقی منظر ہوگا کہ عیسیٰ نے خود پر مٹی کا تیل چھڑکا اور آدھی بوتل بچا کر رکھ لی پھر اس نے خود کو آگ لگائی۔ اس کے سر کے بال جلے، چہرہ اور بالائی جسم بھی جلنے لگا۔ اس کی آنکھوں کو آگ لگنے لگی اور وہ اطمینان سے آخری لمحوں تک کھڑی رہی۔ اس نے نہ تو کوئی چیخ ماری نہ وہ اس طرح کمرے کے سامان سے ٹکرائی کہ کمرے کا سامان بھی آگ پکڑتا اور نہ ہی اس نے چند قدم کے فاصلے پر موجود دروازے کی طرف جانے کی کوشش کی۔ وہ مکمل اطمینان سے آگ میں جلتی رہی اور پھر نیچے گر کر مرگئی۔ اس کے برعکس یہ ممکن ہے کہ کسی قاتل نے پہلے اسے بے ہوش یا قتل کیا اور پھر آگ لگا کر خودکشی کا رنگ دے دیا۔ اس صورت میں اسے نہ تو چیخنے چلانے کی ہوش تھی اور نہ کسی چیز سے ٹکرانا یا کسی کو مدد کے لیے پکارنا تھا۔ وہ بے ہوشی کے عالم میں ہی جل مری۔ اس طرح یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جب عیسیٰ آگ میں جل رہی تھی تو مٹی کے تیل کی آدھی بھری بوتل اس آگ سے محفوظ کیسے رہی؟

اس کیس میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ عیسیٰ کے کمرے کو اندر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ اس بنیاد پر اسے خودکشی قرار دیا جاتا رہا لیکن یہ بات نظر انداز کردی گئی کہ اس کمرے کی کھڑکی کے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے۔ ذرائع کے مطابق کھڑکی کے ایک ٹوٹے ہوئے شیشے پر خون کے دھبوں کے شواہد بھی ملے ہیں۔ پولیس ذرائع کے مطابق اس بات کا امکان بھی موجود ہے کہ عیسیٰ کو قتل کر کے شواہد مٹانے کے لئے آگ لگائی گئی ہو۔

پولیس اور تفتیش کرنے والوں نے عیسیٰ کی موت کو ”عشق میں ناکامی پر خودکشی“ قرار دیا ہے۔ اس کے لیپ ٹاپ اور موبائل ریکارڈ سے کراچی کا ایک تاجر ”عمر“ دریافت کیا گیا ہے جس سے محبت اور ناکامی کو خودسوزی کی وجہ قرار دیا گیا۔ دوسری جانب یہ بھی یاد رہے کہ ہم جس دور میں رہ رہے ہیں یہاں ایسے چیٹ اور ریکارڈ ہر

انتقال

معروف قلمکار، محقق، شاعر محترم **اختر حسین شیخ** 9 نومبر بروز اتوار قضائے الٰہی سے انتقال کر گئے۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ

اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل۔ ادارہ اس غم میں برابر کا شریک ہے۔

قارئین سے دعائے مغفرت کی گزارش ہے!

دوسرے بندے کے موبائل یا لیپ ٹاپ سے برآمد ہو جاتا ہے۔ یہ انٹرنیٹ اور چیٹنگ کا زمانہ ہے اور اکثر نوجوان محض "ٹائم پاس" کے لئے بھی ایسی "چیٹنگ کہانی" سے لطف اندوز ہورہے ہیں خود عیبہ کے لیپ ٹاپ سے گزشتہ دو تین ماہ کے پیغامات کا جو ریکارڈ ملا اس کے مطابق وہ کراچی کے تین افراد اور لاہور کے دو افراد سے چیٹنگ کر رہی تھی۔ ان پیغامات کا ریکارڈ اب قانون نافذ کرنے والے اداروں کے پاس ہے۔ اس کے موبائل میں دھمکی آمیز پیغامات کی بھرمار تھی جس نمبر سے دھمکیاں دی گئیں وہ کراچی کا نمبر ہے جو کہ اب بند ہے۔

اس کیس کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اگر عیبہ کو قتل کیا جاتا تو اس سے بہت سے اہم اداروں اور افراد کی اہلیت اور انتظامی قابلیت پر بھی حرف آتا ہے۔ خودکشی میں یہ سب کافی حد تک بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔ پولیس جب ہاسٹل پہنچی تو عیبہ مر چکی تھی لیکن پولیس نے اس وقت اسے خودکشی قرار دے دیا۔ اس وقت تک تو ابتدائی تفتیش بھی مکمل نہ ہوئی تھی اور نہ ہی کسی نے عیبہ کو خودسوزی کرتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد اکیڈمی کی جانب سے قتل کا مقدمہ درج کرایا گیا کیونکہ عیبہ کا خاندان اکیڈمی کے خلاف قتل کا مقدمہ درج کرانے کی دھمکی دے رہا تھا۔ پولیس اور اکیڈمی نے میڈیا سمیت کسی کو جائے وقوعہ پر نہیں جانے دیا۔ وہاں سے جو بھی رپورٹ باہر آئی وہ انہی کے ذریعے آئی۔ یہاں تک کہ عیبہ کی والدہ کو بھی کمرہ دکھانے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا گیا۔

عیبہ کے والد ماہر تعلیم تھے اور انہیں بھتہ مافیا کے خلاف کھڑے ہونے پر قتل کر دیا گیا تھا۔ اب عیبہ کی فائل پر بھی "خودکشی" کی مہر لگائی جا رہی ہے بالکل ویسے ہی جیسے اعلیٰ شخصیات کے خلاف تحقیقات کرنے والے نیب افسر کامران فیصل کی تشدد زدہ لاش کو خودکشی میں بدل دیا گیا تھا۔ آج بھی کئی سوال کامران فیصل کی خودکشی رپورٹ کا تعاقب کر رہے ہیں۔ شاید ایسے ہی عیبہ کی خودکشی رپورٹ کو بھی متعدد سوالات کا سامنا کرنا ہوگا۔ یہ سوالات ہمارے تفتیشی نظام، انصاف اور سکیورٹی حصار پر بھی اٹھتے رہیں گے۔ اگر ہم انہیں حل نہ کر پائے تو مستقبل میں بھی کئی فیصل اور عیبہ پُراسرار طور پر مرنے کے بعد خودکشی کی فائلوں میں دفن ہوتے رہیں گے اور قاتل اپنے دامن پر خون کے دھبے لیے آزاد پھرتے رہیں گے۔

(تحقیقی صحافی سید بدر سعید کی یہ تحریر "نوائے وقت گروپ" نے شائع کی تھی۔ جسے اہمیت کے پیشِ نظر ادارے کے شکریہ کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے)

دھوبی گھاٹ

سرکار! ہم ٹیڑھی بنیادوں پر کھڑے غلط سمت پر چلتی قوم کے افراد ہیں۔
اپنے کندھے کا رومال دھوبی گھاٹ میں بھگو کے اس کا ایک کونا
ہمیں پکڑا کے نچوڑ دیں۔ بھلے کہیں کوئی تریڑ آجائے۔

☆ ابدال بیلا

ہر گھر، ہر دفتر اور ہر ملک مسجد کی طرح ہوتا ہے۔ اگر مسجد کی طرح کسی گھر، کسی دفتر یا کسی ملک کا قبلہ درست نہ ہو تو بسائی ہوئی بستی کیا پوری سلطنت ٹیڑھی ہو جاتی ہے۔

یہاں میں مسجد کی جگہ صرف عبادت گاہ کا لفظ نہیں لکھ سکتا۔ مسجد کے علاوہ دنیا کی کسی عبادت گاہ میں عبادت کے لئے مخصوص رخ کے تعین پر اصرار نہیں ہے اور کوئی مسجد ایسی نہیں ہوتی جس کا قبلہ اگر صحیح سمت میں نہ ہو تو اس میں پڑھی نماز مسنون ہو۔ مسجد وہی ہے جس کا قبلہ صحیح سمت میں ہے۔ سمت کے رُخ کا تعین ہر مسجد، ہر گھر اور ہر ملک کی ترجیح اوّل ہے۔

کوئی ساڑھے چار سو سال پہلے کی بات ہے۔

مغل بادشاہ شاہ جہان کا دور تھا۔ دہلی میں جامعہ مسجد بنائی گئی۔ کہتے ہیں جب پہلی بار بادشاہ اپنے وزیروں مشیروں کے ساتھ مسجد دیکھنے پہنچا تو اس کے ذی عقل مشیر نے حساب کتاب لگا کے بادشاہ کو بتایا کہ مسجد لاکھ خوش رنگ اور خوشنما سہی مگر پوری کی پوری عمارت ٹیڑھی ہے۔ اس لئے کہ مسجد کا قبلہ صحیح سمت میں نہیں۔ جس رُخ پہ اسے ہونا چاہئے تھا اس سے ہٹا ہوا ہے۔ ظاہر ہے ہر مسجد کی تعمیر ہی اس کے قبلے کے رُخ کے حساب سے ہوتی ہے۔ جب قبلہ صحیح سمت میں نہ ہو تو پوری کی پوری وسیع و عریض سرخ پتھر پوش، پھول بوٹوں سے مزین خوشنما، شان و شوکت سے دمکتی بنی مسجد کی ساری عمارت ٹیڑھی ہو گی۔

معمار کا رنگ پیلا ہو گیا۔

مزدوروں کے ہاتھوں میں پسینہ آ گیا۔

چند لمحے پہلے وہ سب انعام کے لالچ میں بادشاہ کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ اب عتاب کے ڈر سے انہیں بادشاہ سے آنکھ ملانے کا حوصلہ نہ تھا۔ ایک وزیر با تدبیر تھا۔ اس نے بادشاہ کا غصہ ٹھنڈا کیا۔

کہا چند دن معمار کو مہلت دیجئے۔

یہ کوئی اہتمام کرے۔

مسجد کا قبلہ درست کرے۔

معمار کو کچھ دن کی مہلت تو مل گئی مگر اس کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔ وہ کوئی گتے کا بنا کھلونا تھوڑی تھا۔ ہزار ہا گز کے طول و عرض میں اپنے عہد کی بنی دنیا کی سب سے بڑی مسجد تھی۔ چار چار ہاتھ چوڑے پتھر کی سلوں کی اس کی دیواریں تھیں۔ اونچی محرابیں، آسمان کو چھوتے مینار اور گزوں زمین کے اندر ہر دیوار اور مینار کی بنیادیں۔

وہ سمجھ گیا وہ دن دور نہیں جب اسی مسجد کے مینار جیسے بھاری کسی ہاتھی کے پاؤں کے نیچے دبا کے اسے مارے جانے کا حکم آئے گا۔ مگر ابھی اسے چند دنوں کی مہلت تھی۔ وہ شہر سے باہر ویرانے میں جا کے پاگلوں کی طرح ہر سمت میں خدا کو سجدے کرنے لگا۔ روتے ہوئے، سسکیاں لیتے وہ خدا سے التجا کرتا۔

اے خدا، تُو ہر طرف ہے۔

مشرق اور مغرب سب تیرے لئے ہیں۔

ہاں، تیری عبادت کے لئے بنائی گئی مسجد میں تیرے بتائے ہوئے رُخ کا خیال رکھنا ضروری تھا۔

مجھ سے بھول ہوگئی۔

میری مدد فرما۔

میں ہار گیا۔

مجھ سے سمت نہ طے ہوئی۔

تُو طے کر دے۔

کہتے ہیں، وہ جنگل میں آہ و بکا کر رہا تھا کہ وہاں کسی مجذوب کا گزر ہوا۔ وہ معمار کو بلکتے ہوئے دیکھ کے زور زور سے ہنسنے لگا اور ہنستے ہنستے بولا۔

تجھے اپنے فن تعمیر پر بڑا گھمنڈ تھا۔

اسی گھمنڈ نے تجھ سے صحیح ترجیحات طے کرنے کی صلاحیت چھین لی۔

تُو کاشی گری، نقاشی اور پھول پتیوں کی تراش خراش میں ایسا کھو گیا کہ تجھ سے اصل رُخ کی چوک ہوگئی۔

ہے نا؟

معمار تو دل ہی دل میں خدا سے اپنا رونا رو رہا تھا۔

پھر وہ جنگل بیابان

نہ بندہ اِدھر کوئی شناسا،

نہ کسی سے جان پہچان

روح تک اس کی کانپی ہوئی تھی، اتنا پریشان

بے نام،

گم نام،

بدرنگ قبا میں ملبوس مارے مارے پھرتا ہوا، مجذوب کے منہ سے اپنی ساری بپتا سن کے بجھ گیا، مدد آ گئی۔

ہاتھ جوڑ کے اس کے آگے بیٹھ گیا۔

بولا، بابا آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔

میں مارا گیا۔

مجھ سے چوک ہوگئی۔

ساری مسجد ٹیڑھی بن گئی۔

قبلہ صحیح سمت نہ رکھ سکا۔

میری مدد فرمایئے۔

مجذوب مسکرا کے بولا۔ بالک، تیری اسی بپتا کو سن کے خدا نے مجھے تیری طرف بھیجا ہے۔ من یہ ٹیڑھا پن پہلے پہل اندر کے کسی میلے پن سے وجود میں آتا ہے۔ مگر تیرے لئے خوشخبری ہے۔

من یا تن کا کوئی میل ایسا نہیں جو شرمندگی سے آئے، آنکھ میں چند آنسوؤں سے ڈھل نہ جائے۔

لگتا ہے خدا نے تیری فریاد سن لی ہے۔

اب غور سے سن۔

اِدھر دہلی سے اٹھ کے لاہور سے ملتان جاتے راستے کے درمیان میں کہیں راوی کنارے ایک دھوبی گھاٹ ہے، وہاں پہ جا۔ وہاں ایک خمیدہ کمر سفید ریش

درویش دریا کنارے کپڑے دھونے کا دھوبی گھاٹ لگائے بیٹھا ہے۔اس کے پاس جا۔جا کے اسے میرا سلام کہنا اور اپنی کہانی سنانا۔ وہ اُدھر کھڑے کھڑے تیری مہاں ہی سیدھے رُخ پہ موڑ دے گا۔

ہیں جی؟

ہاں جی!

ایسا ہو سکتا ہے؟

اللہ کرے گا۔

وہی کر سکتا ہے۔

جی، بے شک۔

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔

معمار نے مجذوب کے ہاتھ چومے اور گھوڑے پہ سوار ہو کے بتائی ہوئی منزل کی تلاش میں نکل پڑا۔ لاہور سے ملتان کی راہ ان دنوں راوی کے کنارے کنارے ہوا کرتی تھی۔ وہ راوی کنارے بنی سڑک پہ لاہور سے ملتان کی طرف چلا گیا۔ جب وہ دونوں شہروں کی درمیانی جگہ سے تھوڑا آگے بڑھا تو اسے وہ دھوبی گھاٹ نظر آ گیا۔

وہ دھوبی گھاٹ الگ تھا۔

لگتا تھا یہاں صرف کپڑے ہی نہیں ہر میلی شے دھوئی جاتی ہے۔

ایک پُر نور چہرے والا سفید ریش، کمر خمیدہ درویش دھوبی گھاٹ پہ میلے کپڑوں کی گٹھڑی کھولے، ہر کپڑے کا میلا پن مل مل کے دھو رہا تھا۔ میلے کپڑے اس اُجلے دھوبی کے ہاتھ میں آتے ہی دمکنے لگتے۔ میل کچیل بدرنگ، بدہیئت کپڑوں سے یوں نکل جاتا جیسے کوتوال کو دیکھ کر چور بھاگتے ہیں۔

معمار سمجھ گیا۔

وہ صحیح جگہ پہنچ گیا ہے۔

سنیچر کا دن تھا۔

صبح سے کا وقت، دریا کنارے اجالا اندھیرا پھاڑ کے سر نکال رہا تھا۔ اس کے اپنے اندر اُجلے جذبوں نے سر اٹھایا اور وہ ہاتھ جوڑ کے دھوبی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

بولا سرکار! دلی سے آیا ہوں۔

دھوبی نے ہاتھ میں پکڑے گیلے میلے کپڑے کو دھوبی گھاٹ کی سل پر پٹخا اور ایک آنکھ اٹھا کے نو وارد کی طرف دیکھ کے مسکراتے ہوئے بولا۔

تجھے اُس نے ادھر بھیج دیا۔

جی سرکار!

معمار کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

مالک اندر کا ہر میل ٹیڑھے پن کو جنم دیتا ہے۔

یہیں سے ترجیحات کے سہارے قدم اٹھتے ہیں۔

اپنی ذات کا گھمنڈ کبھی سیدھے رُخ کی نشاندہی نہیں کرنے دیتا۔

ہمیشہ ٹیڑھا راستہ دکھاتا ہے۔

تُو دل میلا نہ کر۔

ہم انسان ہیں۔

سب میلے بندے ہیں۔

میل دھونے کا میں تو سوانگ رچاتا ہوں۔

اندر باہر کا ہر میل وہ خود ہی دھوتا ہے۔

اسی کا حکم چلتا ہے، بالکل اِدھر بھی دھوبی گھاٹ کے میلے پن میں نور کی پیوندکاری اُسی کے اشارے سے ہوتی ہے۔

سمجھ گیا تُو؟

جی سرکار!

اسی کی توفیق سے دھوبی گھاٹ میں برکت آتی ہے۔

ورنہ کس کی طاقت ہے جو اندر کے فتور کا رُخ بدل لے۔

چڑھے ہوئے رنگ کو کاٹنے پھر نیا کوئی رنگ چڑھا

دے۔

بابا، اپنی کہی بات کی کسی رمز پہ سر ہلانے لگا۔ کچھ لمحے خاموش رہا۔ پھر بولا۔ پتر! دل ہولا نہ کر، حوصلہ رکھ۔

تن پہ چڑھے کپڑے کبھی بھی اتنے میلے نہیں ہوتے جتنا میلے من سے اتری روحوں کا میل ہوتا ہے۔ میں خود میلا بندہ ہوں۔ لوگوں کے تن کا میل اس لئے دھونے پر لگا ہوں کہ شاید خدا کو ترس آ جائے اور وہ میرا میلا پن دھو ڈالے۔ تم اس دھوبی گھاٹ پہ آتے ہی اُجلے ہو گئے۔

اب میں کیا کروں۔

معمار نے ہاتھ جوڑے، بولا۔ سرکار! آپ بھیدی ہیں۔

مسجد کا قبلہ ٹیڑھا بن گیا، پوری عمارت ٹیڑھی ہو گئی۔

چند دن کی مہلت ملی ہے۔ مسجد کا ٹیڑھا پن سیدھا نہ ہوا تو میں مارا جاؤں گا۔ میری مدد فرمایئے۔

دھوبی گھاٹ پر کھڑا دھوبی میاں عبدالحکیم تھا۔

جہاں وہ کھڑا تھا آج وہاں ایک قصبہ انہی کے نام سے کھڑا ہے۔ میاں عبدالحکیم نے ہاتھ میں دریا پانی سے دھو کے نکالی ہوئی ایک سفید چادر پکڑی ہوئی تھی۔ اسی چادر کا ایک سرا معمار کو پکڑا کے قبلہ رُخ کھڑے ہو کے بولے۔

تو اسے پکڑ۔ میرے ساتھ زور لگا۔ دھلائی کا کام تو تیرے آنسو کر چکے۔

اب مل کر اسے نچوڑتے ہیں۔

زور لگاؤ۔

دونوں نے ایک دوسرے کی الٹی سمت میں چادر کو ہاتھ میں پکڑ کے بل دیئے۔

پانی بوند بوند چادر سے ٹپکنے لگا۔

جیسے شرمندہ آنکھوں سے آنسو گرتے ہیں۔

وہ بل دیتے گئے۔

آخر چادر کے اندر سے تڑک کی آواز آئی۔ یوں محسوس ہوا جیسے زیادہ زور دینے سے چادر کے اندر کا کوئی کونا پچک کے پھٹ گیا ہو۔ میاں جی نے معمار کے ہاتھ سے چادر لے لی اور مسکرا کے بولے۔ جا تیری ٹیڑھی مسجد سیدھی ہو گئی۔ جیسے اِدھر کپڑے میں ذرا سی ضرب آ گئی ہے، لگتا ہے کہ تیری مسجد سیدھی ہوتے ہوتے کہیں ذرا تڑک گئی ہے۔

فکر نہ کر، اس کا رخ سیدھا ہو گیا ہے۔

جا میرا اچھا!

اپنی مسجد میں جا کے شکرانے کے نفل پڑھ۔

معمار بھاگم بھاگ دہلی پہنچا۔

اُدھر پہنچا تو حیران۔

مسجد کا رُخ بدلا ہوا تھا۔ قبلہ سیدھا صحیح سمت میں تھا۔

وہ خوشی سے نہال ہو گیا۔ پوری مسجد کے اندر۔ بھاگ بھاگ کے ہر دیوار، ہر ستون دیکھنے لگا۔ ایک طرف کی دیوار میں تھوڑی سی تریڑ تھی۔ جیسے نچوڑتے سے کپڑے میں آئی تھی۔ اس نے مسجد میں موجود لوگوں کو اکٹھا کیا۔ پوچھنے لگا۔

یہ کب ہوا؟

کچھ لوگ اس واقعے کے عینی شاہد تھے، بولے۔ یہ پچھلے سنیچر کی بات ہے۔ صبح کی ساعتیں تھیں۔ ہم بیٹھے تسبیح پھیر رہے تھے کہ ایک دم سے زلزلہ آ گیا۔ مسجد کی دیواریں ستون چھت اور قبلے کی محرابیں سب اپنی جگہ سے سرکنے لگیں۔ عجیب سا شور تھا۔ ہم سہم گئے۔ پھر ادھر اس دیوار میں تڑاک سے آواز آئی۔ یہ دراڑ پڑ گئی۔ زلزلہ رک گیا۔ کافی دیر بعد ہمارے اوسان بحال ہوئے تو ہمیں احساس ہوا کہ مسجد کا رُخ سیدھا ہو گیا ہے۔

یہ سب کیسے ہوا؟ کس نے کیا؟

معمار نے صحیح رُخ پہ قبلے پر سر جھکا دیا۔

سجدے میں گر گیا۔
پتہ نہیں کتنی دیر صحیح رخ پر کیے سجدے میں پڑا رہا۔
آنسوؤں کی بوندا باندی سے خود کو نچوڑتا موسلا دھار ہو گیا۔
تڑاک تڑاک کی آوازیں اسے اندر ہی اندر کہیں اپنے من میں سنائی دیتی رہیں۔ اس کے اندر کے سارے رخ سیدھے ہونے لگے۔
اس کا شاہی معمار ہونے کا گھمنڈ تو کب سے اترا ہوا تھا۔
اس لمحے وہ عاجزی اور بندگی کی اس معراج پہ پہنچا ہوا تھا جب میلے من میں اجالے کی پیوندکاری ہوتی ہے۔
جب انسان کو اللہ کے قرب کا اصل رُخ ملتا ہے۔
جب وہ اپنے جسم و جاں سے اپنی روح کو الگ کر کے دھوبی گھاٹ پر چڑھا اپنے میلے پن کو دھونے میں مصروف ہوتا ہے۔ ایسے لمحے اندر میل کا کوئی دھبہ نہیں رہتا۔ کوئی ذی روح کائنات بھر میں اُسے بُرا نہیں لگتا۔ ساری برائیاں صرف اسے اپنے من سے جڑی نظر آتی ہیں۔
ایسی آنکھیں بنا دھوبی گھاٹ پہ چڑھے کہاں ملتی ہیں۔
جنہیں ایسی آنکھیں نصیب ہو جائیں۔
وہ دوسروں کے عیب سے ناآشنا رہتی ہیں۔
اپنے عیبوں سے آشنائی حاصل کر کے توبہ کے آنسو بہاتی ہیں۔
ایسے آنسو ہر میلے پن کو دھونے کی طاقت رکھتے ہیں۔
سوچتا ہوں۔
کبھی جا کے میاں عبدالحکیم کی پرانی بیٹھوں اور ہاتھ جوڑ کے کہوں۔ سرکار! ہم ٹیڑھی بنیادوں پر کھڑے غلط سمت پر چلتی قوم کے افراد ہیں۔ اپنے کندھے کا رومال دھوبی گھاٹ میں بھگو کے اس کا ایک کونا ہمیں پکڑا کے نچوڑ دیں۔ بھلے کہیں کوئی تریڑ آ جائے۔
کسی طرح تو ہمارا قومی قبلہ درست ہو۔
کسی طرح بھیڑ بکریاں سمجھ کے ہمیں ہانکنے والے گڈریے اپنی ترجیحات بدل لیں۔
وہ اپنی ذات کے لئے نہ جئیں۔
اپنے حصے کی تھوڑی سی چھاؤں ہمیں بھی دے دیں۔
ہم مدت سے دھوپ میں پڑے جل رہے ہیں۔
ہمیں ہانکنے والوں کو اس کا شعور دے دیں۔
کچھ ایسا چمتکار کریں کہ ہم ساری قوم اپنی ہوس کاری اور ذاتی مصلحتوں سے نکل کے خدا کی دی ہوئی سب سے بڑی نعمت اپنے پاکستان کو بنائیں، سجائیں، اسے اپنا گھر سمجھیں، اسے اپنی مسجد بنا لیں، اس ملک میں ہر طرح کے فساد سے بچیں، یہاں کا کوئی باسی دوسرے دیس باسی کو دھوکا نہ دے، دھکا نہ دے۔ جیسے ہم اپنا گھر صاف ستھرا اور پاکیزہ رکھنے کی سعی کرتے ہیں اسی طرح پورے کے ملک کو خوبصورت خوش حال اور پوتر رکھیں۔
یہاں کے رکھوالے ہمیں نہ لوٹیں، ہمارے ساتھ عدل کریں۔ یہاں کے سارے لوگ امن میں رہیں۔
سمجھ نہیں آتی اتنی ساری باتیں کہنے میں اکیلا کیسے جاؤں؟
میاں جی کے پاس کس منہ سے جاؤں؟
ابھی شرمندگی، شرمساری اور ندامت بھرے اتنے آنسو نہیں بہائے کہ اندر کا میلا پن دھلے۔
اپنے من کو دھویا ہی نہیں تو اسے نچوڑنے کے لئے وہاں کیسے پہنچوں؟
اپنے دیس کی ٹیڑھی ہوئی مسجد کا قبلہ کیسے درست کرواؤں؟

◆○◆

اجلے لوگ

زندگی کے بڑے بڑے حقائق پر مشتمل چھوٹے چھوٹے سچے واقعات

☆ حبیب اشرف صبوحی

ہمارے معاشرے کے اردگرد ماحول میں بے شمار ایسے واقعات اور ایسے کردار نظر آتے ہیں جن کو دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے کہ وہ لوگ اپنی محنت سے اپنے کردار سے اور اپنی حکمت عملی سے اپنی زندگی کو تبدیل کر دیتے ہیں اور انمٹ نقوش چھوڑ جاتے ہیں اور ان کی نسلیں بھی تبدیل ہو جاتی ہیں۔ کچھ ایسے ہی واقعات پیش کرنا چاہتا ہوں۔

☆......ہمارے ایک قریبی عزیز جن کی واجبی سی تعلیم تھی، ایک ادارے میں ملازم تھے۔ بڑی معمولی پوسٹ تھی لیکن اپنی محنت اور ایمانداری کی وجہ سے انہوں نے ادارے میں بڑا نام کمایا اور چند سالوں میں ایک اچھی پوسٹ پر تعیناتی ہو گئی۔ جب اُن کو اپنے روزگار سے اطمینان ہو گیا تو انہوں نے ایک اچھے خاندان میں ایک بڑی پڑھی لکھی لڑکی سے شادی کر لی اتفاق سے جس روز اُن کی شادی ہوئی اس کے دوسرے دن ان کی نوکری چھوٹ گئی اور اُن پر ادارے والوں نے ایسا الزام لگا دیا کہ نہ اُس کی عدالت میں اپیل ہو سکتی تھی اور نہ ہی کوئی سفارش کام آ سکتی تھی۔ مجبور ہو کر گھر بیٹھ گئے اور روٹی کے لالے پڑ گئے۔

سب نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ رزق عورت کے مقدر سے آتا ہے۔ یہ عورت ایسی سبز قدم آئی کہ اپنے خاوند کا رزق بھی ختم کرا دیا۔ نئی نویلی دلہن کے کانوں میں بھی یہ الفاظ پہنچے۔ اُس نے صبر اور تحمل کے ساتھ یہ الفاظ برداشت کئے۔ جو دن رات سیر و تفریح اور دعوتیں اڑانے کے تھے۔ اُس نے اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا شروع کر دیا۔ کوئی نماز اور کوئی وظیفہ ایسا نہ تھا جو اُس نے چھوڑا ہو۔ بہر حال بڑی کوششوں اور محنت کے بعد ایک دُکان پر سیلز مین کی نوکری مل گئی۔ اُسی دوران خلیجی ریاستوں میں ملازمت کے مواقع نکل آئے اور ہمارے اُن عزیز کے سالے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے ایک آئل کمپنی میں ملازمت مل گئی اور وہ دہران چلے گئے۔

کچھ عرصے بعد انہوں نے اپنی بہن اور بہنوئی کو وہاں بلوالیا اور اپنی کمپنی میں ملازمت دلوا دی۔ کئی سال انہوں نے وہاں ملازمت کی اور وہاں سے واپس آ کر

کراچی میں بہت شاندار گھر وغیرہ بنوایا۔ بچوں کو بہت اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ تمام بچے ملک سے باہر ہیں اور انہوں نے والدین کو بھی اپنے پاس بلوالیا۔

میں اپنی عزیزہ سے مذاق میں کہتا ہوں۔ بھائی آپ اللہ تعالیٰ کے پیچھے ایسی ہاتھ دھو کر پڑیں کہ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اسے نوازنا ہی پڑے گا ورنہ یہ میری جان نہیں چھوڑے گی۔ وہ کہنے لگیں کہ واقعی یہ حقیقت تھی کہ شادی سے پہلے میں نماز نہیں پڑتی تھی۔ شادی کے بعد جو حالات آئے اور لوگوں کی قسم قسم کی باتیں سنیں۔ میں نے بہتر یہی سمجھا کہ کسی سے لڑائی کرنے یا دل میں بغض پیدا کرنے سے بہتر ہے کہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لیں اور اُسی سے راہنمائی حاصل کریں اور اللہ کا شکر ہے کہ اُس نے مجھے دینی اور دنیاوی نعمتوں سے نوازا۔ اگر میں وقت پر نماز اور دیگر عبادات نہ کروں تو بے چینی سی ہونے لگتی ہے۔ اگر اللہ کو یاد کریں تو وہ بھی یاد کرتا ہے۔

☆......آج سے تقریباً 20 سال قبل میرے گھر ڈاکہ پڑا۔ صبح 2 ڈاکو گھر میں گھس آئے اور گن پوائنٹ پر آدھا گھنٹہ گھر پر رہے۔ تمام زیور اور نقدی لے گئے۔ اس واردات سے ایک روز قبل میرے داماد کے بہنوئی جو میرے گھر کے نزدیک ہی رہتے تھے، اپنی شادی کا تمام زیور ہمارے گھر رکھوا کر کراچی چلے گئے تھے کیونکہ اُن کے والد کا اچانک انتقال ہو گیا تھا۔ وہ زیور کئی لاکھ روپے کا تھا۔ جب دوستوں اور رشتہ داروں کو اس ناگہانی واقعہ کا پتہ چلا تو افسوس کے لئے آئے۔ ان میں دو حضرات کا تذکرہ کرنا ضروری سمجھوں گا۔ ایک ہمارے پڑوسی جو انتہائی نیک اور اللہ والے بزرگ تھے۔ شام کو افسوس کے لئے آئے اور کہا کہ آپ کا نقصان تو بہت زیادہ ہوا ہے۔ اس کو تو میں پورا نہیں کر سکتا۔ البتہ میرے بیٹے نے آج ہی پچاس ہزار روپے بھیجے تھے۔ میری خواہش اور خوشی ہے اس کو قبول کر لیں اور زبردستی میرے ہاتھ میں پیسے پکڑا دیئے۔ میں نے پیسے لے کر رکھ لئے۔ کچھ دیر کے بعد جب وہ جانے لگے تو میں نے اُن سے کہا کہ آپ کی خوشی کے لئے میں نے پیسے رکھ لئے تھے لیکن اب آپ جا رہے ہیں تو اسے لیتے جائیں۔

آپ کے خلوص اور جذبہ ہمدردی کا شکریہ صرف اللہ تعالیٰ کے دینے سے پوری پڑتی ہے۔ بندہ کے دینے سے پوری نہیں پڑتی۔ بہرحال بڑی مشکل سے اُن کو پیسے واپس کئے۔ اسی طرح میرے ایک بہت قریبی دوست رمضان چشتی صاحب اپنی بیگم صاحبہ کے ساتھ تین دن متواتر آتے رہے کہ آپ کا جتنا نقصان ہوا ہے۔ ہمارے ساتھ بازار چلیں۔ اپنی مرضی کا زیور خرید لیں۔ ہم نے اُن کا شکریہ ادا کیا اور جذبہ ایثار کو سراہا۔ دوسری طرف میرے داماد کے بہنوئی جن کا یہ زیور گیا تھا۔ ہم نے اُن سے کہا کہ آپ کا جتنا زیور گیا ہے وہ نقصان پورا کرنے کے لئے ہم تیار ہیں۔ انہوں نے کہا کہ جانے والی چیز چلی گئی۔ اگر آپ سے نہیں جاتی تو ہم سے چلی جاتی۔

اس تمام واقعہ کا روشن پہلو یہ ہے کہ ان لوگوں کی نیتیں اتنی اچھی تھیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو اتنا نوازا دینی اور دنیاوی لحاظ سے کہ وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ بات صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ نیک نیت کا پھل ضرور دیتا ہے۔

☆......میں جس کمپنی میں کام کرتا تھا کمپنی جب سال کے آخر میں اپنے منافع کا اعلان کرتی تھی تو لیبر لاء (Labour Law) کے تحت ڈھائی فیصد منافع اپنے کارکنوں میں تقسیم کرتی تھی جو ایک خطیر رقم ہوتی تھی اور ہر کارکن کو اس رقم کا انتظار ہوتا تھا لیکن اُن کارکنوں میں ایک کارکن لال خاں بھی ہوتا تھا جو ایک ہیلپر کے طور پر کام کرتا تھا اور بڑی قلیل تنخواہ تھی لیکن بڑا خوددار، نیک اور اصولوں کا پابند تھا۔ جب اس کو یہ رقم ملتی تھی تو وہ یہ رقم کمپنی کو واپس کر دیتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ رقم سود کے طور پر

حاصل ہوئی ہے، میں اُسے قبول نہیں کرتا۔ ہم اسے کہتے تھے کہ یہ رقم وصول کرلو اور اپنے ہاتھ سے ضرورتمندوں میں تقسیم کردو۔ وہ کہتا تھا کہ میں اپنی حق حلال کی کمائی سے ضرورتمندوں میں رقم تقسیم کرتا ہوں، سود کی مدنی کو غریبوں میں تقسیم کرنا گناہ سمجھتا ہوں۔

☆......میرے چچا حافظ قرآن تھے اور آپ کو یہ شرف حاصل تھا کہ آپ نے مسجد نبوی میں نماز تراویح سنائی تھی۔ نہایت ایمان دار اور اصول پسند آدمی تھے۔ زندگی کے آخری ایام میں اُن کو دمہ کی شکایت ہوگئی تھی۔ بہت سانس پھول جاتا تھا۔ بات کرنی مشکل ہو جاتی تھی۔ ایک روز میں اُن سے ملنے گیا تو اُن کو دمہ کا دورہ پڑ گیا۔ سانس لینے میں مشکل ہو رہی تھی۔ میں نے اُن سے کہا کہ آپ کسی اچھے ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھاتے؟ کہنے لگے میں نے دکھایا تھا اس نے گولیاں لکھ کر دی ہیں۔ جب میں وہ گولی کھالیتا ہوں تو پانچ چھ گھنٹے آرام سے گزر جاتے ہیں۔ پھر وہی دورہ پڑ جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ پھر پانچ چھ گھنٹے بعد گولی کھالیا کریں۔ کہنے لگے کہ گولی مہنگی بہت ہے جو میری استطاعت سے باہر ہے۔ میں نے اُن سے کہا کہ آپ کو جتنی دوائی چاہئے لکھ کر مجھے دے دیں میں لا کر دے دوں گا۔ چچا نے کہا کہ تم گولیاں کہاں سے لا کر دو گے؟ میں نے کہا کہ ہماری کمپنی کا یہ قانون ہے کہ اگر ہم کمپنی ڈاکٹر سے کوئی دوا لکھوالیں اور بازار سے خرید کر اس کی رسید پر ڈاکٹر سے دستخط کروا لیں تو وہ پیسے ہمیں مل جاتے ہیں۔ یہ سن کر چچا بہت ناراض ہوئے اور کہنے لگے کہ یہ دوائی لینے کی سہولت صرف تم کو اور تمہاری فیملی کو ہے، مجھ کو نہیں۔ یہ بات تم نے آج کہہ دی ہے، آج کے بعد مت کہنا۔ یہ سخت بے ایمانی ہے اور ایمان خراب ہوتا ہے۔ میں یہ سوچتا رہا کہ میں نے اپنی نا سمجھی میں اتنی بڑی بات ان کو کہہ دی۔ میں ان کو یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ جیسے آپ کے دوسرے بچے ہیں، میں بھی آپ کا بچہ ہوں۔ میرا بھی فرض ہے کہ آپ کی خدمت کروں لیکن نا سمجھی میں غلط بات کہہ گیا۔ اگر ان کی جگہ کوئی اور دنیادار ہوتا تو کہتا کہ مجھے تو شفاء سے مطلب ہے چاہے جیسے مرضی حاصل ہو لیکن جو لوگ اللہ والے ہوتے ہیں وہ زندگی کے ہر معاملے میں بڑے محتاط ہوتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ رزق حلال کھائیں۔

☆......زندگی کے چالیس سال ایک ادارے میں ملازمت کی۔ اس دوران بے شمار ایسے لوگ دیکھے جو رزق حلال کو عبادت سمجھتے تھے اور نہایت ایمانداری، محنت اور اچھے اصولوں کو اپنا شعار بنایا ہوا تھا۔ ہمارے ایک آفیسر تھے جب وہ دفتر آتے تو چپڑاسی اُن کو سلام کرتا اور اُن کے کمرے کا دروازہ کھولتا۔ وہ چپڑاسی سے کہتے کہ باہر سے میں آتا ہوں، سلام کرنا میرا فرض ہے لیکن تم پہلے سلام کرکے سبقت لے جاتے ہو اور ثواب حاصل کر لیتے ہو۔ وہ اپنے سٹاف پر اس بات پر زور دیتے کہ سلام اور مصافحہ کرنے سے محبت میں اضافہ ہوتا ہے اور کینہ دور ہوتا ہے۔

☆......میں اپنے ایک اسسٹنٹ کو کبھی نہیں بھولوں گا۔ چار سال وہ میرے ماتحت رہا، اس دوران اس نے نہ کبھی کوئی چھٹی کی اور نہ کبھی میڈیکل بل جمع کرایا۔ میں اس کی سالانہ کارکردگی رپورٹ میں ان دونوں باتوں کا ذکر نمایاں کرتا تھا اور ہر سال اُس کو انتظامیہ کی طرف سے ''تعریفی خط'' ملتا تھا اور انہی رپورٹوں کی بناء پر اس کو آفیسر بنا دیا گیا۔

☆......ایک ٹائپسٹ جس کو اپنے کام کا اتنا احساس ذمہ داری تھی کہ وہ سارا دن بڑی محنت اور ایمانداری سے کام کرتا تھا اور جو کام بقایا رہ جاتا تھا وہ گھر لے جاتا تھا۔ گھر میں اُس نے ایک اپنی ذاتی ٹائپنگ مشین رکھی ہوئی تھی جس پر وہ کام کرتا تھا اور کوئی اوور ٹائم وغیرہ کلیم نہیں کرتا تھا۔

☆......ہمارے ایک ساتھی سپرنٹنڈنٹ کے عہدہ پر کام کرتے تھے، ریٹائر فوجی تھے۔ بہت ایماندار اور خاموش کوکارکن تھے۔ اکثر سرکاری کام سے دفتر سے باہر جاتے تھے۔ ان کو کمپنی قانون کے مطابق اس بات کی اجازت تھی کہ وہ رکشے میں جائیں اور رکشے میں آئیں لیکن وہ بسوں اور سواری کے تانگوں میں سفر کرتے تھے اور پندرہ روز بعد جو مجموعی پیسے خرچ ہوتے تھے وہ کلیم کر لیتے تھے جو واجبی سی رقم ہوتی تھی۔ کئی دفعہ ان کے آفیسر نے ان سے کہا کہ آپ اپنی صحت اور اپنے آپ کو تکلیف میں کیوں ڈالتے ہیں؟ آرام سے رکشے میں جایا کریں۔ وہ کہتے تھے کہ اس ملک کو ہم نے بنانا ہے اور مضبوط کرنا ہے اور جس ادارے میں ہم کام کر رہے ہیں وہ بھی اسی طرح مضبوط ہوسکتا ہے کہ ہم ایمانداری اور جذبہ حب الوطنی سے کام لیں۔ یہ اُن کی بڑی اچھی سوچ تھی۔

☆......میرے ایک دوست جو پشاور میں رہتے تھے ایک سرکاری محکمے میں اکاؤنٹینٹ کے طور پر کام کرتے تھے اور شام کو پارٹ ٹائم ایک ادارے میں کام کرتے تھے۔ ماشاء اللہ عیال دار تھے۔ چھ لڑکیاں اور ایک لڑکا تھا۔ نہایت ایماندار اور غریب پرور آدمی تھے۔ وہ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کے خواہش مند تھے اور اس کے لیے فکرمند رہتے تھے۔ میں کافی عرصہ اُن سے نہیں ملا۔ اتفاق سے ایک سرکاری کام کے سلسلے میں پشاور جانا ہوا۔ اُن کا گھر تلاش کرتے ہوئے اُن تک پہنچا۔ بہت کمزور ہو گئے تھے۔ بڑی محبت سے پیش آئے۔ جب میں نے اُن کے بچوں کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ ان کی چھ لڑکیوں میں سے پانچ ڈاکٹر بن گئی ہیں اور ایک لڑکی بینک میں آفیسر ہوگئی ہے۔ بیٹے نے فارمیسی میں ڈگری حاصل کر لی ہے اور میڈیسن کمپنی میں آفیسر ہے۔ چار بیٹیوں کی شادی ہو چکی ہے اور وہ اپنے گھر میں بہت

خوش ہیں۔ چند ماہ بعد میں یہ کرایہ کا مکان چھوڑ دوں گا اور حیات آباد اپنے نئے گھر میں شفٹ ہو جاؤں گا۔

میں نے کہا کہ آپ اپنے بچوں کے بارے میں بڑے فکرمند رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ پر خاص فضل کیا اور آپ کے سارے مسئلے حل ہوئے اور توقعات سے زیادہ کامیابیاں ہوئیں۔ اس پر میرے دوست نے مجھے ایک واقعہ سنایا کہ ان سب کامیابیوں کے پیچھے ایک بیوہ کی دعائیں ہیں ورنہ میں اپنی قلیل آمدنی میں یہ اخراجات پورے نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے بتایا کہ جب سقوطِ مشرقی پاکستان ہوا تو ہماری ایک عزیزہ مشرقی پاکستان میں رہتی تھیں جو بڑی مالدار تھی اور غریب پرور عورت تھی۔ اچھے وقت میں جب وہ پاکستان آتی تھی تو رشتہ دار اُس کو اپنے گھر میں ٹھہرانا فخر سمجھتے تھے اور بڑی آؤ بھگت کرتے تھے۔ جب وہ عورت لٹی پٹی اور خستہ حال کراچی پہنچی تو ہر رشتہ دار نے اُسے بوجھ سمجھا اور ایک دو روز سے زیادہ اپنے گھر میں نہیں ٹھہرایا۔ جب مجھے اس کے حالات کا پتہ چلا تو اس کو لینے کراچی پہنچا۔ اپنے ساتھ کراچی سے لے کر آیا اور کہا کہ آپ اب اسی گھر میں رہیں اور ان شاء اللہ آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ وہ اٹھتے بیٹھتے مجھے دعائیں دیتی تھی۔ میں نے اور میرے بچوں نے اس کی بے پناہ خدمت کی۔ کئی سال وہ ہمارے گھر رہی۔ جب وہ اس دنیا سے جانے لگی تو اس نے کہا۔ ”بیٹا! میں اس دنیا میں نہیں ہوں گی لیکن تم اور تمہارے بچے عیش کریں گے“۔ شاید یہ اس کی دعاؤں کا نتیجہ ہے کہ میرے بچوں نے اتنی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ میرے سارے بچوں نے وظیفے حاصل کئے اور مجھ پر بوجھ نہیں بنے۔ میرا ایک بہت بڑی رقم کا پرائز بانڈ نکل آیا۔ حیات آباد میں قرعہ اندازی میں ایک کنال کا پلاٹ نکل آیا اور سارے کام خود بخود ہوتے چلے گئے۔ بچیوں کی شادیاں بھی اچھے گھرانوں میں ہو گئیں۔ سسرال والوں نے بھی کوئی جہیز وغیرہ کا مطالبہ نہیں کیا۔ یہ سچ ہے کہ نیکی کبھی رائیگاں نہیں جاتی اور دعائیں رنگ لاتی ہیں۔

☆......ایک روز کہیں جاتے ہوئے مغرب کی نماز کا وقت آ گیا۔ میں نماز کی ادائیگی کے لئے ایک قریبی مسجد میں گیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک بہت ضعیف شخص جس کے کپڑے بڑے بوسیدہ تھے اور پاؤں کے چپل بھی ٹوٹے ہوئے تھے۔ وزن اٹھائے ہوئے مسجد میں داخل ہوا۔ ایک بڑا سا بانس تھا اور اس کے دونوں کناروں پر بڑے بڑے تھال لٹکے ہوئے تھے جن میں چنے، میٹھی اور پھیکی پھلیاں اور دوسری کئی قسم کی بچوں کے کھانے پینے کی چیزیں موجود تھیں۔ ان بزرگ نے بڑے خشوع و خضوع سے وضو کیا۔ نماز ادا کی، نماز ادا کرنے کے بعد انہوں نے اپنا وزن اٹھا لیا۔ مجھے ان بزرگ سے محبت ہو گئی اور میرا دل چاہا کہ ان کی خدمت کروں۔ میں ان کے پاس گیا اور سلام کرنے کے بعد کچھ رقم اُن کے ہاتھ میں دینی چاہی۔ انہوں نے سختی سے میرا ہاتھ جھٹک دیا اور غصے میں کہا کہ میں مانگنے والا نہیں ہوں۔ میں محنت کر کے کھاتا ہوں اور محنت کرنے والا اللہ کا دوست ہوتا ہے۔ میں نے کہا باباجی میں یہ رقم آپ کو نہیں دے رہا ہوں۔ بلکہ اس مقصد کے لئے دے رہا ہوں کہ آپ بچوں میں یہ چیزیں فروخت کرتے ہیں۔ بعض بچے یہ چیزیں خریدنے کے متحمل نہیں ہوتے اس رقم سے آپ اُن بچوں کو مفت چیزیں دے سکتے ہیں۔ بزرگ نے کہا۔ آپ حاتم طائی ہوں گے، اپنے گھر میں۔ مجھ میں بھی رحمدلی اور سخاوت کے جراثیم موجود ہیں۔ ایسے بچے جو پیسے نہیں دے سکتے۔ میں اُن کو مفت چیزیں دے دیتا ہوں۔ میں نے اس کی یہ باتیں سن کر اُس کی عظمت کو سلام کیا اور سوچتا رہا کہ بعض لوگ غریب ہوتے ہوئے بھی بڑے غریب پرور اور عظیم لوگ ہوتے ہیں۔

●□●

باکسنگ

کھیلوں کے میدان میں ہونے والی انوکھی بے ایمانیوں اور نورا کشتیوں کی دلچسپ رُوداد۔

☆............ راوی: سمندر خان ولد دریا خان / تحریر: ربانی عبدالجبار

میرا اصل نام یہ ہی ہے۔ ولدیت لکھنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ نیویارک میں میرے ایک ہم نام خان بہادر اور بھی ہیں لیکن اُن کی ولدیت میرے بزرگوں سے بالکل مختلف ہے۔ اب میں زیادہ تمہید نہیں باندھوں گا اس کے پڑھنے سے آپ کو اندازہ ہو جائے کہ میری اس تحریر میں کس قدر سچائی ہے اور بس۔

میں امریکہ میں جون 1974ء میں آیا تھا۔ بی ون (B-1) ویزہ جسے کاروباری ویزہ کہتے ہیں، قونصلر امریکہ کے آفس، اُس وقت یہ آفس ظفر علی روڈ گلبرگ لاہور میں واقع تھا، یہاں سے مجھے باآسانی امریکہ کا ویزہ مل گیا تھا۔ اس وقت واکس قونصلر امریکہ کے آفس میں میرے سوا اور کوئی ویزہ لینے کے لئے موجود ہی نہیں تھا۔ چھ ماہ کے اندر مجھے پاکستان چھوڑ کر امریکہ آنا میرے لئے ضروری تھا۔ لہٰذا میں 27 اگست 1974ء کی رات تقریباً دو بجے کراچی سے بذریعہ شامی عرب ائرلائن دوسرے دن دمشق پہنچ گیا۔ امریکہ جانے کے لئے مجھے اس وقت کوئی ڈائریکٹ ائرلائن کی ٹکٹ نہ مل سکی تھی۔ اگر میں اس کی بھی تفصیل لکھوں گا تو یہ سچا واقعہ کم ایک سیاحت نامہ کی تحریر بن جائے گی۔

دمشق میں بہ حالت مجبوری مجھے تین دن رکنا پڑا لہٰذا میں یہاں اُن تین دنوں کا ایک واقعہ لکھنے پر ہی اکتفا کرتا ہوں اور وہ یہ کہ وہاں مسجد بنوامیہ میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کی قبر مبارک ہے جنہیں انگریزی میں Saint John کہتے ہیں۔ اس کا مجھے پہلے ہرگز علم نہ تھا، دوسرے مجھے وہاں ایک شامی طالب علم جسے عمدہ انگریزی بھی آتی تھی، نے بتایا کہ اس مسجد کے دروازہ کے باہر کالے برقع میں جو نوجوان عورت ایک بچہ کے ساتھ کھڑی بھیک مانگ رہی ہے وہ پاکستانی ہے اور وہ فقیر بھی

نہیں ہے بلکہ کچھ رقم کے بدلے جسم فروشی کر رہی ہے۔ نماز ظہر کے بعد میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ اپنے بچے کے ساتھ کئی روز سے یہاں کھڑی بھیک کیوں مانگ رہی ہے؟ اس نے بتایا کہ وہ کراچی کی رہنے والی ہے اور اس کا خاوند اُسے چھوڑ کر پاکستان فرار ہو چکا ہے۔ اگر میں اُس کو کراچی کی ٹکٹ لے دوں تو وہ ابھی اسی وقت وطن واپس چلی جائے گی۔ میرے کہنے پر کہ میں ابھی اسے ٹکٹ دلوا دیتا ہوں، میرے ساتھ پاکستانی سفارت خانے چلو وہ مجھے چکر دے کر غائب ہوگئی۔

تیسرے روز میں سوئس (Swiss) ائرلائن سے یونان پہنچ گیا وہاں بذریعہ ٹی ڈبلیو اے (یہ ائر لائن اب ختم ہو چکی ہے) نیویارک جان ایف کینیڈی ائرپورٹ سے، اپنے ایک دوست حیوانات کے ڈاکٹر کے پتہ پر نیویارک کے علاقہ برانکس (Bronix) پہنچ گیا۔ اس زمانے میں یعنی 1974ء میں امریکہ کو پاکستان سے ایک کثیر تعداد میں ویٹرنری ڈاکٹرز جسے عام لفظوں میں ہم "ڈنگر ڈاکٹر" بھی کہتے کی اشد ضرورت تھی۔ یہاں ایک ایک اپارٹمنٹ میں سات سے آٹھ تک تمام پاکستانی ڈاکٹروں سے بھرے ہوئے تھے۔ ان سب کا تعلق زیادہ تر پنجاب سے تھا۔ یہ سب بااخلاق اور مہذب لوگ تھے۔ میری انہوں نے نہایت اچھی رہنمائی کی میرا سوشل سیکورٹی کارڈ بنوایا اور ملازمت دلوائی۔ پھر آہستہ آہستہ یہ ڈاکٹرز بکھر گئے اور اپنے پروفیشن یعنی بحیثیت ڈاکٹر حیوانات کے امتحانات پاس کر کے مختلف ریاستوں میں اچھی ملازمتوں پر کام کرنے لگ گئے۔

مجھے سیکورٹی گارڈ کا کام کرتے تقریباً دو برس ہو گئے لیکن میرے پاس ابھی تک امریکہ میں مستقل رہائش رکھنے کے لئے گرین کارڈ نہیں تھا۔ صرف میرا کاروباری ویزہ ہر چھ ماہ کے بعد توسیع ہو جاتا تھا۔ اس وقت عام پاکستانیوں کے معاشی حالات امیگریشن توانین میں نرمی کی وجہ سے بھی بہتر تھے۔ نائن الیون کے بعد ہزاروں کی تعداد میں پاکستانی نیویارک کے علاقہ بروکلین سے اپنے گھر اور کاروبار بہت کم داموں میں فروخت کر کے واپس وطن جا چکے ہیں۔ مجھے اسی کمپنی میں جس کا نام کرک سیکورٹی کمپنی تھا، کے دفتر میں بحیثیت کلرک کام کرنے کی ملازمت مل گئی۔ کمپنی کے مالک کا نام ولیم برازیل تھا جسے سب بل برازیل کے نام سے یاد کرتے تھے۔ امریکہ میں جس کا نام ولیم ہوتا ہے اُسے سب امریکن بل (Bill) کے نام سے بلاتے ہیں۔ جیسے سابق امریکی صدر بل کلنٹن کا اصل نام ولیم جیفرسن کلنٹن ہے لیکن وہ دنیا میں بل کلنٹن کے نام سے ہی پکارے جاتے ہیں۔

میں نے تین ماہ رات دن کر کے محنت سے کام سیکھا اور کامیاب رہا۔ مسٹر بل اپنے زمانے کا یعنی اس سے 20 سال قبل لائٹ ہیوی ویٹ میں امریکہ کا سابق چیمپئن بھی تھا۔ ایک روز سب ملازمین دفتر کو بلا کر اس نے دریافت کیا کہ اُسے ڈبلیو بی اے ورلڈ باکسنگ ایسوسی ایشن کی طرف سے لائٹ ہیوی ویٹ مقابلے کرانے کا لائسنس مل گیا ہے اور کسی ملازم نے اُس کے ساتھ سرمایہ لگانا ہے تو اُسے نقصان ہرگز نہیں ہوگا۔ قصہ مختصر میں نے دس ہزار ڈالر بل کو دے دیئے۔ اللہ مالک ہے میں نے خود سے کہا، دیکھا جائے گا۔ قارئین کی معلومات کے لئے عرض ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں باکسنگ کی صرف دو بڑی اتھارٹیز ہیں ایک ورلڈ باکسنگ ایسوسی ایشن اور دوسری ورلڈ باکسنگ کونسل (W.B.C) اور کسی بھی پیشہ ور باکسر کو ان دونوں میں سے ایک کا ممبر اور لائسنس ہولڈر ہونا قانونی طور سے لازمی ہے۔

بل نے نارتھ کیرولینا کے چیمپئن موسیٰ بی تمارا کو تین برس کے لئے سائن کیا۔ موسیٰ افریقہ کا نوجوان مسلمان گرین کارڈ ہولڈر باکسر تھا اور اس کے مقابلہ کے لئے

مسٹر رین کوٹ (Rain Coat) ریاست کیلیفورنیا کا چیمپئن تھا۔ اس کے پروموٹر سے معاہدہ ہو گیا۔ رین کوٹ ڈبلیو بی سی کا ممبر اور ایک تجربہ کار لائٹ ہیوی ویٹ باکسر تھا لیکن موسیٰ سے عمر میں چھ سال بڑا تھا۔ قد میں موسیٰ پانچ فٹ دس انچ اور رین کوٹ کا قد چھ فٹ تھا۔ ان کی پہلی باکسنگ فائٹ نیویارک کے مشہور سپورٹس ہال میڈیسن سکوائر گارڈن میں ہو رہی تھی۔ میرے پاس رنگ کے قریب بیٹھنے کا فری پاس تھا۔

میرے دو منٹ لیٹ ہونے کی وجہ سے پہلا راؤنڈ شروع ہو چکا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ رین کوٹ موسیٰ پر حاوی ہونے کی بھرپور کوشش کر رہا ہے۔ دو بار اس نے موسیٰ کو دھکیل کر رنگ کے کونے میں کھڑا کر کے مکوں کی بارش بھی کی۔ موسیٰ اپنا دفاع کرتا رہا اور پہلے راؤنڈ کے ختم ہونے کی گھنٹی بج گئی۔ دونوں باکسر کو ایک دوسرے کے مخالف کونوں میں بٹھا کر پانی سے شاور دے کر تولیے سے منہ صاف کر کے منہ میں دوبارہ دانتوں کے نیچے موم لگا ہی رہے تھے کہ اتنے میں آفس کی ایڈمنسٹریشن سیکرٹری شرلی جونز سوئمنگ کا لباس پہنے راؤنڈ نمبر 2 کا کارڈ بورڈ اٹھائے رنگ میں گھومتی ہوئی چند سیکنڈ میرے سامنے کھڑے ہو کر مسکرائی سر کو ہلکا سا جھکا کر رنگ کا چکر ختم کر کے اپنی سیٹ پر جا بیٹھی۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے راؤنڈ کی گھنٹی بج گئی۔

دوسرے راؤنڈ کے دوسرے منٹ میں رین کوٹ نے اپنے دائیں مکے سے موسیٰ کو فلور پر گرا دیا۔ ریفری نے مقابلہ روک کر ایک سے دس تک گننا شروع کر دیا۔ ابھی ریفری نے سات تک ہی گنا تھا کہ موسیٰ اچھل کر دوبارہ کھڑا ہو گیا۔ ایمانداری کی بات ہے کہ اس نازک موقع پر مجھے شدت جذبات سے پسینہ آ گیا۔ مجھے دس ہزار ڈالر کے نقصان سے کہیں زیادہ موسیٰ کے یوں مار کھانے کا زیادہ دکھ ہو رہا تھا۔ آخر کیوں؟ موسیٰ کسی بھی رنگ یا قومیت سے ہو مسلمان تو تھا۔ دوسرا راؤنڈ بھی اسی طرح دونوں باکسروں نے ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے گزار دیا۔ پھر وہی عمل اور شرلی کا چکر لگا کر میرے سامنے چند سیکنڈ رک کر چلے جانا۔ تیسرے راؤنڈ میں ایک نئی مصیبت نے موسیٰ کو آن گھیرا۔ ہوا یوں کہ رین کوٹ کے لفٹ ہک (KLeft Hook) سے موسیٰ کی دائیں آنکھ کے نیچے زخم ہونے کی وجہ سے خون بہنے لگا۔ بل نے بحیثیت موسیٰ کے منیجر ہونے کے مقابلہ نہیں رکوایا لہٰذا تیسرے راؤنڈ کے ختم ہونے کی گھنٹی بج گئی۔ میں نے سکھ کا سانس لیا۔ ڈاکٹر نے موسیٰ کے زخم میں فوراً اینٹی سیپٹک (Anti Septic) پاؤڈر بھر کر منہ صاف کر دیا جس سے فوراً خون رک گیا۔ پانی کا ایک ہلکا سا گھونٹ پینے کے بعد موسیٰ تازہ دم نظر آ رہا تھا اور پھر تھوڑے سے آرام کے بعد راؤنڈ نمبر 4 شروع ہو گیا۔

موسیٰ جس کی پہلے تین راؤنڈز میں بے حد پٹائی ہوئی تھی ابھی تک پورے اعتماد کے ساتھ چاک و چوبند کھڑا رین کوٹ کا مقابلہ کر رہا تھا۔ جب کہ مجھے یوں محسوس ہوا کہ رین کوٹ کچھ تھکا ہوا سا ہے اور موسیٰ کی پرفارمنس میں ابھی تک کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی۔

موسیٰ! پیچھو ہٹو!" اچانک بل چلایا۔ اس دوران رین کوٹ ذرا آگے بڑھا ہی تھا کہ موسیٰ نے بجلی کی تیزی کے ساتھ الٹے ہاتھ کا سیدھا مکا (Straight Punch) رین کوٹ کے دائیں جبڑے پر پوری قوت سے جڑ دیا جو رین کوٹ کی دائیں آنکھ کی کھال کا نچلا حصہ کاٹ کر اسے ادھ موا کر گیا۔ آہستہ آہستہ خون بہنے سے رین کوٹ کی آنکھ بند ہونے لگی۔ اس موقع پر رین کوٹ کے منیجر نے بھی مقابلہ نہ رکوایا لہٰذا قاعدہ کے مطابق فائٹ جاری رہی۔ موسیٰ نے رین کوٹ کی اس اچانک پریشانی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دو سید ھے مکے اور رسید کر دیے۔ اس چار نمبر راؤنڈ میں رین کوٹ ناک آؤٹ

(Knock Out) تو نہ ہو سکا لیکن موسیٰ نے رین کوٹ کو مار مار کر اُس کا کچومر نکال دیا۔ راؤنڈ نمبر 4 چار کے ختم ہونے کی گھنٹی نے رین کوٹ کو شکست سے بچا لیا۔

راؤنڈ نمبر 5 کی گھنٹی بجتے ہی دونوں باکسر رنگ میں آ گئے اس سے پیشتر کے رین کوٹ کچھ سنبھلتا موسیٰ نے راؤنڈ شروع ہوتے ہی رین کوٹ پر انتہائی جارحانہ حملے شروع کر دیئے اور رین کوٹ نے دفاعی حکمت عملی سے کام لینا شروع کر دیا۔ موسیٰ کے ان تابڑ توڑ حملوں سے رین کوٹ اِدھر اُدھر رنگ میں اپنی پوزیشن بدلنے پر مجبور ہو گیا۔ اچانک موسیٰ کے ایک لفٹ ہک سے جو رین کوٹ کی اُس دائیں آنکھ پر پڑا جو راؤنڈ نمبر چار میں شدید زخمی ہو گئی تھی رین کوٹ کسی کٹے ہوئے درخت کی طرح فلور پر گر پڑا اور وہ ریفری کے دس تک گننے کے باوجود دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو سکا۔ میڈیکل سٹاف نے فوراً سٹریچر پر ڈال کر اُسے آکسیجن ماسک لگا دیا۔ اس کے دس منٹ بعد رین کوٹ کو ہوش آ گئی اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس مقابلے کے دوسرے روز بل نے مجھے آفس میں بتایا کہ اس باکسنگ کے مقابلہ میں مجھے تین ہزار ڈالر کا نفع ہوا ہے۔ لہٰذا بل نے مجھے آٹھ ہزار ڈالر واپس کر دیئے اور کہا کہ اب میرے کاروبار میں پانچ ہزار ڈالر نفع سمیت ملا دیئے ہیں۔

ظاہر ہے اس سے مجھے خوشی تو ہوئی۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے موسیٰ کی جیت کے لئے بھی دعا کی تھی جو مقبول ہوئی۔ بل نے بتایا کہ آج سے تین ہفتہ کے بعد اُس نے لاس ویگاس کے سیزر پیلس (Cesor Palace) میں جو ہیوی ویٹ کراؤن کا مقابلہ بل فائٹر جان پے چیک (John Pay-cheque) شکاگو، الی نوائے (جہاں کا سینیٹر بارک حسین اوباما آج کل امریکہ کا صدر ہے) کا چمپئن ہے، اس کے اور مسٹر تھرسٹی کرو (Thirsty Crow) جو ریاست ساؤتھ ڈکوٹا کا چمپئن ہے کے مابین مقابلہ بہت زور و شور سے ہو رہا ہے۔ جسے بذریعہ سیٹلائٹ ٹیلی وژن دنیا کے مختلف ممالک میں بھی دکھائے جانے کا انتظام ہو چکا ہے۔ اس باکسنگ مقابلہ میں مسٹر تھرسٹی کرو مسٹر بل کا یعنی ہمارا باکسر اپنے مخالف باکسر مسٹر جان پے چیک سے مقابلہ کر رہا تھا اور یہ ایک بھاری اخراجات کا باکسنگ مقابلہ ہو رہا تھا۔ مسٹر بل نے تھرسٹی کرو سے تین سال کا کنٹریکٹ کیا تھا۔ لہٰذا تاریخ مقررہ پر اس کا مقابلہ لاس ویگاس میں شروع ہو گیا لیکن اس مرتبہ میں بل کی غیر موجودگی میں دفتری کاموں کی مصروفیت کی وجہ سے لاس ویگاس نہ جا سکا اور پھر ویسے بھی یہ مقابلہ براہ راست ٹیلی وژن پر اپنے وقت کے مطابق دکھایا جا رہا تھا اس لئے میں ٹیلی وژن پر آدھ گھنٹہ پہلے ہی یہ مقابلہ دیکھنے بیٹھ گیا۔

مختصر یہ کہ پندرہ راؤنڈ کا یہ مقابلہ شروع ہو گیا۔ پہلے راؤنڈ کی گھنٹی بجتے ہی دونوں باکسر ایک دوسرے کے مقابل آ گئے۔ مجھے یہ دیکھ کر انتہائی تعجب اور حیرانی ہوئی کہ ہمارا باکسر مسٹر تھرسٹی کرو اپنے مخالف باکسر مسٹر پے چیک کے پہلے ہی گھونسہ سے فلور پر چت ہو گیا۔ مزید دکھ کی بات یہ ہوئی کہ تھرسٹی کرو ریفری کے دس گننے کے باوجود وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا۔

یہ واقعات جولائی 1977ء کے ہیں۔ جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا ہے کہ میں امریکہ میں 1974ء میں آیا تھا اب یہاں امریکہ میں مسلسل رہتے ہوئے تین برس گزر چکے تھے اور ان تین برسوں میں پاکستان نہ جا سکا تھا۔ وجہ صرف یہ کہ میرے پاس گرین کارڈ نہیں تھا اگر میں پاکستان چلا جاتا تو واپسی ہرگز ممکن نہ تھی اور یہ حقیقت ہے اور میں نے بھی اس بات کا ذکر بلا وجہ نہیں کیا۔ دکھ مجھے اس لئے ہوا کہ اس دوران میری بڑی بہن پشاور میں فوت ہو گئی لیکن میں اس کی آخری بار شکل نہ دیکھ سکا۔ ایسا میرے ہی ساتھ نہیں بہت سے پاکستانیوں

کے ساتھ ہو چکا ہے جو میری طرح یہاں دن رات محنت مزدوری کر کے اپنے والدین، بہن بھائیوں کی کفالت کر رہے ہیں۔ ہم سب اس بات پر متفق ہیں کہ اگر وطنِ عزیز پاکستان کے معاشی اور سیاسی حالات بہتر ہوں تو ہمیں پردیس میں دھکے کھانے کی ہرگز ہرگز ضرورت نہ ہے۔ تھرسٹی کرو کے ہار جانے سے مجھے ذرا بھر بھی ملال نہیں ہوا۔ وضو کیا اور نماز عشاء ادا کر کے سو گیا۔

یہ ہفتہ کی شام تھی، اتوار آفس بند تھا۔ پیر کو میں صبح آٹھ بجے دفتر پہنچ گیا جبکہ آفس نو سے پانچ بجے تک یعنی آٹھ گھنٹے کام کرنا ہوتا ہے۔ بل میرے آنے سے بھی پہلے آفس میں موجود تھا۔

''بیٹھو اور میری بات بہت غور سے سنو''۔ رسمی علیک سلیک کے بعد بغیر کسی تمہید کے اس نے کہا۔ ''بیچ میں ہرگز میری بات کو نہ کاٹنا جب تک میں اپنی بات ختم نہ کرلوں مسٹر کین'' (بل مجھے خان کی بجائے مسٹر کین کے نام سے پکارتا تھا)۔

''بالکل درست''۔ میں نے کہا۔ ''مسٹر بل میں ہرگز تمہاری گفتگو میں مداخلت نہیں کروں گا، صرف مجھے اتنا بتا دو کہ تم نے تھرسٹی کرو کا سابقہ ریکارڈ دیکھے بغیر اس سے کیسے تین برس کے لئے معاہدہ کرلیا؟ مجھے تو تھرسٹی کرو باکسر کم اور کسی سرکس کے ریٹائرڈ گدھے کا نام زیادہ معلوم ہوتا ہے''۔

''سنو مسٹر کین''۔ حسب عادت بل ہنس پڑا اور کہنے لگا۔ ''اب کچھ نہ کہنا ہم یہ مقابلہ ہارے نہیں بلکہ جیت گئے ہیں۔ یہ کمپیوٹر اور الیکٹرونکس کا زمانہ ہے۔ اگر تمہیں یاد ہو تو یہ کام ورلڈ اولمپک 1976ء جو مونٹریال کینیڈا میں منعقد ہوئی تھی، وہاں تلوار کے مقابلہ میں روسی کھلاڑی نے اپنی بغل میں ایک الیکٹرانک سیل دبایا ہوا تھا۔ اس کی تلوار اپنے مخالف کی تلوار کو چھوتی بھی نہ تھی کہ اُدھر کمپیوٹر پر روسی کھلاڑی کے پوائنٹ بڑھتے جا رہے

تھے۔ دوتو وہاں اُس وقت جموں کو شک گزرا کہ یہ اچانک اتنی تیزی سے روسی کھلاڑی کے پوائنٹ کیسے بڑھ رہے ہیں۔ روسی کھلاڑی کی تلاشی لینے پر اس کی بغل سے الیکٹرانک سیل برآمد ہوا تھا بس یہ خیال وہیں سے چرایا گیا ہے۔ یعنی سیل کی بجائے بالکل اصلی بال کی طرح بھورے رنگ کا الیکٹرانک بال باکسر کے دستانے یا بغل میں چسپاں کر دیا جاتا ہے۔ یہ الیکٹرانک بال ٹینس کے ریکٹ، کرکٹ کے بال، ہاکی کی سٹک اور فٹ بال کے کھلاڑیوں کے جوتوں پر بھی سی دینے سے کبھی بھی نظر نہیں آسکتا۔ جس کھلاڑی کے ہاتھ میں یہ ریکٹ ہوگا یا کرکٹ کا بیٹ ہوگا ہاکی کی سٹک ہوگی یا فٹ بال کھلاڑی کے جوتے میں یہ الیکٹرانک بال لگا ہوگا اُس کی قوت میں دو گنا اضافہ ہو جائے گا جو میچ جیتنے میں بے حد مددگار ثابت ہوگا۔

ہم دونوں پارٹیوں نے یہ پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ اس مقابلے میں تھرسٹی کرو ہارے گا لیکن اس کو ہارنے کا معاوضہ زیادہ ملے گا۔ چونکہ تھرسٹی کرو کے دائیں اور بائیں مکوں میں زبردست قوت ہے اور اس وقت اُس کا کوئی مدمقابل بھی نہیں لہٰذا وہ بھورے رنگ کا الیکٹرانک بال جان پے چیک کی بغل میں انتہائی صفائی سے جڑ دیا گیا تھا۔ تھرسٹی کرو کو بتا دیا گیا تھا کہ تم نے یہ مقابلہ ہارنا ہے لہٰذا تمہیں یعنی تھرسٹی کرو کو اس مقابلے میں ہارنے کے باوجود دگنی رقم ملے گی۔ تھرسٹی کرو نے جان پے چیک کو دوبارہ مقابلے کے لیے چیلنج کیا ہے اور پھر وہ دوبارہ مقابلہ زیادہ دلچسپ اور سنسنی خیز ہوگا جس میں جان پے چیک ہار کر اپنی ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دے گا اور بس مسٹر کین! اس مقابلہ میں تمہیں ایک ہزار ڈالر کا فائدہ ہوا ہے۔ یہ تو تھی ایک اچھی خبر دوسری خبر بھی اچھی ہے۔ یہ لو لفافہ اس میں تمہارا گرین کارڈ آ گیا ہے۔ اب تم کسی وقت بھی ایک ہفتہ بعد اپنے وطن جا سکتے ہو۔ کرک سیکیورٹی کمپنی تمہیں چھ ہفتہ کی ایڈوانس تنخواہ بھی دے گی۔ یہ اس لیے کہ تم نے تین برس دن رات انتہائی محنت کر کے کرک سیکیورٹی آفس کی خدمت کی ہے۔ پھر اوور ٹائم (Over-Time) کے لیے بھی کوئی مطالبہ نہیں کیا، واپس چار ماہ یا ایک برس کے بعد بھی تمہاری اس آفس میں جگہ خالی ہوگی اور بس"۔

اب اکتوبر 2014ء ہے لہٰذا ان واقعات کو گزرے آج چالیس برس ہو چکے ہیں پھر اس کے بعد کیا ہوا یہ ایک دوسری کہانی ہے۔ ان شاء اللہ پھر کبھی سہی۔ آج پھر میرے پرانے زخم تازہ ہو گئے ہیں۔ 2002ء میں میری والدہ اور دو بہنیں رکشے میں قصہ خوانی بازار کو جاتے ہوئے ریموٹ کنٹرول بم کے دھماکے میں شہید ہو گئی تھیں اور اس کے بعد پھر پشاور میں ایک بم دھماکے سے چالیس سے زیادہ بے گناہ معصوم بچے بوڑھے عورتیں مرد شہید کر دیئے گئے۔ مجھے آفس کے دوسرے امریکن باخبر قسم کے لوگوں نے بتایا ہے کہ یہ کام یعنی بم دھماکے پاکستان کا دشمن ملک انڈیا کروا رہا ہے۔ امریکہ اور یورپ کو پاکستان کا ایٹمی قوت ہونا ناقابل برداشت دکھ کا سبب ہے۔

آخری بات یہ کہ ڈیموکریٹک پارٹی کا صدارتی امیدوار بارک اوباما امریکہ کا صدر منتخب ہو جائے گا۔ یہ بات طے ہو چکی ہے اس لیے کہ امریکہ میں کنٹرولڈ ڈیماکریسی ہے (Controled Democracy) یہ الیکشن اس برس نومبر 2008ء کے پہلے ہفتہ میں جان میکین ری پبلکن امیدوار اور بارک اوباما ڈیموکریٹک امیدوار کے درمیان ہو رہے ہیں۔ یہ تحریر 2008ء میں لکھی گئی تھی جو حقیقت ثابت ہوئی ہے۔ رب العزت وطن اور اہل وطن جس کا نام پاکستان ہے وہ جہاں ہے کوئی بھی ہو شادمان اور اپنی حفاظت میں رکھے۔

◆✱◆

شاعر مرمت

شاعری کے جراثیم چھوت کی بیماری کی طرح نہ صرف تیزی سے دوسروں میں منتقل ہوتے ہیں بلکہ ان کی نشوونما بھی بڑی سرعت سے ہوتی ہے۔

محمد ادریس انور کھوٹ

عنوان سے یہ نہ سمجھیں کہ ہم شاعروں کو مار پیٹ کر شاعری سے تائب کراتے ہیں بلکہ ہم تو ٹوٹے پھوٹے اور بیکار شاعر کی ٹھوکا پیٹی کر کے انہیں قابل مشاعرہ بناتے ہیں۔ یقین نہ ہو تو آزما لیں۔

ایک شاعر نے کہا تھا۔ ہم کو دعائیں دو تمہیں قاتل بنا دیا۔ گزرے زمانے میں قاتل بننے کے لئے دور جدید کے اسلحہ کی ضرورت نہیں ہوا کرتی تھی۔ محبوب کے تیغ ابرو سے ہی یہ کام احسن طریقے سے پورا ہو جاتا تھا۔ وقت کے بدلتے تقاضوں کے ساتھ ساتھ قاتلوں کے انداز بھی بدل گئے ہیں۔ اب قاتل بننے کے لئے کلاشنکوف کی ضرورت پڑتی ہے۔

خیر! چھوڑیں اس خونیں مشغلے کو، آیئے میں آپ کو شاعر بنا دوں۔ شاعر بننے سے قبل اگر آپ ایک کامیاب عاشق ہیں تو یہ کٹھن سفر مہینوں کی بجائے دنوں بلکہ گھنٹوں میں طے ہو جائے گا۔ سب سے پہلے تو آپ کسی پختہ کار شاعر سے رابطہ قائم کریں۔ جس طرح دیے سے دیا جلتا ہے اسی طرح شاعر سے شاعر بنتا ہے۔ شاعری کے جراثیم چھوت کی بیماری کی طرح نہ صرف تیزی سے دوسروں میں منتقل ہوتے ہیں بلکہ ان کی نشوونما بھی بڑی سرعت سے ہوتی ہے۔ کوشش کریں کہ صحت مند جراثیم آپ میں منتقل ہوں۔ مثلاً خواجہ بابر سلیم یا ظفر کاظمی (مقامی شعراء) سے ہائی وولٹیج کنکشن حاصل کریں۔ بصورت دیگر صاحبزادہ ذلفی صاحب یا محمد خان اظہر صاحب بھی چل جائیں گے۔

اب آپ اپنا شیو کا سامان، تیل، صابن، کنگھا وغیرہ الماری میں مقید کر دیں۔ ایک شاعر کا آرائش کے ان لوازمات کے ساتھ بھلا کیا واسطہ؟ بال بکھرا لیں، اس سے قبل اگر آپ نے عاشقی کے امتحان کے چند پرچے دیئے ہیں یعنی بقول غالب۔

"فنا تعلیم درسِ بے خودی ہیں"

تو لازمی طور پر آپ کی زلفوں میں خاک اڑ رہی ہوگی۔ ویسے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں، چڑیا کے گھونسلے کے چند تنکوں سے بھی کام چل جائے گا۔ وہی بالوں میں پرو لیں۔

اپنی چشم آہو کو مزید خوابناک بنا لیں۔ نیم باز آنکھوں میں شراب کی مستی انڈیل لیں۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو کوئی حرج نہیں۔ بس آنکھوں کو دھونا نہیں اس طرح گزشتہ رات کی "گد" سے بھی کام چل جائے گا۔ یہ کہنے کی تو چنداں ضرورت نہیں کہ شیو بڑھا ہوا ہونا چاہیے۔ جیسا کہ آپ نے اکثر فلموں میں بھی دیکھا ہوگا۔ دیکھیں

تا آخر چھوٹی چھوٹی داڑھی اور شاعری کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے تاکہ لیکن ذرا اتنی احتیاط رکھیں کہ داڑھی زیادہ لمبی نہ ہونے پائے ورنہ آپ شاعر کی بجائے خودکش حملہ آور نظر آئیں گے اور پولیس آپ کو مشاعرہ میں جانے کی بجائے انویسٹی گیشن سیل لے جائے گی۔ وہاں آپ سامعین کی بجائے رات بھر مچھروں کی راگنی سے محظوظ ہوتے رہیں گے۔

گریبان (اپنا) چاک کرلیں تو سونے پہ سہاگہ ورنہ میلے کپڑوں سے بھی کام چل جائے گا۔ کپڑے صرف میلے ہوں، گریس یا چکنائی زدہ نہ ہو ورنہ آپ شاعر کی بجائے مکینک لگیں گے اور سارے کئے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔

شاعری کی گاڑی چلانے کے لئے ایک اور اہم عنصر ہے پان۔ بس یہی سمجھیں پان نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ ایک پان منہ میں ہو جس کی پیک تھوڑی سی لیک ہو کر باچھوں سے بہہ رہی ہو۔ دو پان ہاتھوں میں اور آٹھ دس جیب میں تاکہ کمک اور رسد میں توازن برقرار رہے۔

جب آپ کسی سے گفتگو کریں تو پیک کے چند چھینٹے اور چھالیہ کے ٹکڑے ہوئے چند ذرات اپنے مخاطب کے منہ پر پھوار کی صورت میں برسائیں۔ آپ کے اس طرز عمل سے ہر ذی عقل شخص آپ سے چند قدم کا فاصلہ رکھ کر اور نہایت محتاط ہو کر گفتگو کرے گا۔ اس سے آپ کو یہ فائدہ ہوگا کہ آپ کی آمد اور آورد میں کوئی مداخلت کی جراءت نہ کر سکے گا اور آپ یکسوئی سے تخلیقی مراحل سے گزرتے رہیں گے۔ (معاف کیجئے گا اشعار کی تخلیق)

جب آپ سوئے رزمگاہ (مشاعرہ) چلیں تو نہایت ہی دھیمی رفتار اور انکساری سے چلیں کیونکہ انکساری اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔ ہو سکے تو ایک ہاتھ میں چھڑی اٹھا لیں تاکہ بوقت ضرورت سہارا بھی لیا جا سکے۔ اگر چھڑی میسر نہ ہو تو کوئی حرج نہیں وہی ہاتھ خمیدہ کمر (اپنی) پر رکھ لیں۔ دوسرے ہاتھ میں تو آپ پان جکڑے ہوئے ہوں گے۔

چال میں معمولی سی لڑکھڑاہٹ ہو مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ دیکھنے والا سمجھے کہ بن پئے سرور ہے۔ نہ کہ یہ راز فاش ہو کہ بن کھائے نقاہت ہے۔

خراماں خراماں مشاعرہ میں تشریف لے جائیں۔

محفل زعفران زار شروع ہونے سے قبل سامعین میں سے کوئی ایک خوش لباس سامع منتخب کرلیں اور اگالدان میسر نہ ہونے کی صورت میں اُس شریف آدمی کے کپڑوں پر منہ کی پچکاری سے پان کی پیک کا سپرے بلاتکلف کر دیں۔ ہاں بعد میں معذرت ضرور کرلیں۔ مطمئن رہیں ایسی محفلوں میں معذرتیں بہت جلد قبول ہو جاتی ہیں۔

اب آپ مائیک پر تشریف لا کر اپنا کلام شروع کریں۔ سامعین کے شور وغل سے قطعاً نہ گھبرائیں۔

"عرفی تو می اندیش زغوغائے رقیباں"

گندے انڈوں اور ٹماٹروں کی گولہ باری کا اندیشہ دل سے نکال دیں کہ دونوں اشیاء اتنی مہنگی ہیں کہ کھانے کو بھی نہیں ملتیں۔ اگر کوئی دریا دل حوصلہ کر کے مار ہی دے تو بجائے دل برداشتہ ہونے کے داد سمجھ کر خندہ پیشانی سے برداشت کریں۔ اگر کہیں "مکرر" کی صدا بلند ہو (جس کا امکان کم ہے) تو بھڑکنے کی ضرورت نہیں۔ اسے حوصلہ افزائی نہ سمجھیں بلکہ مسئلہ سمجھ کر سامعین کو یہ کہہ کر ہلکے سے انداز میں ڈانٹ دیں۔ "او خوچے بائی صیب (بھائی) ایک بار ہی غور سے کیوں نہیں سنتا"۔

چھوٹی موٹی تنقید پر مائنڈ نہ کریں۔ اطمینان سے اپنی غزل کا کام تمام کریں اور سٹیج سے اتر آئیں۔

ان قیمتی مشوروں پر اگر آپ نے عمل کیا تو آپ کی شاعری کا مستقبل ضرور روشن ہوگا۔ ان شاء اللہ!

پیوستہ رہ شجر سے اُمید بہار رکھ

قسط:3 ☆ .... رفیق ڈوگر

پنجاب پر سکھوں کا قبضہ کیسے ہوا؟ مغلیہ سلطنت کیسے برباد ہوئی؟

مغلانی بیگم

خان سر جھکائے دست بستہ کھڑا تھا۔

طہماس "ہم سمجھتے تھے کہ جن لوگوں نے میر منو کا نمک کھایا ہے ہم ان کی وفا پر بھروسہ کر سکتے ہیں لیکن تم نے ثابت کر دیا ہے کہ حکمران ایک دوسرے سے خواہ کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں ان کے نمک کا اثر ایک جیسا ہی ہوتا ہے"۔ بیگم نے غصہ سے کہا۔

"غلام کے پاس تلوار ہوتی تو وہ اپنا سر اپنے ہاتھ سے کاٹ کر حضور کے قدموں میں رکھ کر ثابت کر دیتا کہ اس کے خون میں وفا کے سوا کچھ نہیں"۔ وہ کانپنے لگا۔

"قاسم خان نے بہت لالچ دیا مگر جب دیکھا کہ میرے خون میں نمک حرامی نہیں تو اس نے مجھے قید کر دیا، رات کے اندھیرے میں اس کی قید سے فرار ہو کر آج صبح ہی یہ غلام مناواں سے لاہور پہنچا ہے اور حضور کے قدموں میں حاضر ہو گیا ہے"۔

"کیا لالچ دیا تھا اس نے تمہیں، ہم سے زیادہ وہ تم پر کیا کرم کر سکتا ہے؟" بیگم کا غصہ بڑھ گیا۔

"قاسم خاں نے کہا میں سکھوں کی مدد سے امن قائم کر کے پنجاب کا بادشاہ بن جاؤں گا اگر تم میرا ساتھ دو تو میں تمہیں اپنا وزیر بنالوں گا مگر میں نے اس پر حضور کے احسانات کا ذکر کیا اور کہا کہ جو بیگم حضور سے بے وفائی کر سکتا ہے اس کے وعدہ پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ وہ غصہ میں آ گیا اور مجھے قید کرنے کا حکم دے دیا"۔

"کتنے سکھ ہوں گے قاسم خاں کے ساتھ، انہیں اس نے کیا لالچ دیا ہے؟"

"سارے جتھے واروں کے ملا کر آٹھ ہزار کے قریب سکھ سوار اور ملنگ لاہور پر حملہ کے لئے اس کے ساتھ آ رہے ہیں۔ قاسم خاں نے حضور کا دیا بہت سا روپیہ اور ہتھیار ان میں بانٹ دیئے ہیں...... اور کیا دیا ہے غلام کو کچھ علم نہیں"۔

"ہم اس اطلاع کو درست مان سکتے ہیں کہ قاسم خاں کا بھوانی داس سے رابطہ ہے؟"

"یہ غلام اس بارے میں کچھ نہیں جانتا"۔

"سارا لاہور جانتا ہے کہ بھکاری خان کے ساتھی خوشیاں منا رہے ہیں تم قاسم خاں کے ساتھ تھے اور تمہیں کچھ علم نہیں"۔

"ایک ترک سردار نے حضور کے اس غلام کو بتایا تھا کہ آلا سنگھ کا وکیل سکھ جتھے داروں اور قاسم خاں کے درمیان بات چیت میں شامل تھا"۔ طہماس خاں کو اعتراف کرنا پڑا۔

"کتنے مغل اور ترک سردار قاسم خاں کی بادشاہت کے خوابوں پر یقین رکھتے ہیں؟" بیگم نے موضوع بدل دیا۔

"قاسم خاں مغل جرنیلوں والی وردی پہن کر دربار لگاتا ہے اور مغل حاکموں کی مانند احکامات جاری کرتا ہے، خطابات اور انعامات تقسیم کرتا ہے، ترک سردار اسی طرح اس کے احکامات پر عمل کرتے ہیں جس طرح اصل حاکموں کا حکم مانا کرتے ہیں۔ کسی میں انکار کی جرأت نہیں"۔

کنیز نے سرفراز خاں کی حاضری کی درخواست پیش کی تو بیگم نے طہماس خاں کو ڈیوڑھی میں انتظار کرنے کا حکم دیا، وہ فرشی سلام کر کے کمرے سے باہر نکل گیا۔

سرفراز خاں نے اطلاع دی کہ قاسم خاں مناواں سے لاہور پہنچ گیا ہے اور شاہ بلاول کے عقب میں خیمہ زن ہو چکا ہے۔ سکھ جتھے داروں نے اس سے تھوڑے فاصلہ پر راوی کی طرف ڈیرے جما لیے ہیں اور لڑائی کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

"ہم سمجھتے ہیں تمہارے سوار بھی ان کے ساتھ ہی مقیم ہیں"۔ بیگم نے اطمینان سے ساری صورت حال کی تفصیل سن کر پوچھا۔

"حضور کے غلاموں نے کبھی اپنی جانوں کی پروا

نہیں کی"۔ سرفراز خاں دایاں ہاتھ سینے پر رکھ کر جھک گیا۔ "یہ غلام ایک ایک لمحہ کی خبر فراہم کرتا رہے گا"۔

"ہمیں تمہاری اور تمہارے ساتھیوں کی صلاحیتوں پر فخر ہے"۔ بیگم نے کہا۔

لاہور میں مغلانی بیگم کے پاس فوج بہت تھوڑی تھی، خواجہ مرزا خاں اور اس کے بھائی کی فوج ایمن آباد کے پرگنہ میں مقیم تھی۔ کچھ ترک دستے سیالکوٹ کی طرف بھیجے گئے تھے اور فوری طور پر کہیں سے مدد پہنچنا ممکن نہ تھا۔ بیگم نے نادر بیگ اور کریم بخش کو طلب کر کے قلعہ اور شہر کے دفاع کو مستحکم کرنے کا حکم دیا اور سرفراز خاں کو قاسم خان اور سکھوں کے ڈیروں کی تازہ ترین خبریں فراہم کرنے کے لئے بھیج دیا۔

بھکاری خاں کے حامی امراء اور درباری اس سازش اور حملہ پر خوش ہوئے، انہیں اس کا کوئی دکھ نہیں تھا کہ سکھ شہر پر قابض ہو سکتے ہیں۔ ان کی خوشی کے لئے مغلانی بیگم کے زوال کا تصور ہی کافی تھا مگر عام لوگ فکرمند تھے، انہیں اپنے گھروں اور دکانوں کے لٹنے کا خوف تھا۔ عام مسلمان قاسم خاں کے سکھوں کے ساتھ مل جانے پر ناراض تھے، اس وجہ سے بھکاری خاں کے حامی قاسم خاں کی حمایت کے بارے میں بہت محتاط تھے۔

*

رات کے کھانے کے بعد بیگم نے بچوں کو ان کے سونے کے کمروں میں بھیج دیا اور خود اپنی نشست گاہ میں چلی گئی۔ ریشمی قالینوں سے آراستہ چبوترے پر گاؤ تکئے سے ٹیک لگا کر وہ اپنے دماغ کی بساط پر اقتدار کی شطرنج کے مہروں کی چالوں پر غور کر رہی تھی کہ اس کی بیٹی عمدہ بیگم کمرے میں داخل ہوئی۔ مغلانی بیگم نے اٹھ کر اسے پیار کیا اور سینے سے لگایا۔ "نیند کی پریوں سے خدانخواستہ آپ کا جھگڑا تو نہیں ہو گیا؟"

"اماں حضور! ہم نے سنا ہے دشمن فوجیں شہر کے باہر خیمہ زن ہیں؟" عمدہ بیگم کے چہرے پر گھبراہٹ تھی۔

"آپ نے درست سنا ہے، جان مادر!" بیگم نے اس کی آنکھوں میں خوف کے باوجود اسے بتا دیا۔

"اب کیا ہو گا؟ ہمیں تو خوف آنے لگا ہے"۔ عمدہ بیگم کی آواز کانپ رہی تھی۔

مغلانی بیگم نے آگے بڑھ کر راوی کی طرف کھلنے والی کھڑکی کا پردہ سرکا دیا۔ "آپ کو اس طرف کچھ دکھائی دیتا ہے؟" اس نے بیٹی سے پوچھا۔

"تاریکی کی فصیل سے آگے تو ہمیں کچھ نظر نہیں آتا"۔ عمدہ بیگم نے کھڑکی میں سے جھانکتے ہوئے جواب دیا۔

"اس فصیل کے پیچھے بہت کچھ ہے۔ اس سے آگے قلعہ کی فصیل ہے جس کے نیچے سینکڑوں بار دشمن کی فوجیں خیمہ زن ہو چکی ہیں۔ اس سے آگے راوی ہے جس کی لہروں نے ہزار بار دشمن کو راستہ دیا ہے۔ اس فصیل اور راوی کی لہروں نے معلوم نہیں کتنے معرکے دیکھے ہیں۔ ان معرکوں میں کامیاب وہی رہا جس کا دل خوف سے پاک تھا"۔ اس نے بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"ہم سوچ رہے تھے اگر آج ابا حضور زندہ ہوتے......"

"آپ کے ابا حضور کے ذمہ جو فرض تھا وہ پورا کر گئے، جو فرض ہمارے ذمہ ہے وہ ہمیں پورا کرنا ہے"۔ مغلانی بیگم نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ہم نے سنا ہے ان کی تعداد بہت زیادہ ہے"۔

"میر قمرالدین کی پوتی اور میر معین الملک کی بیٹی کو دشمن کی تعداد سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہئے۔ اپنے اجداد کی روایات کو یاد کرو وہ ایسی باتوں پر خوفزدہ ہوا کرتے تو آج ہم اس محل اور قلعہ میں نہ ہوتے۔ ہمیں امید ہے آپ آئندہ کبھی ایسی کمزوری نہیں دکھائیں گی"۔ اس نے بیٹی کو

سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ "جاؤ، یہاں تمہاری منتظر ہیں، ہماری زندگی میں تمہیں خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے باپ نے اپنی زندگی میں ہمیں جو کچھ سکھایا اس کے لئے آپ کو ان کا شکرگزار ہونا چاہئے"۔

مغلانی بیگم نے تالی بجائی، ایک کنیز نمودار ہوئی اور سلام کر کے خاموش کھڑی ہوگئی۔

"عمدہ بیگم کو ان کی خواب گاہ تک پہنچاؤ۔ فرحت آراء سے کہو انہیں سمرقند کی اس بہادر خاتون کی کہانی سنائے جس کے بچے چالیس سال سے ہندوستان پر حکومت کر رہے ہیں"۔

عمدہ بیگم کو رخصت کر کے وہ پھر تکیہ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور کھلی کھڑکی کے سامنے کھڑی اندھیرے کی فصیل پر سوچ کی کمندیں پھینکنے لگی۔

میاں خوش فہم نے مداخلت کی اجازت چاہی اور خبر دی کہ قلعہ دار نادر بیگ شرف باریابی کے لئے حاضر ہیں تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے حاضر کرنے کا حکم دیا۔ نادر بیگ آداب بجالا کر ایک طرف مؤدب کھڑا ہوگیا۔

"انتظام ہوگیا؟" بیگم نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی بیگم عالیہ! خدا کے فضل سے سب انتظام ہو گیا"۔

"روپیہ کتنا درکار ہوگا؟" مغلانی بیگم نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"تیس ہزار"۔ نادر بیگ نے بیٹھتے ہوئے بتایا۔

"سرفراز خاں کی کوئی اطلاع؟"

"وہ صبح حضور کے رُوبرو خود پیش ہو جائے گا"۔

"سکھ کیمپ کے معمولات؟"

"کیمپ کے گرد سخت پہرہ ہے، رات کا پہلا حصہ سپاہی اور جتھے دار شراب پینے اور نشہ میں ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے میں گزارتے ہیں، صبح دیر تک سوتے ہیں"۔

"پہریدار سب سے زیادہ چوکس کس وقت پائے گئے؟"

"رات کے پہلے پہر میں"۔

"ہمارا کوئی بندہ ان کے ہاتھ نہ آئے اور مقصد بھی حاصل ہو جائے"۔

"ان شاء اللہ، ایسا ہی ہوگا!" نادر بیگ نے جواب دیا۔

"یہ اپنے پاس رکھیں"۔ بیگم نے ایک مہر بند لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔ "روپیہ سرفراز خاں فراہم کرے گا، آپ دونوں ساتھ جائیں گے اگلی رات اسی وقت ہم رپورٹ کے منتظر ہوں گے"۔

نادر بیگ نے لفافہ پکڑا اور سلام کر کے الٹے قدموں باہر نکل گیا۔

مغلانی بیگم کے چہرے سے کسی غیر معمولی تاثر کا کوئی اظہار نہیں ہوا۔ وہ نشست سے اٹھی اور کمرے میں ٹہلنے لگی۔ کھلی کھڑکی سے آنے والی ہوا میں بھینی بھینی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ گہری سانس لے کر اس نے ہوا میں خوشبو کی شدت کا جائزہ لیا اور کھڑکی کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

ہر طرف مکمل سکوت تھا مگر ایسا محسوس ہوتا تھا اس کے کان اور آنکھیں اس سکوت اور خاموشی میں کچھ تلاش کر رہے ہیں۔

"رب رب ہے، رام رام ہے"۔ راوی کی طرف سے یہ خاموشی میں لہرا اٹھی۔

بیگم نے پردہ گرا کر کھڑکی بند کر دی اور رات ختم کرنے کے لئے خواب گاہ کی طرف چل دی۔

٭

آسمان پر پوری رات کا چاند روشن تھا، سکھ کیمپ میں جگہ جگہ شمعیں جل رہی تھیں۔ سپاہی ٹولیوں کی صورت اِدھر اُدھر بکھرے شراب کے جام چڑھا رہے تھے۔ جتھے

وار کے خیمے کے سامنے مختلف گروہوں کے سردار جمع تھے۔ سرخ ریشمی لباس میں ملبوس ایک نوجوان لڑکی ہاتھ میں صراحی لئے درمیان میں کھڑی تھی، جس سردار کا جام خالی ہوتا وہ جھک کر سلام کرتی اور جام پھر سے بھر دیتی۔ وہ ایک سردار کا جام بھرنے جھکی تو اس نے دونوں بازو اس کی گردن میں حمائل کر دیئے۔ ''شیش محل میں بھی ہمیں گورو کی بیبی یہی شراب پیش کرے گی؟'' سردار نے جھومتے ہوئے جتھے دار سے پوچھا۔

لڑکی نے گردن چھڑانے کی کوشش کی تو صراحی اس کے ہاتھ سے گر گئی اور شراب قالین پر بہنے لگی۔ سردار نے جام ایک طرف رکھ دیا اور جھک کر زبان سے بہتی شراب چاٹنے لگا۔ جتھے دار مسکرایا اس نے ایک خادم کو اشارہ کیا، خادم نے آگے بڑھ کر شراب چاٹنے والے سکھ کے سر پر پوری صراحی انڈیل دی۔ محفل میں زبردست قہقہہ بلند ہوا۔ شراب سردار کے کیسوں سے ہو کر اس کی داڑھی میں سے ٹپکنے لگی تو اس نے جام اٹھا کر داڑھی کے نیچے رکھ دیا اور دونوں ہاتھوں سے داڑھی نچوڑ نچوڑ کر شراب جام میں جمع کرنے لگا۔ پھر وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور جام تھام کر لڑکی کی طرف بڑھا۔ ''ہم نے تمہارے بھرے بہت سے جام پیے ہیں، یہ ایک جام ہم آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔''

لڑکی پیچھے ہٹنے لگی تو وہ لڑکھڑاتا ہوا اس کی طرف بڑھا اور قریب پہنچ کر جام اس کے ہونٹوں سے لگانے کی کوشش کرنے لگا۔ لڑکی نے اس کا بازو جھٹک دیا، جام اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ وہ خود بھی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ ''اس بیوی کے ہاتھوں واہ گورو کا بھی یہی حال ہو گا''۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

نہنگوں کے سردار نے ''واہ گورو کی جے'' کا نعرہ لگایا اور کرپان نکال کر ایک ہی وار میں مدہوش سکھ کا بازو کاٹ دیا۔ اپنے سردار کے نعرے کی آواز سن کر سارے نہنگ ''واہ گورو کی جے'' کے نعرے لگاتے ہوئے نیزے لہراتے جتھے دار کے ڈیرے پر جمع ہو گئے اور وہاں موجود سب سکھ سرداروں کو گھیرے میں لے لیا۔ کیمپ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ''واہ گورو کی جے'' کے نعرے بلند ہونے لگے۔ سکھ سپاہی سردار جتھے دار کرپانیں لہراتے اور نعرے لگاتے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔

جتھے دار نے دونوں ہاتھوں سے نہنگوں کے سردار کے پاؤں پکڑ رکھے تھے اور مدہوش سکھ کی طرف سے واہ گورو کی شان میں گستاخی پر معافی مانگ رہا تھا۔

سکھ کیمپ میں جب یہ ہنگامہ زوروں پر تھا تو راوی کے بیلے کی طرف سے ''واہ گورو کی جے'' کے نعرے لگاتا سواروں کا دستہ برآمد ہوا اور کیمپ پر حملہ آور ہو گیا۔ کیمپ کے اندر سکھ آپس میں لڑ رہے تھے، باہر سے آنے والے بندوقوں کی باڑھ مارتے ہوئے آئے اور بجلی کی سی تیزی سے جنگل میں واپس اتر گئے۔ سکھوں کو جوابی کارروائی کا موقع ہی نہیں دیا۔

جتھے دار اور سکھ سردار صبح تک امن بحال کرنے اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے میں لگے رہے، حملہ آوروں کی گولیوں سے سکھ مرے کم اور زخمی کافی زیادہ ہوئے تھے۔

اگلا سارا دن سکھ جتھے دار اس خط پر بحث کرتے رہے جو رات سکھ پہریداروں نے ان جوگیوں سے برآمد کیا تھا جو قاسم خاں کے ڈیرے کی طرف جاتے ہوئے پکڑے گئے تھے۔ دریا کی طرف سے آنے والے حملہ آور ان جوگیوں کو ان سے چھڑا کر لے گئے تھے۔ یہ خط قاسم خاں کے نام تھا اور اس پر مغلانی بیگم کی مہر تھی۔ خط بہت ہی مختصر تھا مگر اس کی زبان کسی سکھ کو سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ آخر جتھے دار نے قاسم خاں کو پیغام بھیجا کہ کوئی ایسا پڑھا لکھا آدمی بھیجا جائے جو انہیں خط کا مطلب سمجھا سکے قاسم خاں نے ایک ترک نوجوان کو بھیج دیا۔

''باؤ اس میں کیا لکھا ہے؟'' جتھے دار نے خط

نوجوان کے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ تو ہماری مقدس کتاب قرآن مجید کی ایک آیت ہے"۔ نوجوان نے تحریر دیکھ کر جواب دیا۔

"اس آیت کا مطلب کیا ہے؟" جتھے دار نے سوال کیا۔

ترک نوجوان سوچ میں پڑ گیا وہاں موجود سارے سکھ اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگے۔

"اس آیت کا مطلب ہے 'فتح قریب ہے'۔" نوجوان نے بتایا۔

"کس کی فتح قریب ہے؟" جتھے دار نے سوال کیا۔

"کسی کی بھی نہیں یہ تو قرآن پاک میں لکھا ہے"۔ نوجوان نے جواب دیا۔

"تمہارا قرآن قاسم بیگ کے پاس بھی ہے؟" نہنگوں کے سردار نے مداخلت کی۔

"ہاں ہے"۔ نوجوان نے بتایا۔

"اس میں بھی لکھی ہے یہ آیت؟" اس نے دوسرا سوال کیا۔

"ہاں لکھی ہے"۔ نوجوان نے جواب دیا۔

"پھر مغلانی بیگم کو یہ آیت لکھ کر قاسم خاں کو بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟" نہنگ نے وضاحت چاہی۔

ترک کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

"یہ کتاب تم سب مسلمانوں کی ایک ہی ہے؟" جتھے دار نے پوچھا۔

"ہاں، سب کی ایک ہی کتاب ہے"۔ نوجوان نے جواب دیا۔

"تو پھر یہ فتح قریب والی بات تو سب مسلمانوں کی ہوئی نا؟" اس نے سوال کیا۔

"یہ تو مدینہ والے مسلمانوں کے بارے میں ہے"۔ نوجوان نے وضاحت کرنے کی کوشش کی۔

"مدینہ تو عرب میں ہے تم عرب کی بات لاہور میں کیوں کرتے ہو؟" نہنگ نے غصہ سے پوچھا۔

سوال و جواب کے بعد سکھوں کے دل میں شبہ پختہ ہو گیا کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے اور ترک نوجوان انہیں سچ نہیں بتا رہا۔

اسے واپس بھیجنے کے بعد سب سکھ سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور سارے واقعات پر غور کرنے لگے۔

"اگر قاسم بیگ کامیاب ہو گیا تو ہمیں کیا ملے گا؟" ایک سکھ سردار نے پوچھا۔

"اور اگر قاسم بیگ کو شکست ہو گئی تو ہمارا حال کیا ہو گا؟" دوسرے نے جتھے دار کے جواب دینے سے پہلے سوال کیا۔

"اور اگر سب مسلمان آپس میں مل گئے تو تمہارا کیا بنے گا؟" تیسرا بولا۔

سورج کی شعاعیں جب شیش محل کی روغنی دیواروں سے مختلف زاویوں سے مختلف زاویوں پر منعکس ہو رہی تھیں راوی کے کنارے سکھ اپنے گھوڑوں پر کاٹھیاں کس رہے تھے۔ قاسم بیگ کو اطلاع ملی تو وہ دل تھام کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا مال خزانہ سکھوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ہتھیار ان میں بانٹ دیئے تھے۔ اس کے سارے خواب سکھوں کے گھوڑوں کی اڑائی خاک میں تحلیل ہو گئے۔ اس کی فوج کے پنجابی سپاہی اور سردار سکھوں کو جاتا دیکھ کر خوش تھے اور اس کے ترک ساتھی اسے تسلی دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ مقدر کے بعد سورج نے بھی اس کے خیمے پر سے آنکھیں پھیر لیں تو پنجابی دستوں نے اس کے خیمے کا محاصرہ کر لیا اور اس کے باہر نکلنے سے پہلے ہی طنابیں کاٹ دیں۔ کسی محافظ نے اس کے لئے ہتھیار نہیں اٹھایا۔ اس نے ترک سپاہیوں کو دو ماہ سے تنخواہ نہیں دی تھی، وہ خاموش کھڑے دیکھتے رہے۔ طنابیں کاٹنے والوں نے قاسم خاں کو ٹانگوں سے گھسیٹ کر خیمے کے نیچے سے نکالا

اور رسیوں سے ہاتھ پاؤں باندھ کر گھوڑے پر ڈال لیا۔ قلعہ کے دروازے پر نادر بیگ نے ان کا استقبال کیا اور قاسم بیگ کے ہاتھوں اور پاؤں میں زنجیریں ڈال دیں۔

شیش محل میں ہر طرف شمعیں روشن تھیں، چودھویں رات کے چاند کی خنک چاندنی منڈیروں اور ایوانوں میں اتر چکی تو مغلانی بیگم کنیزوں اور خادموں کے درمیان چلتی ہوئی ڈیوڑھی تک گئی جہاں قاسم خاں زنجیروں میں جکڑا سر جھکائے کھڑا تھا۔

''نادر بیگ ہمارے فرزندِ عزیز کی زنجیریں کھول دیں''۔ مغلانی بیگم نے حکم دیا۔

خدام نے قاسم خاں کی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں اتار دیں۔

''قاسم بیگ خان ہمارا فرزند عزیز ہے، اس کے مقام و مرتبہ کا احترام کیا جائے اور اسے مسند پر بٹھایا جائے''۔ بیگم نے حکم دیا۔

انہوں نے بازو سے پکڑ کر قاسم بیگ خاں کو قالین پر لگے تکیہ کے پاس لے جا کر کھڑا کر دیا۔ قاسم بیگ فرش پر نگاہیں گاڑے کچھ تلاش کرنے لگا۔

''تشریف رکھیں، قاسم بیگ خان! اس زمین پر حکمرانی کا خواب دیکھنا ہر ترک سپاہی کا فرض ہے، آپ تو خدا کے فضل سے فوجدار ہیں۔ آپ نے جو کچھ کیا آپ کا فرض ہی نہیں حق بھی تھا۔ آپ ایسا نہ کرتے تو ہمیں آپ کے ترک ہونے پر شبہ ہوتا''۔

قاسم بیگ نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر الفاظ نے دل کا ساتھ نہ دیا۔

''معلوم ہوتا ہے ہمارے فرزند کے خون میں ابھی ہمارے نمک کا اثر باقی ہے، انہیں سب سے محفوظ جگہ پہنچا دیا جائے تاکہ کوئی گستاخ ان کی شان میں مزید کوئی گستاخی نہ کر سکے''۔

سپاہیوں نے آگے بڑھ کر قاسم بیگ خان کو دونوں بازوؤں سے پکڑ لیا۔ مغلانی بیگم نے حقارت سے اس کی طرف دیکھا اور واپس مڑ گئی۔ سپاہیوں نے قاسم بیگ خان کو پھر زنجیروں میں جکڑ لیا اور قلعہ کی محفوظ ترین جیل میں پہنچا دیا۔

*

آدینہ بیگ بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہا تھا، اس نے مغل حاکموں جیسا لباسِ فاخرہ پہن رکھا تھا۔ اس کی پگڑی میں پیشانی کے اوپر بیش قیمت سرخ رنگ کا ہیرا چمک رہا تھا۔ ریشمی قالینوں کے فرش پر چلتے ہوئے وہ ایوان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاتا اور پھر واپس پہلے سرے کی طرف چل دیتا۔ اس کے اپنے دوآبہ میں مکمل امن و سکون تھا۔ کسان خوشحال تھے، مالیہ باقاعدگی سے وصول ہو رہا تھا۔ بادشاہ احمد شاہ اور وزیراعظم عمادالملک اس سے بہت خوش تھے کہ اس نے پنجاب کے سکھوں کی شورش کو دہلی کی طرف بڑھنے سے روک رکھا تھا۔ اپنی قلعہ نما حویلی میں جب وہ دربار لگاتا تو کسی حاکم پرگنہ کی بجائے اس پر حاکم صوبہ کے دربار کا گمان ہوتا تھا۔ اس کی فوجی اور مالی حالت بہت مستحکم تھی لیکن رات لاہور سے جو مراسلہ موصول ہوا تھا اس نے اسے بے چین کر دیا تھا۔ سیٹھ بھوانی داس نے لکھا تھا کہ بھکاری خان اور قاسم بیگ کی بغاوتوں پر قابو پانے اور انہیں گرفتار کر کے قید میں ڈالنے کے بعد مغلانی بیگم کا اقتدار پر قبضہ مستحکم ہو گیا ہے اور اس نے صوبہ میں امن و امان بحال کرنے کے منصوبہ پر عمل شروع کر دیا ہے۔ اس کی فوجوں نے لاہور کے گرد و نواح میں سکھوں کے خلاف کامیاب کارروائیاں کی ہیں۔ لاہور شہر اور دربار میں اب کوئی بھی اس کے خلاف بات کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔ عام لوگ اور دیسی فوج مکمل طور پر اس کے ساتھ ہیں اگر صورت حال یہی رہی تو بہت جلد وہ صوبہ میں امن و امان بحال کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔

آدینہ بیگ جب کوئی اہم منصوبہ بناتا تو داڑھی میں انگلیاں پھیرتا ہوا وہ اسی طرح ٹہلتا رہتا تھا۔ دربانوں کو حکم ہوتا کہ اس حالت میں اس سوچ میں ہرگز مداخلت نہ کریں جب تک وہ خود نہ بلائے۔ منصوبے کی جزیات طے کرنے کے بعد وہ فوراً اس پر عمل شروع کردیتا تھا اگر مغلانی بیگم کامیاب ہوگئی تو اس کا پنجاب پر حکومت کا منصوبہ کامیاب نہیں ہوسکے گا۔ وہ رات بھر سوچتا رہا تھا اور اب کسی نئے منصوبے پر غور کررہا تھا۔ بیساکھی کی دوپہر شروع ہونے والی تھی لیکن صبح سے اس نے کسی سے ملاقات نہیں کی تھی۔ پھر وہ چلتا چلتا ایوان کے درمیان میں رک گیا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ کی نمود اس بات کی علامت تھی کہ وہ کسی فیصلے پر پہنچ گیا ہے۔

''صدیق خاں کو پیش کریں''۔ اس نے دربان کو بلا کر حکم دیا۔

دربان سلام کر کے باہر نکل گیا تو وہ ایک بار پھر بھوانی داس کا مراسلہ پڑھنے لگا۔

آدینہ بیگ کی فوج کا کمانڈر صدیق خان صبح سے باہر طلبی کا منتظر بیٹھا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے جھک کر سلام کیا اور حکم کے انتظار میں مؤدب کھڑا ہو گیا۔

''صدیق خان! ہم چاہتے ہیں کہ اپنی فوج کی تعداد میں اضافہ کیا جائے''۔ اس نے صدیق خاں کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کی فراست نے ہمیشہ وقت کو راستہ دکھایا ہے۔ آپ نے فیصلہ کیا ہے تو لاریب اس کی ضرورت ہو گی''۔ صدیق خاں آدینہ بیگ کی خواہش کو حکم سمجھ کر اس کا احترام کیا کرتا تھا۔

''روپیہ اور فوج جس قدر زیادہ ہوں امن اتنا ہی زیادہ مستحکم ہوتا ہے اور حاکم اتنا ہی زیادہ محفوظ رہتا ہے''۔ آدینہ بیگ نے صدیق خاں کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''یہ آپ کی حاکمانہ فراست کا ایک اور ثبوت ہے''۔ صدیق خاں نے آنکھیں جھکالیں۔

''صدیق خان! ہم آپ کو اپنا دوست اور ساتھی سمجھتے ہیں، ہم نے ہمیشہ آپ پر اعتماد کیا ہے۔ اگر ہم آگے بڑھتے ہیں تو آپ ہمارے ساتھ ہوں گے۔ اس لئے مستقبل کے منصوبوں کے بارے میں ہم آپ کو اعتماد میں لینا چاہتے ہیں''۔ آدینہ بیگ نے رازداری کے انداز میں کہا۔

''یہ حضور کی شفقت اور نوازش ہے، بندہ ہمیشہ آپ کی ترقی کو اپنی ذاتی ترقی سمجھتا رہا ہے، اس کا ماضی خود مستقبل کی ضمانت ہے''۔ صدیق خاں نے جواب دیا۔

''لاہور میں مغلانی بیگم کی طاقت اور گرفت مستحکم ہورہی ہے۔ بھکاری خاں اور قاسم خاں کی گرفتاری کے بعد وہ سکھوں کے خلاف کامیاب مہم شروع کرچکی ہے۔ اسے احمد شاہ ابدالی کی مکمل حمایت حاصل ہے۔ روایتی طور پر ہم صوبہ لاہور کا حصہ ہیں، ہماری آزادی اور اختیار ہماری قوت میں ہوں گے''۔

''حضور کی دوراندیشی کے چاند ستارے بھی معترف ہیں''۔

''ہم چاہتے ہیں کہ مزید سکھوں کو اپنی فوج میں بھرتی کیا جائے، آپ ان کے جتھے داروں اور سرداروں سے رابطہ کریں''۔

''بندہ کل ہی اس بارے میں حضور کو جملہ تفصیلات سے آگاہ کردے گا''۔

''ہمیں آپ کی صلاحیتوں پر اعتماد ہے، اب آپ جاسکتے ہیں''۔

صدیق خان اٹھا اور سلام کر کے باہر نکل گیا تو دربان نے دوسرے ملاقاتی کو پیش کیا۔

''بھوانی داس نے تمہاری صلاحیتوں اور وفاداری

کی بہت تعریف کی ہے، ہمیں تم سے مل کر خوشی ہوئی ہے''۔ آدینہ بیگ نے حاکمانہ انداز میں کہا۔

''یہ اس غلام کی عزت افزائی ہے''۔ نوجوان ملاقاتی نے ادب میں سر جھکا دیا۔

''ہمیں بتایا گیا ہے کہ نواب بھکاری خان تم پر بہت اعتبار کرتے تھے''۔ آدینہ بیگم نے پوچھا۔

''یہ ان کی ذرہ نوازی تھی''۔ نوجوان نے اعتراف کیا۔

''آج سے آپ ہمارے ملازم ہیں، ہمیں امید ہے کہ آپ اسی وفاداری سے ہمارے لئے کام کریں گے''۔

''وفاداری اس خاکسار کا آبائی پیشہ ہے، اس کے اجداد نے کبھی اپنے پیشہ کی توہین نہیں کی''۔

''ہمیں بتایا گیا ہے کہ قلعہ میں آپ کے روابط ہیں''۔

''میرے کچھ خون کے رشتہ دار قلعہ میں قابلِ اعتماد مقامات پر موجود ہیں''۔

''بھکاری خان سے رابطہ کب ٹوٹا؟''

''رابطہ تو بحال ہے، میں نے ان کی اجازت سے یہ مہم اختیار کی ہے''۔

''اس رابطہ کو بھی قائم رکھیں اور بھوانی داس کی ہدایت کے مطابق کام کریں۔ تنخواہ آپ کو وہیں سے ملے گی، ہم نے چٹھی لکھ دی ہے، تم آج ہی لاہور روانہ ہو جاؤ گے''۔

''حضور کی ہدایات غلام کے لئے مشعل زندگی ہیں''۔ ملاقاتی نے کہا اور سلام کر کے واپس مڑنے لگا تو آدینہ بیگ نے دربان کو طلب کیا۔ ''ہمت خاں کو ایک ہزار اشرفی سفر خرچ دلوا دیں ہم نے راستہ کے سکھ سرداروں کے نام وہ چٹھیاں لکھوادی ہیں کہ یہ ہمارے ذاتی ملازم ہیں، چٹھیاں بھی انہیں دلوادیں''۔

دربان اور ہمت خان باری باری سلام کر کے کمرے سے نکل گئے۔

آدینہ بیگ پہلو بدل کر کاغذات دیکھنے لگا۔

*

لاہور کے دہلی دروازہ کے پہریداروں نے ہمت خاں اور اس کے ساتھیوں کو شہر میں داخل ہونے سے روک دیا۔ سورج غروب ہونے میں ابھی ڈیڑھ پہر باقی تھا شہر کے دروازوں پر غروب آفتاب کے بعد مسلح پہرہ شروع ہوا کرتا تھا۔ اس غیر معمولی پہرہ پر وہ پریشان ہو گئے اور گھوڑوں سے اتر آئے۔ اپنے ساتھیوں اور گھوڑوں کو فصیل سے تھوڑی دور چھوڑ کر ہمت خاں واپس آیا اور پہریداروں کے کماندار سے ملنے کی اجازت چاہی۔

''آپ کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جانا ہے؟'' پہریداروں نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ میں یہ سب باتیں آپ کے کماندار کو خود بتا دوں؟'' اس نے جواب دیا۔

''مناسب یہی ہے کہ آپ یہ سب کچھ ہمیں بتا دیں تاکہ ہم اپنے کماندار کو بتا سکیں۔ فیصلہ وہ کریں گے کہ آپ کو انہیں ملنے کی اجازت دی جائے یا نہ دی جائے''۔

''میں اس شہر کا ایک تاجر ہوں اور شاہجہان آباد سے واپس آ رہا ہوں''۔ ہمت خان کو دیسی سپاہیوں کا رویہ بہت ناگوار گزرا۔

''آپ کا سامانِ تجارت کہاں ہے؟'' پہریدار نے پوچھا۔

''قافلہ ایک دن کی مسافت پر ہے، ہم اسے پیچھے چھوڑ کر آگے آ گئے ہیں''۔

''آپ کا نام کیا ہے؟''

''رحیم بخش''۔ ہمت خاں نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔

"آپ کے ساتھیوں کے کیا نام ہیں؟"

"ہمت خاں نے ان کے نام بھی بتا دیے تو ایک پہریدار اندر گیا اور تھوڑی دیر بعد آ کر اسے ساتھ لے گیا۔ اس غیر معمولی پہرہ اور جانچ پڑتال پر ہمت خاں اور بھی پریشان ہو گیا۔ پہریدار کے سوالات اور اپنے جوابات پر غور کرتا ہوا وہ اس کے پیچھے چلنے لگا۔ کمانڈر نے انہیں جانچ کر شہر میں داخل ہونے کی اجازت دے دی۔

لاہور کی گلیاں اور بازار سنسان تھے، دکانیں بند تھیں، کوئی اکا دکا آدمی کہیں نظر آتا تو وہ اس کا سبب پوچھنے کی کوشش کرتے مگر کوئی ان کی آواز پر کھڑا نہ ہوا۔ آدینہ بیگ کی ہدایت کے مطابق وہ سیدھے بھوانی داس کی حویلی گئے اور پہریدار سے کہا کہ وہ سیٹھ صاحب کو ان کی آمد کی اطلاع کر دے۔

ہمت خاں کی واپسی کی اطلاع پا کر بھوانی داس بہت خوش ہوا اور ملازم کو حکم دیا کہ ان سب کو فوری طور پر حویلی کے اندر بلا لیا جائے، گھوڑے اصطبل میں پہنچا دیں اور ہمت خاں کو ان کے پاس لے آئیں اور ان کے ساتھیوں کو مہمان خانہ پہنچا دیں۔

ہمت خان دیوان خانہ میں داخل ہوا تو اس کے آداب کا جواب دینے کی بجائے بھوانی داس نے پوچھا۔

"شیش محل کے اندر تمہارا کوئی قابلِ بھروسہ آدمی ہے؟"

اس سوال نے ہمت خاں کو اور بھی پریشان کر دیا۔

بھوانی داس نے اس سے آدینہ بیگ سے ملاقات کے بارے میں پوچھا نہ سفر کے بارے میں اور دیکھتے ہی شیش محل میں قابلِ بھروسہ رابطہ کے بارے میں استفسار شروع کر دیا۔

"میرے ماموں کا ایک عزیز وہاں ہے"۔ اس نے آدینہ بیگ کی چٹھی اسے پیش کرتے ہوئے بتایا۔

"کیا نام ہے اس کا اور وہاں کیا کام کرتا ہے؟"

"اس کا نام زمرد ہے اور وہ بیگم حضور کے بہت قابل اعتماد خواجہ سراؤں میں شامل ہے"۔ ہمت خاں نے بتایا۔ اس نے بھوانی داس کے چہرے کے آثار سے اندازہ کیا جیسے اس کی پریشانی دور ہو گئی ہو۔ بھوانی داس نے چٹھی الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"مغلانی بیگم کا بیٹا امین الدین گزشتہ شب فوت ہو گیا ہے، اس کی موت کے بارے میں شہر میں بہت سی افواہیں پھیلی ہوئی ہیں۔ ایک افواہ یہ ہے کہ بھکاری خاں نے کسی آدمی کے ذریعے اسے زہر دلا دیا ہے کیونکہ موت کے بعد اس کی نعش کی رنگت بھی اسی طرح نیلی پڑ گئی ہے جس طرح میر منو کی نعش نیلی پڑ گئی تھی۔ بیگم کے حامیوں اور مخالفوں میں تصادم کا خطرہ ہے۔ اسی وجہ سے شہر میں حفاظتی انتظامات سخت کر دیئے گئے ہیں اور بیرونی آدمیوں کا داخلہ بند کر دیا گیا ہے۔ ہمیں قلعہ اور شیش محل کے اندر کی خبریں معلوم کرنے کے لئے کسی ایسے ہی آدمی کی ضرورت ہے۔ آپ ابھی گھر جائیں، بچوں سے ملیں اور نہا دھو کر جلد واپس آ جائیں۔ جالندھر کی باتیں اسی وقت ہوں گی تب تک میں چٹھی بھی پڑھ لوں گا"۔

حاکم پنجاب کی موت کی خبر اس پر بم کی طرح اچانک گری اسے سوجھ نہیں رہا تھا کہ وہ جواب کیا دے۔ اس خبر سے اسے خوشی ہوئی ہے یا دکھ، ہمت خاں کچھ فیصلہ نہ کر پایا اور آداب بجا لا کر دیوان خانہ سے باہر نکل آیا۔ طویل سفر اور نازک سفارت کے بعد وہ آرام کرنا چاہتا تھا۔ امین الدین کی موت کی خبر اور اپنے نئے مالک کا حکم سن کر اسے اور بھی زیادہ تھکاوٹ محسوس ہونے لگی۔ حویلی سے نکل کر گھر کی طرف جاتے ہوئے وہ خوف سا محسوس کرنے لگا۔

*

شاہی مسجد میں نمازیوں کی تعداد سے اس نے اندازہ کیا کہ لاہور سے باہر سے بھی لوگ امین الدین کی نماز جنازہ میں شرکت کرنے آئے ہیں۔ امام بخاری نے

نماز کے بعد لوگوں کو مستعد رہنے کی ہدایت کی اور صوبہ کے حالات کی اصلاح کے لئے طویل دعا کی۔ مسجد کے صحن میں مسجد اور قلعہ کے درمیان جگہ جگہ شہر اور بیرون شہر کے لوگ ٹولیوں کی صورت میں بیٹھے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ ہمت خاں لوگوں میں گھوم پھر کر کوئی خبر معلوم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ امرائے دربار کے علاوہ کسی اور کو قلعہ میں داخلہ کی اجازت نہیں تھی، اس نے بہت کوشش کی کہ کوئی ایسا آدمی مل جائے جو خواجہ سرا زمرد تک اس کا پیغام پہنچا دے مگر کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ بھوانی داس کو وہ کیا جواب دے گا۔ یہ سوچ کر اس کی پریشانی اور تھکاوٹ اور بھی ناقابل برداشت ہونے لگیں تو گھوم پھر کر وہ مسجد میں واپس چلا گیا اور صحن میں بیٹھ کر فصیل کے اوپر سے شیش محل کی طرف دیکھنے لگا۔

''خاوند کے بعد اکلوتے بیٹے کی وفات پر مغلانی بیگم کا کیا حال ہو رہا ہوگا؟ وہ بیٹے کی نعش کے سرہانے کیسے کیسے بَین کر رہی ہوگی؟ اب وہ کتنے دن شیش محل اور قلعہ میں رہ سکے گی؟'' وہ سوچنے لگا اسے امین الدین کی موت پر پہلی بار شدید دکھ محسوس ہوا۔ اس معصوم کا کیا قصور تھا؟ اس نے اپنے آپ سے سوال کیا اور اٹھ کر سیڑھیوں کی طرف چل دیا۔ ایک مختصر سا چکر لگا کر وہ روشنائی دروازہ سے باہر نکل آیا اور شہر کی ویران گلیوں میں گھومتا ہوا اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ آدینہ بیگ بھی امین الدین کی موت پر خوش ہوگا؟ اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ بھکاری خاں تو یقیناً خوش ہوگا، اسے اپنے سابق آقا پر غصہ آنے لگا جس کی نظر میں انسانی قتل جیسا گھناؤنا جرم کتنا معمولی ہے۔

دروازے پر دستک دی تو اس کے بیٹے نے اندر سے پوچھا کون ہے اور جواب سن کر دروازہ کھول دیا۔ ہمت خاں کوئی بات کئے بغیر اپنے بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ رات آدھی کے قریب گزر چکی تھی۔ دن بھر کے سفر اور رات گئے تک مسجد اور قلعہ کے درمیان چکر لگانے سے وہ بہت تھک گیا تھا مگر نیند کہیں بہت دور چلی گئی تھی۔ آدینہ بیگ نے اس کی بہت آؤ بھگت کی تھی اس کی توقع سے بہت زیادہ اسے انعام دیا تھا، نئی ملازمت اس کے لئے ایک اعزاز تھی۔ وہ خوش حالی اور ترقی کے خواب کھلی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ اسے امین الدین کی موت پر خوشی سی محسوس ہوئی اور تھکاوٹ دور ہوگئی۔ جب صبح کی اذان ہوئی تو وہ گہری نیند سوتا رہا تھا۔

امین الدین کا جنازہ شاہانہ انداز میں اٹھایا گیا، امرائے دربار فوجی اور سول حکام معززین شہر اردگرد کے دیہات کے شرفاء اور اہل شہر جنازہ کے ساتھ بہت لوگ تھے۔ مغلانی بیگم کے ماموں خواجہ عبداللہ خاں نے قلعہ سے نکلتے ہی جنازہ کی قیادت سنبھال لی۔ خواتین قلعہ کے دروازہ تک جنازہ کے ساتھ آئیں اور واپس چلی گئیں مگر کنیزوں کی آہ و بکا کی آوازیں قلعہ کی فصیل کے اوپر سے آ رہی تھیں۔ خواجہ سرا سر پیٹ رہے تھے۔ ہمت خاں نے بہت تلاش کیا مگر زمرد کا کوئی پتہ نہ چل سکا تھوڑی دور چل کر اسے اپنا ماموں نظر آیا، وہ سر جھکائے آہستہ آہستہ جلوس کے عقب میں چلا جا رہا تھا۔ ہمت خاں اس کے قریب گیا اور آہستہ سے کوئی بات کی، اس کے ماموں نے ایک طرف ہٹ کر اس سے سرگوشی کی اور وہ دونوں ایک دوسرے سے دور ہٹ گئے۔

اس روز بھی شہر میں کوئی دُکان نہیں کھلی اہل شہر افسردہ اور پریشان تھے۔ ایسے محسوس ہوتا تھا امین الدین کی موت نے ہر فرد کو متاثر کیا ہے۔ شام کی نماز کے بعد ہمت خاں بھوانی داس کی حویلی گیا اور جلد ہی واپس آ گیا۔ مسجد وزیر خاں کے عقب میں تنگ گلیوں سے ہوتا ہوا وہ اپنے ماموں کے گھر پہنچ گیا۔ دروازے پر دستک دی تو ملازم نے دروازہ کھولے بغیر اس کا نام پوچھا اور پھر دروازہ کھول کر اندر لے گیا۔ اس کا ماموں ایک چھوٹے

سے کمرے میں بیٹھا اس کا انتظار کررہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ اٹھا اور ایک تنگ راہداری سے گزر کر وہ ایک اور کمرے میں پہنچ گئے۔ وہ فرش سے قالین اٹھا کر لکڑی کے تختے اٹھانے لگا، تہہ خانہ کی سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچے تو دروازہ بند تھا اس کے ماموں نے دروازے پر وقفہ وقفہ سے تین دفعہ دستک دی تو کسی نے اندر سے دروازہ کھول دیا۔ وہ جھک کر اندر داخل ہو گئے۔ تہہ خانہ کے فرش پر قالین بچھے تھے اور درمیان میں ایک فرشی شمعدان رکھا تھا، شمعدان سے ذرا ہٹ کر ایک بستر لگا تھا جس کے شکنوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ تہہ خانہ کا باسی بستر سے اٹھ کر دروازہ کھولنے گیا تھا۔

''میں دو روز سے تمہاری تلاش میں پریشان پھر رہا ہوں''۔ ہمت خاں نے فرش پر بیٹھتے ہوئے بھاری بھرکم سرخ و سفید خواجہ سرا سے کہا۔

''میں تو چار روز سے یہاں مقیم ہوں''۔ اس نے جواب دیا لیکن اس کی آواز ایسی تھی جیسے وہ کئی ماہ سے بیمار ہو۔

''کیوں بند ہیں، آپ یہاں؟'' ہمت خاں نے پوچھا۔

''پھوپھا حضور نے آپ کو کچھ بتایا نہیں''۔ اس نے اس کے ماموں کی طرف اشارہ کیا۔

''ماموں نے صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ آپ سے ملاقات کرا سکتے ہیں اگر آپ پسند کریں تو خود بتا دیں''۔

مغلانی بیگم کو شبہ ہے کہ میں نے بھکاری خاں سے رشوت لے کر اس کے بیٹے کو زہر دیا ہے، اگر مجھے بروقت پتہ نہ چل جاتا تو اب تک وہ مجھے پھانسی چڑھا چکی ہوتی''۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔

ہمت خاں سوچنے لگا۔ ''تو گویا شیش محل میں اس کا رابطہ ختم ہو گیا؟''

''ہمت خاں آدینہ بیگ کی ملازمت میں چلا گیا ہے، کل ہی جالندھر سے آیا ہے''۔ اس کے ماموں نے اسے بتایا۔

''ہماری جان صرف نواب آدینہ بیگ ہی بچا سکتے ہیں، آپ کسی طرح ہمیں ان کے دربار تک پہنچا دیں''۔ اس نے ہمت خاں سے دونوں ہاتھ جوڑ کر درخواست کی۔

''بھکاری خاں نے آپ کی کوئی مدد نہیں کی؟'' ہمت خاں نے پوچھا۔

''انہوں نے دو ہزار روپیہ بھجوایا ہے اور کہا ہے کہ ان حالات میں وہ ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ لوگ بہت غصہ میں ہیں وہ کہتے ہیں فوری طور پر لاہور سے نکل جاؤ''۔ اس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

''چند روز تک حالات ٹھیک ہو جائیں گے، آپ یہیں چھپے رہیں''۔ ہمت خاں نے سوچا وہ پھر سے شیش محل میں پہنچ گئے تو اس کے کام آ سکیں گے۔

''مغلانی بیگم کے جاسوس مجھے تلاش کر رہے ہیں، پتہ چل گیا تو پھوپھا حضور بھی پھنس جائیں گے۔ وہ ان کے بال بچوں کا بھی ٹھن بچہ کولہو کروا دے گی۔ مجھے اپنی نہیں ان کی فکر ہے۔ مغلانی بیگم بہت ظالم خاتون ہے، آپ کو اس کی طبیعت کا علم نہیں میرے لئے نہیں اپنے ماموں کے بچوں کے لئے کچھ کرو''۔ اس نے ہمت خاں کے پاؤں پکڑ لئے۔

اسے زمرد کی زیادہ فکر نہیں تھی مگر اپنے ماموں اور ان کے بال بچوں کے لئے وہ بھی فکر مند ہو گیا۔ ''میں کل شام تک آپ کو کچھ بتا سکوں گا، آپ فکر نہ کریں اللہ خیر کرے گا''۔ ہمت خاں نے اٹھتے ہوئے اسے حوصلہ دیا۔

*

بھوانی داس نے پوجا پاٹ سے فارغ ہو کر کڑھا پوڑی سے ناشتہ کیا اور دیوان خانہ میں آ کر بیٹھ گیا۔ وہ اپنے ذرائع سے بھی کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح پتہ چل جائے کہ مغلانی بیگم کا اب کیا ارادہ ہے۔ اسے معلوم ہوا

تھا کہ امین الدین کا جنازہ اٹھنے سے پہلے ہی بیگم نے احمد شاہ ابدالی کی طرف ایلچی روانہ کر دیا تھا اور درخواست کی تھی کہ حاکم پنجاب کی سند اس کے نام جاری کر دی جائے اور اسی قسم کی سفارت وہ شاہجہان آباد بھی بھیجنے والی ہے جہاں اس کا ہونے والا داماد عمادالملک وزارت عظمیٰ کے منصب پر فائز ہو چکا تھا۔ بھوانی داس جلد از جلد آدینہ بیگ کو ان حالات سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے مراسلہ لکھنا شروع ہی کیا تھا کہ ملازم نے اطلاع دی کہ ہمت ان حاضر ہونا چاہتا ہے۔ بھوانی داس نے کاغذ اور قلم دوات ایک طرف رکھ دیئے۔

ہمت خاں نے جھک کر سلام کیا اور کچھ عرض کرنے کی اجازت حاصل کر کے بتایا کہ خواجہ سرا زمرد سے اس کی ملاقات ہوگئی ہے۔

''بھکاری خاں کے آدمی نے ہمیں اس کے بارے میں بتایا ہے اور درخواست کی ہے کہ ہم اس کی کچھ مدد کریں''۔ بھوانی داس نے اسے بتایا۔

''زمرد بہت کام کا آدمی ہے، شیش محل اور قلعہ میں اس کے بہت تعلقات ہیں۔ اگر حضور اس مرحلہ پر اس کی حفاظت کریں تو کچھ عرصہ بعد واپس آکر وہ ہماری بہت مدد کر سکتا ہے''۔ ہمت خاں نے زمرد کا کیس پیش کیا۔

''اگر ہم اسے جالندھر بھجوانے کا انتظام کر دیں تو تمہیں اس کے ساتھ جانا پڑے گا''۔ بھوانی داس نے اس کا جائزہ لینے کے لئے کہا۔

''بندہ حضور کے حکم کی تعمیل اپنی خوش بختی سمجھتا ہے''۔ ہمت خاں اگرچہ تین روز پہلے ہی سفر سے واپس آیا تھا مگر اپنے ماموں اور زمرد کی خاطر وہ نئے سفر کے لئے تیار ہو گیا۔

''تم سفر کی تیاری کرو۔ ایک پہر دن گئے تم کو جالندھر روانہ ہونا ہے۔ ہم چٹھیاں اور گھوڑے تیار کروا دیتے ہیں۔ زمرد کو شہر سے باہر نکالنا مشکل ہوگا مگر ہم اس سلسلے میں بھی کچھ کر رہے ہیں''۔ بھوانی داس نے حکم دیا۔

ہمت خاں آداب عرض کر کے باہر نکل گیا۔ اسے امید نہیں تھی کہ کام اتنی جلد اور آسانی سے ہو جائے گا۔ وہ بڑا خوش ہوا اور سیدھا اپنے ماموں کے گھر گیا اور انہیں اطلاع دی تو زمرد سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ''بھوانی داس ہمارے لئے رحمت کا فرشتہ ہے''۔

''رحمت کے فرشتہ تک رسائی ہمت خاں کی وجہ سے ہوئی ورنہ فرشتہ تو پہلے بھی اسی شہر میں تھا''۔ ہمت خاں کے ماموں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ اسے پسند نہیں تھا کہ زمرد اس کے بھانجے سے زیادہ کسی اور کا شکر گزار ہو۔

''ہمت خاں تو رحمت کے فرشتوں کا بھی فرشتہ ہے، ہم زندگی بھر اس کا اور آپ کا احسان نہیں بھلا سکیں گے''۔ زمرد کو احساس ہو گیا کہ اس کے منہ سے غلط بات نکل گئی ہے۔

شہر کے حالات کچھ معمول پر آنے لگے تھے، دکانیں اور بازار کھل گئے تھے، امین الدین کی پُر اسرار موت سے لوگوں میں افسوس باقی تھا مگر غصہ کم ہو گیا تھا۔ آنے جانے والوں کی نگرانی اور جانچ پڑتال بھی بہت معمولی رہ گئی تھی۔ اس صبح ایک تجارتی قافلہ قندھار کے لئے روانہ ہوا تھا جو بڑا قافلہ تھا۔ ایک چھوٹا قافلہ شاہجہان آباد کے لئے روانہ ہوا جس کے ساتھ حفاظتی انتظامات بہت زیادہ تھے کیونکہ اسے امرتسر کی طرف سے ہو کر جانا تھا۔ بھوانی داس کے آدمی شہر اور قافلوں کی روانگی کا جائزہ لیتے رہے تھے۔ ہمت خاں اور زمرد تاجروں کا بھیس بدل کر نماز ظہر کے بعد موچی دروازہ کی طرف سے نکلے تو ان کے ساتھ چھ سات محافظ تھے اور چار فالتو گھوڑے۔ خواجہ سرا زمرد نے زندگی میں پہلی بار بھیس بدل کر مردانہ انداز میں گھوڑے پر سواری کی تھی اس لئے جب تک وہ شہر سے کافی دور نہیں نکل گئے بھوانی داس کے آدمی فکر مند رہے

کہ کہیں کوئی جاسوس زمرد کو پہچان نہ لے۔ جب بھوانی داس کو قافلہ کے شہر کی حدود سے دور نکل جانے کی خبر ملی تو اس نے بھگوان کا شکر ادا کیا۔

اگلی صبح بھوانی داس ابھی ضروری کاموں سے فارغ ہو کر دیوان خانہ میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ ڈیوڑھی کے پہریدار نے اطلاع دی کہ دروازے پر ایک آدمی کھڑا ہے اور کہتا ہے کہ اسے فوری طور پر حضور سے ملنا ہے۔

"انہیں اندر بلا کر ادھر بٹھاؤ ہم فارغ ہو کر آتے ہیں تو اس کی بات سنیں گے"۔ بھوانی داس نے بہی کھاتے الٹ پلٹ کرتے ہوئے کہا۔

"حضور وہ بہت ضد کر رہا ہے، کہتا ہے آپ سے جالندھر کے قافلہ کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے"۔ پہریدار نے بتایا۔

جالندھر کے قافلہ کا سن کر قلم بھوانی داس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ "اسے فوراً لاؤ ہمارے پاس"۔

وہ ابھی بہی کھاتے ایک طرف رکھ ہی رہا تھا کہ دربان ایک خستہ حال آدمی کو لے کر داخل ہوا۔

"کیا ہوا قافلہ کا؟" بھوانی داس چلایا۔

"حضور! لٹ گیا، قتل ہو گیا"۔ وہ بھی چلایا۔

"کون قتل ہو گیا؟"

"دونوں قتل ہو گیا، وہ گھوڑوں پر سوار تھے، آتے ہی ہمت خان اور دوسرے موٹے خاں کو ختم کر دیا اور سب مال لوٹ لیا"۔

بھوانی داس سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ "باقی آدمیوں کا کیا بنا؟"

"ہم بچ گیا، باقی سب مارا گیا"۔

"وہ کون تھے؟"

"ڈاکو تھے حضور!"

"سکھ تھے یا مسلمان؟"

"ہم کچھ نہیں بتا سکتا حضور! بس ڈاکو تھے"۔

"انہوں نے قتل کر کے ان کی تلاشی تو نہیں لی تھی؟"

"ہمیں کچھ پتہ نہیں حضور! ہم تو بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگ گیا"۔ قافلہ کے محافظ نے جواب دیا۔

بھوانی داس کو ہمت خاں اور زمرد کے قتل سے زیادہ ان چٹھیوں کی فکر تھی جو اس نے آدینہ بیگ کے لئے بھیجی تھیں۔ اگر وہ چٹھیاں مغلانی بیگم کے جاسوسوں کے ہاتھ لگ گئیں تو اس کی اپنی خیریت نہیں ہو گی۔ چٹھیوں میں دربار لاہور اور مغلانی بیگم کے بارے میں بہت سی اہم باتیں لکھی تھیں۔ مغلانی بیگم کے جاسوس خواجہ سرا زمرد کی تلاش میں تھے مگر انہوں نے اسے قتل کیوں کیا، گرفتار کر کے مغلانی بیگم کے روبرو پیش کرتے تو بہت انعام ملتا۔ وہ سانحہ کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے لگا۔

*

مغلانی بیگم کی موٹی موٹی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بہت نمایاں ہو گئے تھے۔ کئی روز سے اس نے کپڑے بدلے تھے نہ سر میں کنگھی کی تھی۔ خوابگاہ کی کھڑکی کے سامنے بیٹھی وہ ان راستوں کی طرف دیکھ رہی تھی جن پر چلتی ہوئی وہ خاتون سمرقند سے آئی تھی جس کی اولاد چالیس برس تک پورے ہندوستان پر حاکم تھی۔ خاوند کی وفات کے بعد اس نے عہد کیا تھا کہ وہ اس خاتون کے نقشِ قدم پر چلے گی اور اپنے کم سن بیٹے کو اس خاندان کی روایات کا امین بنائے گی مگر امین الدین کی وفات سے اس کے سب خواب پریشاں ہو گئے تھے۔ آنسو اس کے رخساروں پر بہنے لگے۔

"مادر محترم! ہم اندر آ سکتے ہیں؟" عمدہ بیگم کی آواز نے اس کی سوچ کی لڑی توڑ دی۔

اس نے جلدی سے آنسو پونچھ ڈالے۔ "آ ئیں جانِ مادر! ہم آپ کے منتظر ہیں"۔

مغلانی بیگم نے اسے سینے سے لگا لیا، کافی دیر ماں

بیٹی ایک دوسری سے چمٹی خاموش کھڑی رہیں۔ وہ ایک دوسری کے دل کا حال جانتی تھیں اور ایک دوسری سے دل کی حالت چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ دونوں ایک دوسری کو تسلی دینا چاہتی تھیں مگر زبان کھول کر اپنی کمزوری ظاہر نہیں کر رہی تھیں۔

''اماں حضور! کیا یہ ممکن ہے کہ آپ اپنا کچھ غم ہمیں دے دیں!'' آخر بیٹی نے جرأت کی۔

''جان مادر! آپ اپنا غم کسے دیں گی؟'' ماں نے بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

دو موٹے آنسو عمدہ بیگم کے رخساروں پر چمکنے لگے۔

''یہ تو ہماری روایت نہیں''۔ ماں نے بیٹی کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''ہمیں افسوس ہے مادر محترم!'' عمدہ بیگم نے سنبھلنے کی کوشش کی۔

''ان سب راستوں پر تیرے اجداد کی جرأت اور عظمت کے نشان ثبت ہیں کبھی کبھی کھڑکی کھول کر ان نشانات کو دیکھ لیا کرو تا کہ تم ان پر چلنا نہ بھول جاؤ''۔ بیگم نے کھلی کھڑکی سے باہر کی طرف اشارہ کیا۔

''ہم آپ کے ہر لفظ پر عمل کریں گے''۔ عمدہ بیگم باہر کی طرف دیکھنے لگی۔

''تنکے ہوا کے ساتھ اس لئے اڑ جاتے ہیں کہ کسی راستے پر ان کے اجداد کے قدموں کے نشان نہیں ہوتے۔ درخت طوفانوں میں ٹوٹ جاتے ہیں مگر اپنا مقام نہیں چھوڑتے۔ ہمیں طوفانوں کا مقابلہ کرنا ہے، تنکے نہیں بننا۔ یہ ہماری روایت نہیں''۔ مغلانی بیگم نے کھڑکی بند کرتے ہوئے کہا۔

کنیز نے اذن مداخلت چاہا تو دونوں نے گردن گھما کر دروازے کی طرف دیکھا۔

''کیا امر مجبوری ہوا گل بنفشہ؟'' مغلانی بیگم نے پوچھا۔

''میاں خوش فہم کے پاس کوئی ضروری پیغام ہے حضور!'' گل بنفشہ نے مداخلت کے لئے معذرت کرتے ہوئے بتایا۔

''اسے بتا دیں ہم منتظر ہیں''۔

گل بنفشہ آداب بجالا کر باہر نکل گئی۔

مغلانی بیگم سنبھل کر اپنی نشست پر بیٹھ گئی۔

''حضور! نادر بیگ کسی حکم کے لئے سراپا التجا ہیں''۔

میاں خوش فہم نے فرشی سلام کیا۔

''انہیں کہہ دیں آج شام دربار عام میں سب امراء درباریوں اور سرداروں کی شمولیت کی کوشش کی جائے۔ معززین شہر کی حاضری زیادہ سے زیادہ ہو''۔ بیگم نے نادر بیگ کے لئے ہدایات دیں تو میاں خوش فہم اسی انداز میں سلام کر کے الٹے قدموں باہر نکل گیا۔

''ہمیں اجازت ہے کہ آج ہم بھی آپ کے ساتھ دربار میں شریک ہوں''۔ عمدہ بیگم نے پوچھا۔

''ہمیں کوئی اعتراض نہیں مگر اس سے مغل اور ترک سرداروں کو فتنہ پھیلانے کا ایک اور بہانہ مل جائے گا۔ اب تک وہ عماد الملک کو ہمارے خلاف بھڑکانے کو کہتے ہیں کہ آپ کی ممانی نے آپ کے خاندان کی روایات کا احترام نہیں کیا۔ پردہ سے نکل کر دربار لگاتی ہیں۔ اس سے آپ کے خاندان کی بدنامی ہو رہی ہے۔ آپ نے دربار میں شرکت کی تو کہیں گے آپ مغل سلطنت کے وزیر اعظم ہیں اور آپ کی منگیتر محل سے دربار میں آ گئی ہے۔ مفسدوں کو فساد کے لئے کوئی بہانہ درکار ہے''۔ ماں نے بیٹی کو سمجھایا۔

عمدہ بیگم نے سر جھکا لیا۔ ''ہم نے تو اس لئے کہا تھا کہ آپ تنہائی محسوس نہ کریں''۔

''اب ہمیں اور بھی محتاط رہنا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ قندھار سے جلد سند حکومت آ جائے گی۔ شاہجہان آباد

میں بادشاہ اور عماد الملک میں اختلافات بہت بڑھ گئے ہیں۔ ہوسکتا ہے دونوں جھگڑے کی وجہ سے وہ پنجاب کے بارے میں جلد کوئی فیصلہ نہ کرسکیں۔ بھکاری خاں کے حامی اور آدینہ بیگ بھی اس موقعہ پر خاموش نہیں رہیں گے"۔ بیگم نے بیٹی کو بتایا۔

"وزیر اعظم اپنے ماموں اور بھائی کے قاتلوں کے خلاف ہمارا ساتھ نہیں دیں گے؟" عمدہ بیگم نے حیرانی سے سوال کیا۔

"خون کے رشتوں کے علاوہ بھی اقتدار کے کچھ رشتے ہوتے ہیں ان کی کچھ مجبوریاں ہوسکتی ہیں۔ آپ کو وزیر اعظم کے بارے میں کوئی بدگمانی نہیں رکھنا چاہئے وہ ہمارا بیٹا ہے۔ ہمیں اس کے لئے آسانیاں پیدا کرنا ہیں، مصائب نہیں"۔ بیگم نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

عمدہ بیگم ماں کے انداز سے سمجھ گئی کہ وہ اس موضوع پر زیادہ بات کرنا پسند نہیں کرتیں اور اجازت لے کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

مغلانی بیگم کاغذات دیکھنے لگی۔

*

اگلی صبح بھکاری خان کے حامی بھوانی داس کی حویلی میں جمع ہوئے۔ مغلانی بیگم نے دربار عام میں خود حاکم پنجاب بننے کا اعلان کر کے انہیں نئی منصوبہ بندی پر مجبور کرتا تھا۔ شیش محل کے ذرائع نے انہیں بیگم کے ارادہ سے آگاہ تو کر دیا تھا لیکن انہیں یہ امید نہ تھی کہ قندھار سے منظوری آنے سے پہلے ہی وہ اپنے حاکم پنجاب ہونے کا اعلان کردیں گی۔ وہ نیا منصوبہ سوچتے رہے اور بیگم نے حاکم پنجاب ہونے کا اعلان کر دیا اور بیٹے کی موت کے شدید صدمہ کو بھی برداشت کرگئی۔ ان کا خیال تھا کہ صدمہ کی وجہ سے وہ جلد کوئی فیصلہ نہیں کرسکے گی اور وہ مغل دربار میں اپنے بااثر امراء اور آدینہ بیگ کی مدد سے عماد الملک اور بادشاہ پر اثر انداز ہو کر کسی مرد کو پنجاب کا صوبیدار مقرر کروا سکیں گے اور پنجاب میں سکھوں کی بڑھتی ہوئی شورش اور بدامنی اور مغلانی بیگم کی وجہ سے عماد الملک کے خاندان کی نیک نامی کو بہانہ بنا کر اس سے نجات حاصل کر لیں گے مگر اس کے اعلان سے ساری صورت حال بدل گئی تھی اور عماد الملک کے لئے اپنی ممانی اور ہونے والی ساس کو ہٹا کر کسی اور کو حاکم پنجاب مقرر کرنا مشکل ہوگیا تھا۔

"نواب آدینہ بیگ کو بروقت اطلاع مل جاتی تو وہ ضرور اپنا اثر ورسوخ استعمال کرتے ہمارا خیال ہے ہمت خاں اور زمرد کو مغلانی بیگم کے جاسوسوں نے قتل کیا ہے اور ان سے ملنے والی چٹھیوں کی وجہ سے مغلانی بیگم نے اتنی جلد بازی کی ہے"۔ ایک شریک مشاورت نے رائے دی۔

"آٹھ ماہ میں آپ بیگم کے خلاف کچھ نہیں کر سکے۔ ایک عورت نے شیش محل کی دیواروں کے پیچھے بیٹھ کر بھکاری خان جیسے جہاندیدہ جرنیل اور امیر الامراء کی کوئی چال نہیں چلنے دی جس کے بارے میں آپ سب بھی درست اندازہ نہ کرسکے۔ اب آپ کا کیا خیال تھا کہ وہ انتظار کرے گی تاکہ ہم سب اس کے خلاف اپنے منصوبے مکمل کرلیں تو اس کے بعد اعلان کرے"۔ بھوانی داس نے تنگ کر کہا اس نے محسوس کیا جیسے اسے اس ناکامی کا ذمہ دار ٹھہرایا جارہا ہو۔

"آپ نے بجا ارشاد فرمایا۔ مغلانی بیگم ہم سب کی توقعات سے زیادہ ہوشیار اور سمجھدار ثابت ہوئی۔ اس نے لاہور دربار کے تجربہ کار اور ہوشیار امراء کی ایک نہیں چلنے دی۔ اب بھی اس نے شدید صدمہ کے باوجود بہادری اور جرأت کا ثبوت دیا ہے ہمیں ماننا چاہئے"۔ دوسرے امیر نے بھوانی داس کی ناراضی کا احساس کرتے ہوئے کہا۔

"ہم اسی لئے آپ کے پاس آئے ہیں کہ آپ بتائیں اب کیا کرنا چاہئے"۔ پہلا امیر بولا۔ اسے بھی احساس ہوگیا تھا کہ بھوانی داس نے اس کی بات کا برا مانا

ہے۔ وہ اسے ناراض نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اس کے پاس دولت بھی تھی اور اس کے ساتھ آدینہ بیگ کی طاقت بھی تھی۔

''ہم نے نواب صاحب کو ایک اور چٹھی لکھی ہے، دو روز تک انہیں مل جائے گی۔ وہ لاہور اور پنجاب کی صورت حال سے پریشان ہیں۔ لازماً عمادالملک اور بادشاہ کو اس اعلان کے نتائج کے بارے میں لکھیں گے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ مغل بادشاہ اور عمادالملک ان کے خیالات کو ضرور اہمیت دیں گے''۔ بھوانی داس نے جواب دیا۔

''لیکن اگر احمد شاہ ابدالی نے بیگم کے نام کی سند حکومت جاری کر دی تو عمادالملک ابدالی کو ناراض کرنا پسند نہیں کرے گا۔ شاہجہان آباد کی خبروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغل بادشاہ احمد شاہ ابدالی سے لڑائی مول لینے کے قابل نہیں''۔ ایک اور امیر نے کہا۔

''شاہ قندھار کو چٹھی لکھ کر مغلانی بیگم نے مغل بادشاہ کی حاکمیت سے اخراج کا ارتکاب کیا ہے۔ عمادالملک بھی پسند نہیں کرے گا کہ اس اخراج کے باوجود سند حکومت جاری کرنے میں تعاون کرے۔ اس سے خود اس پر بھی الزام آ سکتا ہے''۔ بھوانی داس نے شاہجہان آباد کے لڑائی جھگڑوں اور امراء کی گروہ بندی کا حوالہ دے کر کہا۔

''آپ کی رائے بہت صائب ہے''۔ ایک امیر نے تائید کی۔

''نواب بھکاری خاں کی کیا رائے ہے؟'' بھوانی داس نے پوچھا۔

''انہوں نے حراست خانہ سے پیغام بھیجا ہے کہ ہم اس اعلان کے بارے آپ سے بات اور تعاون کریں''۔ ایک امیر نے جواب دیا جو خاموش بیٹھا ان کی باتیں سن رہا تھا۔

''یہ تو ہم نواب صاحب تک پہنچا دیں گے۔ ہم جاننا چاہتے ہیں نواب بھکاری خاں کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تاکہ اس کی روشنی میں کوئی مشترکہ منصوبہ بنایا جائے''۔ بھوانی داس ماہر سفارت کار کی مانند بھکاری خاں کے ارادے جاننا چاہتا تھا تاکہ آدینہ بیگ کو ان سے بھی آگاہ رکھ سکے۔

''قندھار کے دربار میں بھکاری خاں کا کوئی رابطہ نہیں وہاں وہ کوئی اثر پیدا نہیں کر سکتے۔ نواب بھکاری خاں چاہتے ہیں کہ شاہجہان آباد کے امراء سے روابط استعمال کئے جائیں اور وہ بادشاہ اور وزیراعظم پر اثر انداز ہوں اور عمادالملک کو یقین ہو جائے کہ مغلانی بیگم نے ان کے خاندان کی نیک نامی بدنامی میں بدل دی ہے اگر وہ قابض رہی تو ان کی شہرت خاک ہونے کا خوف ہے''۔ تیسرے امیر نے بتایا۔

''ہم دیکھتے ہیں کہ ترک اور مغل سردار اور امراء تو مغلانی بیگم کے خلاف ہیں مگر علماء اور عوام اس کے ساتھ ہیں۔ اس کی وجہ ہم نہیں جان سکے''۔ بھوانی داس نے پوچھا۔

''علماء اور عوام پر بابا خان ولی اور امام بخاری کا اثر ہے، انہیں بدلے بغیر عوام کا بدلنا مشکل ہے''۔ پہلے امیر نے بتایا۔

''ہمیں تو بتایا گیا تھا بابا خان ولی بھکاری خاں کے ساتھ ہیں''۔ بھوانی داس نے حیرانی ظاہر کی۔

''ہم بھی سنتے ہیں مگر شاید مغلانی بیگم کی کھلی مخالفت کر کے وہ بھی احمد شاہ ابدالی کو ناراض کرنا پسند نہ کرتے ہیں''۔

''اور امام بخاری؟'' بھوانی داس نے پوچھا۔

''وہ سکھوں کے خلاف اس خاندان کی خاص طور پر میر منو مرحوم کی مہم کی وجہ سے ان کے لئے ہمدردی رکھتے ہیں اور باہمی انتشار کے خلاف ہیں۔ وہ کہتے ہیں، اس

سے دشمن کو فائدہ ہوگا"۔

"ایک عالم دین عورت کی حاکمیت کو کیسے برداشت کرسکتا ہے؟" بھوانی داس نے کہا۔

"مغلانی بیگم حاکم صوبہ ہیں، حاکم مملکت تو نہیں"۔ اسی امیر نے وضاحت کی۔

"ایک عورت آپ پر حاکم ہے، آپ کے مذہب میں یہ ٹھیک نہیں۔ اس سے آپ حاکم نسل والوں کی بدنامی ہو رہی ہے۔ میر منو اور عماد الملک کی بدنامی ہو رہی ہے۔ ہم تو اس بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتے، دوسرے مذہب والے ہیں، آپ کو کچھ سوچنا چاہئے اور لوگوں کو بتانا چاہئے"۔

"ہم بھکاری خاں سے بات کریں گے"۔ اسی امیر نے جواب دیا۔

"ہرگز نہیں بیگ صاحب ہم ہرگز کچھ نہیں کہہ رہے، ہماری طرف سے نواب صاحب سے نہ کہنا ہم تو ویسے ہی بات کر رہے ہیں۔ یہ آپ کا مذہبی معاملہ ہے، ہم تو صرف جاننا چاہتے تھے، ہم نواب آدینہ بیگ کے ملازم ہیں اور امن سے حکومت کر رہے ہیں۔ ہمیں ایسی باتوں سے کیا غرض۔ یہ مسلمانوں کا مذہبی معاملہ ہے۔ ہم تو رعایا ہیں، کوئی مرد حاکم ہو یا عورت ہمیں کیا"۔ بھوانی داس نے "ہرگز نہیں" پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"نواب آدینہ بیگ سلطنت کے وفادار حاکم ہیں وہ پنجاب کے معاملات سے لاتعلق نہیں رہ سکتے پنجاب کے حالات کا ان پر بھی اثر پڑے گا"۔

"سلطنت سے وفاداری کی وجہ سے ہی تو وہ پنجاب کے بارے میں فکرمند ہیں ورنہ ان کے اپنے دوآبہ میں ایسا امن ہے کہ پورے ہندوستان میں کہیں نہیں سکھ ان کے نام سے کانپتے ہیں۔ آپ نے بھی نہ سنا ہوگا کہ دوآبہ جالندھر میں داخل ہونے کی کبھی انہیں جرأت ہوئی ہو"۔ بھوانی داس نے کہا۔

"اس کا تو مغل بادشاہ اور وزیراعظم کو بھی اعتراف ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہم سب نواب آدینہ بیگ کے ساتھ مل کر صوبہ میں امن بحال کرنا چاہتے ہیں تاکہ سکھوں کی شورش کو دبایا جا سکے۔ پنجاب کی حالت درست نہ ہوئی تو مغل سلطنت کے لئے بھی خطرہ ہوگا۔ نواب آدینہ بیگ کو لازماً اس سے تشویش ہونا چاہئے"۔

"ہم آپ کی تشویش سمجھتے ہیں، آپ نواب بھکاری خاں سے مشورہ کریں ہم نواب آدینہ بیگ کو اس بارے میں چٹھی لکھ دیں گے"۔

"ہم مشورہ کر کے آپ کو جلد آگاہ کریں گے۔ نواب بھکاری خاں اور نواب آدینہ بیگ مل جائیں تو مغلانی بیگم ان کا مقابلہ نہیں کر سکے گی"۔

"نواب آدینہ بیگ کو نواب بھکاری خاں سے ملنا ہے یا نہیں یہ تو انہیں فیصلہ کرنا ہے، ہم تو صرف آپ کا پیغام پہنچا سکتے ہیں"۔

"نواب آدینہ بیگ آپ کی رائے اور مشورہ پر بہت اعتماد کرتے ہیں، آپ جو مشورہ دیں گے وہ ضرور مانیں گے"۔

"نواب صاحب کی مہربانی ہے کہ وہ اس خاکسار پر اعتماد کرتے ہیں، اس کی وجہ یہی ہے کہ ہم نے انہیں کبھی غلط مشورہ نہیں دیا"۔

"حالات کی رفتار راوی کی لہروں سے تیز تر ہے مگر انسانی فکر سے تیز نہیں"۔

"ہم آپ کی فکر کی تیزی کا ساتھ دینا پسند کریں گے اور منتظر رہیں گے، آپ کیا پیغام لاتے ہیں"۔

بھکاری خاں کے نمائندے دیوان خانے سے نکلے تو بھوانی داس ان کے ساتھ حویلی کے دروازے تک گیا اور ہر ایک کو جھک کر سلام کر کے رخصت کیا پہریدار نے ان کے پیچھے دروازہ بند کیا تو وہ تھوڑی دور جا کر واپس اس کے پاس آ گیا۔

"کسی کو علم نہیں ہونا چاہیے کہ ادھر کون آیا تھا"۔ بھوانی داس نے پہریدار کو ہدایت کی۔

"خادم کو تو خود بھی علم نہیں سرکار! باہر والوں کو کیسے علم ہوگا"۔ اس نے جواب دیا۔

بھوانی داس مسکرایا اور تیز تیز چلتا ہوا دیوان خانے میں داخل ہو گیا۔ اس کی چال اور انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ اسے کوئی اہم خبر ہاتھ لگ گئی ہے۔ جب اسے بہی کھاتے لکھنا ہوتے تھے تو وہ قدم جما جما کر آہستہ آہستہ چلتا تھا۔ جب کوئی چٹھی لکھنا ہوتی تو سوچ میں ڈوب جاتا تھا، جب کوئی خبر مل جائے تو ہوا میں اڑتا ہوا معلوم ہوتا تھا، اس لیے پہریدار اور خدام اس کی چال سے ہی معاملہ کی نوعیت سمجھ جاتے تھے۔

*

کوٹ لکھپت کے گرد سخت پہرہ تھا رائے خاندان کی سیاسی اہمیت اور سکھوں کی ان سے دشمنی کی وجہ سے گھوڑ سوار دن رات ان کی حویلی اور کوٹ کے گرد چکر لگاتے رہتے تھے۔ ان کے خاندان نے مغلوں کی ملازمت میں سکھوں کے خلاف لڑائیوں میں سرگرم حصہ لیا تھا۔ لکھپت رائے کے چھوٹے بھائی جسپت رائے نواب زکریا خان کے وقت ایمن آباد کے ضلعدار تھے تو انہوں نے سکھوں کی شورش دبانے میں بہت نام پیدا کیا تھا اور سکھوں کے خلاف لڑتے ہوئے ایک معرکہ میں مارے گئے تھے۔ اسی لیے اقتدار اور اختیار سے الگ ہو جانے کے باوجود انہوں نے اپنی حفاظتی فوج بھرتی کر رکھی تھی۔

ایک شام ڈھلے پہریداروں نے کوٹ سے کچھ فاصلہ پر چار گھوڑ سواروں کو روکا گھوڑ سوار مسلح تھے۔ پہریداروں نے انہیں ہتھیار حوالے کر دینے کا حکم دیا تو گھوڑ سواروں نے فوراً تعمیل کی مگر تلاشی دینے سے انکار کر دیا۔ محافظوں نے انہیں اپنے کماندار کے سامنے پیش کر دیا۔

"آپ ہمیں رائے صاحب کے پاس بھیج دیں، وہ مجھے جانتے ہیں"۔ ایک زیر حراست سوار نے کماندار سے کہا۔

"حویلی کا دروازہ بند ہو چکا ہے، ہمیں رات کے وقت دروازہ کھولنے کی اجازت نہیں"۔ کماندار نے جواب دیا۔

"ہم بہت اہم کام سے آئے ہیں، رائے صاحب سے ہمارا فوری ملنا بہت ضروری ہے"۔ سوار نے جواب دیا۔

"ہم رائے صاحب کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے"۔ کماندار اپنے فیصلہ پر قائم رہا۔

"آپ ان تک ہمارا ایک پیغام پہنچا سکتے ہیں؟" سوار نے پوچھا۔

"کوشش کرتے ہیں، ضروری نہیں کامیاب ہو"۔ کماندار نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔

"آپ رائے صاحب سے کہیں لاہور سے دیگ میں ابلا ہوا آلو آیا ہے"۔ اسی سوار نے پیغام سنایا۔

کماندار نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا اور ایک ماتحت کو بلا کر پیغام سمجھایا جس نے واپس آ کر بتایا کہ رائے صاحب نے حکم دیا ہے کہ آلو ہمیں بھیج دیں اور اس کے ساتھیوں کو آرام اور احترام سے مہمان خانہ پہنچا دیں۔

بوڑھے لکھپت رائے نے حویلی کے دروازے پر آ کر بھوانی داس کا استقبال کیا۔ حاکم سے وفاداری اور مذہب کی قدر مشترک کی وجہ سے لکھپت رائے بھوانی داس کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ گو وہ خود اقتدار اور اقتدار کی سیاست سے الگ ہو چکے تھے لیکن ان کی ہمیشہ خواہش اور کوشش ہوتی تھی کہ ان کے ہم مذہب اقتدار کے ایوانوں میں جمے رہیں۔ بھوانی داس سے انہیں شاہجہان آباد، قندھار اور لاہور کی سیاست کے بارے میں تازہ ترین معلومات بھی ملتی رہتی تھیں۔ لکھپت رائے پنجاب کے

حالات کے بارے میں دل سے فکرمند رہتے تھے۔ مسلمان حکمرانوں کے درباروں سے وابستگی اور ان کے حسن سلوک نے انہیں شاہ پرست بنا دیا تھا۔ بھوانی داس کی وفاداری صرف آدینہ بیگ سے تھی۔ وہ مسلمانوں کے خلاف دل میں بغض رکھتا تھا۔ اس کے باوجود وہ ایک مسلمان ضلعدار کو حاکم پنجاب دیکھنا چاہتا تھا تاکہ اس کی وجہ سے وہ اس مقام تک پہنچ سکے۔ جس پر اس نے کبھی لکھپت رائے کو دیکھا تھا۔ بھوانی میں نہ تو رائے جیسی فراست تھی اور نہ ہی ان جیسی وسعتِ نظر وہ حالات و واقعات کو ان کے ظاہری رنگ کے حوالے سے دیکھتا تھا مگر ان کا تجزیہ کر کے مستقبل کی تصویر نہیں بنا سکتا تھا۔ دربار لاہور کے ترک اور مغل سرداروں اور مسلمان امراء سے جب کوئی اہم معاملہ پیش آتا تو وہ لکھپت رائے سے رہنمائی حاصل کیا کرتا تھا۔ زیرِ حراست بھکاری خاں نے تجویز بھیجی تھی کہ پنجاب کے امراء جاگیرداروں اور بااثر خاندانوں کی طرف سے مغل بادشاہ کو مغلانی بیگم کے خلاف ایک مشترکہ یادداشت بھیجی جائے۔ بھوانی یہ تجویز آدینہ بیگ کو بھیجنے سے پہلے رائے صاحب سے مشورہ کرنے آیا تھا۔

''پنجاب کے حوالے سے ابدالی بہت اہم ہے۔ یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ مغلانی بیگم کا کہاں تک ساتھ دے سکتا ہے''۔ لکھپت رائے نے بھکاری خاں کی تجویز کے بارے میں سن کر رائے دی۔

''ابدالی میر منو کی بیوہ ہونے کی بناء پر بیگم کی حمایت کرتا ہے، اس نے بیگم کے نام کی سند حکومت بھیج دی ہے''۔ بھوانی داس نے بتایا۔

''احمد شاہ ابدالی کی مملکت کی سرحدیں اٹک تک آ گئی ہیں۔ ملتان اس کے قبضہ میں ہے، سیالکوٹ، پسرور اور گجرات میں اس کا نمائندہ موجود ہے۔ پنجاب کے مسلمان اسے اپنا نجات دہندہ سمجھنے لگے ہیں۔ مغل بادشاہوں کی ناکامیوں اور غفلت کی وجہ سے وہ ایسا سمجھنے میں حق بجانب ہیں۔ لاہور اور دربار لاہور کے معاملات میں ابدالی کی دلچسپی کو ان حوالوں سے بھی دیکھنا چاہئے''۔ لکھپت رائے نے کہا۔

''مگر جب تک پنجاب کے مغل اور ترک سردار اور امراء اس کا ساتھ نہیں دیتے۔ ابدالی ایک عورت کے ذریعے سکھوں کی شورش دبا کر مسلمانوں کی حفاظت نہیں کر سکتا اور جب تک مغلانی بیگم صوبیدار ہے۔ مغل اور ترک سردار اور امراء ابدالی کی حمایت نہیں کریں گے''۔ بھوانی داس نے رائے دی۔

''ہم نے تو سنا ہے کہ پنجابی فوج لاہور کے علماء اور عام مسلمان مغلانی بیگم کے حامی ہیں''۔ لکھپت رائے نے کہا۔

''حضور نے درست سنا ہے مگر اس کی وجہ مغل امراء کے باہمی جھگڑے ہیں''۔

''اس کے علاوہ بھی کچھ وجوہات ہیں پنجاب کے عام مسلمان کا آج بھی کوئی پرسان حال نہیں۔ مغل حکمرانوں نے ہمیشہ ترک اور مغل امراء اور فوج کی مدد سے حکومت کی ہے، انہی کی سرپرستی کی ہے۔ مسلمانوں میں جاگیریں، دولت اور اقتدار صرف ترکوں کے پاس ہے۔ عام مسلمان سمجھتے ہیں کہ وہ مسلمان رعایا اور مملکت کے مفادات سے بے نیاز ہو کر اقتدار کی جنگ لڑ رہے ہیں جس سے مسلمانوں کی حکومت کمزور ہوئی ہے۔ انہیں آپس میں لڑتے اور عیاشی کرتے دیکھ کر علماء ان کے خلاف ہو گئے ہیں۔ اب وہ آسانی سے ان پر اعتماد نہیں کریں گے۔ عام مسلمان اور علماء ان امراء اور سرداروں کے اخلاقی زوال سے بھی نفرت کرنے لگے ہیں''۔ لکھپت رائے نے مقامی مسلمانوں اور ترکوں میں اختلاف کی وجوہ بیان کرتے ہوئے کہا۔

''مغلانی بیگم کے کردار کے بارے میں بھی تو بہت

کچھ سنا جا رہا ہے۔ غازی بیگم خاں بخشی سے ان کے تعلقات کی کہانیاں سب امراء بیان کرنے لگے ہیں"۔ بھوانی داس نے مغل اور ترک امراء کے کردار کے ذکر کے جواب میں کہا۔

"عام لوگ ان امراء کی بنائی کہانیوں پر یقین نہیں کرتے کیونکہ وہ ان کے اپنے کردار سے واقف ہیں۔ وہ میر منو اور مغلانی بیگم کے خاندانوں سے واقف ہیں۔ مغلانی بیگم لاہور میں پیدا ہوئی، پلی اور حکومت تک پہنچی ہے۔ جن لوگوں نے پہلے اس کی کوئی کہانی نہیں سنی تھی اب اچانک کیسے مان لیں وہ غازی بیگ خاں کے کردار سے بھی واقف ہیں۔ لوگ جانتے ہیں کہ امراء مغلانی بیگم کو بدنام کرنے کے لئے اس کے محل اور قلعہ کے ملازمین کو رشوت دے کر استعمال کر رہے ہیں۔ آپ نے خود بتایا تھا کہ بھکاری خاں نے طہماس خاں کو ملازم رکھ لیا ہے"۔ لکھپت رائے نے دلیل دی۔

"یہ درست ہے کہ پنجابی فوج اور اہل لاہور مغل اور ترک امراء اور سرداروں کی بات پر یقین نہیں کرتے لیکن سارے پنجاب کے امراء اور جاگیردار مل جائیں تو ان کی رائے بدل سکتی ہے"۔ بھوانی داس نے کہا۔

"مغل سردار اور امراء نواب میر منو کے خاندان کے وقار کے تحفظ کے نام پر خود ان کے خاندانی وقار کو داغدار کر رہے ہیں۔ لازم ہے کوئی ایسا فرد عمادالملک سے بات کرے جو اقتدار کی لڑائی میں فریق نہ ہو۔ یہ کام لاہور میں رہنے والے اس کے رشتہ دار بہتر طور پر کر سکتے ہیں"۔ لکھپت رائے نے مشورہ دیا۔

"ایسا فرد میسر آنا ممکن نہیں"۔ بھوانی داس نے جواب دیا۔

"شاہجہان آباد کے علماء نے مغل بادشاہ کے خلاف وزیراعظم کا اسی لئے ساتھ دیا کہ وہ مسلم حکومت کے زوال پر فکر مند ہیں۔ احمد شاہ کو تخت سے اتار کر عالمگیر ثانی کو بادشاہ بنانے میں بنیادی کردار علماء کا ہے۔ اگر وہ فتویٰ نہ دیتے تو وزیراعظم اور امراء مل کر بھی بادشاہ نہیں بدل سکتے تھے۔ آپ علماء کی قوت کا غلط اندازہ کر رہے ہیں"۔ لکھپت رائے نے کہا۔

"امرائے لاہور عالمگیر ثانی تک یہ عرض داشت پہنچانا چاہتے ہیں تاکہ وہ احمد شاہ کی غلطی کا ازالہ کر سکے۔ علماء ان کا ساتھ نہیں دیں گے... وہ انہیں بھی مجرم سمجھتے ہیں"۔ بھوانی داس نے کہا۔

"بادشاہ سے زیادہ اہم عمادالملک ہے جس نے ثابت کیا ہے کہ اسے سلطنت کی زیادہ فکر ہے۔ جب تک وہ نہیں چاہے گا، امرائے پنجاب مغلانی بیگم کے خلاف کامیاب نہیں ہو سکتے اور عمادالملک جانتا ہے کہ خاوند اور بیٹے کی وفات کے باوجود بیگم نے حالات کو سنبھال لیا ہے"۔

"اس میں ایمن آباد کے ضلعدار خواجہ مرزا خاں اور ان کے بھائی بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کا ایک بھائی تازہ دم ازبک سپاہ اپنے ساتھ لایا ہے اور سکھوں کے خلاف کارروائیوں کی قیادت کر رہا ہے۔ راوی سے شمال میں انہوں نے امن و امان بحال کر دیا ہے۔ ان کا دوسرا بھائی خواجہ محمد سعید خان اپنے دستہ کے ساتھ لاہور میں مقیم ہے۔ بھکاری خان اسی کی حراست میں ہے"۔ بھوانی داس نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے سب سے طاقتور خواجہ مرزا خان ہے اور وہ مغلانی بیگم کا وفادار ہے"۔

"یہ درست ہے"۔ بھوانی داس نے اعتراف کیا۔

"آپ کو اور بھکاری خاں کو اس حقیقت کو ذہن میں رکھنا چاہیے"۔ بوڑھے رائے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

بھوانی داس نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ رات کی چاندنی میں رائے کی آنکھوں کی چمک اس کے

دماغ میں اتر گئی۔

بھوانی داس اور لکھپت رائے کے تعلقات اس وقت سے تھے۔ جب لکھپت رائے پنجاب کے صوبیدار نواب زکریا خاں کے دیوان ہوئے تھے اور بھوانی داس حاکم جالندھر آدینہ بیگ کا منشی تھا۔ آدینہ بیگ نے کئی سال سے مالیہ ادا نہیں کیا تھا۔ دیوان لکھپت رائے نے اسے لاہور طلب کیا اور فوری طور پر مالیہ ادا کرنے کا حکم دیا۔ آدینہ بیگ نے معذوری ظاہر کی تو دیوان نے اسے قلعہ کی جیل میں بند کر دیا۔ آدینہ بیگ کو جیل بھجوانے کے بعد دیوان لکھپت رائے نے بھوانی داس کو حسابات پیش کرنے کا حکم دیا تو اس نے انکار کر دیا۔

"میں آدینہ بیگ کا ملازم ہوں، ان کی اجازت کے بغیر حسابات پیش نہیں کر سکتا"۔ لکھپت رائے نے اسے ڈرایا دھمکایا مگر بھوانی داس اپنے انکار پر قائم رہا۔ لکھپت رائے کے حکم سے بھوانی داس کو پانی سے بھری دیگ میں کھڑا کر کے اس کے نیچے آگ جلا دی گئی۔ پانی گرم ہوتا رہا بھوانی داس دیگ میں خاموش کھڑا رہا۔ اس سے بار بار کہا گیا کہ وہ حسابات دکھانے پر راضی ہو جائے لیکن وہ اپنے مؤقف پر قائم رہا کہ اپنے حاکم کی عدم موجودگی میں وہ حسابات نہیں دکھائے گا۔ پانی ابلنے لگا، بھوانی داس کے چہرے سے شدید درد اور تکلیف ظاہر ہو رہی تھی مگر وہ سختی سے ہونٹ سی کر دیگ میں خاموش کھڑا تھا۔ اپنے حاکم سے اس وفاداری سے خوش ہو کر دیوان نے اسے دیگ سے نکلوا لیا اور آدینہ بیگ کو مالیہ کی پہلی قسط جلد ادا کر دینے کے وعدہ پر رہا کر دیا۔ آدینہ بیگ بھوانی داس کو لاہور میں چھوڑ گیا تا کہ وہ اسے دربار لاہور کے معاملات سے باخبر رکھے اور اس کے مفادات کا تحفظ کر سکے۔ بھوانی داس نے آدینہ بیگ کی ملازمت کے ساتھ ساہوکارہ بھی شروع کر دیا۔ فارسی دانی اور روپیہ کے زور پر اس کے لئے سفارت کاری اور مخبری آسان ہو گئی۔

دیوان لکھپت رائے سے یہ تعلقات وقت کے ساتھ خاندانی روابط میں تبدیل ہو گئے تھے۔

دیوان لکھپت رائے پنجاب کے امیر الامراء بنے اور پھر احمد شاہ ابدالی نے شاہنواز خاں کے فرار کے بعد انہیں پنجاب کا صوبیدار مقرر کر دیا تھا۔ تینوں اہم ترین عہدوں پر فائز رہنے کی وجہ سے پنجاب کے حالات پر ان کی بہت گہری نظر تھی۔ پنجاب کے بیشتر امراء جاگیرداروں اور رئیسوں سے ان کے ذاتی تعلقات تھے اس لئے بھوانی داس مدد اور مشورہ کے لئے ان کے ہاں حاضری دیا کرتے تھے اور ان کے مشوروں سے فائدہ اٹھایا کرتے تھے۔

*

مغل شہنشاہ احمد شاہ پر بداعمالیوں اور غیر حاکمانہ حرکتوں کا الزام لگا تو علماء کے فتویٰ اور امراء کے فیصلہ کے بعد اس کی آنکھوں میں سلائیاں پھیر کر اسے سلیم گڑھ کے قید خانہ میں زندگی کے بچے کھچے دن گننے کے لئے بند کر دیا گیا تھا اور جہاندار شاہ کے بیٹے کو عالمگیر ثانی کے نام سے تخت پر بٹھا دیا گیا تھا۔ شاہنشاہ کی تبدیلی میں اہم کردار ادا کرنے والے امراء کا امور سلطنت میں اثر و رسوخ بہت بڑھ گیا تھا۔ وزیراعظم اور شہنشاہ امراء کی رائے کو بہت اہمیت دینے لگے تھے اسی لئے بھکاری خاں اور اس کے ساتھیوں نے ان امراء کے ذریعے شہنشاہ پر اثر انداز ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ انہوں نے پنجاب کے امراء اور جاگیرداروں کی طرف سے ایک طویل عرضداشت شاہجہان آباد ارسال کی جس میں مغلانی بیگم کی حکومت اور ذات پر کئی قسم کے الزامات لگائے گئے تھے جس روز پنجاب کے امراء کی عرضداشت شاہجہان آباد کے امراء کو موصول ہوئی اس سے چند روز بعد آدینہ بیگ کا خصوصی ایلچی وزیراعظم کے نام خط لے کر شاہجہان آباد پہنچ گیا۔ آدینہ بیگ نے نہایت ہوشیاری سے وزیراعظم کو مغلانی

م کی انتظامی خامیوں اور کوتاہیوں کے بارے میں بہت
چھ لکھا تھا مگر اس کی ذات کے بارے کچھ نہیں کہا تھا، وہ
جانتا تھا کہ مغلانی بیگم عمادالملک کی ممانی اور ساس ہے اور
وہ اس کی ذات کے بارے میں کوئی بات برداشت نہیں
کرے گا۔ آدینہ بیگ نے صوبہ میں سکھوں کی شورش کی
تفصیلات بیان کر کے درخواست کی تھی کہ فوری طور پر ان
خرابیوں کو دور کیا جائے تاکہ لاہور اور پنجاب سکھوں کے
قبضہ میں جانے سے بچائے جا سکیں۔ بھکاری خاں کی
گرفتاری اور وزیراعظم کی ساس کے خلاف بغاوت اور
سازشوں کی وجہ سے آدینہ بیگ سمجھتا تھا کہ اگر وزیراعظم
پنجاب کو مضبوط ہاتھوں میں دینے کا کوئی فیصلہ کرتے ہیں
تو لازماً نظر انتخاب اسی پر ہی پڑے گی جس نے دوآبہ
جالندھر کو پنجاب کا مثالی علاقہ بنا دیا تھا۔ اپنے الگ الگ
مقاصد کے باوجود سب فریقوں کا نشانہ مغلانی بیگم تھیں
اور سب نے مغل سلطنت کے تحفظ اور مسلمانان پنجاب
سے ہمدردی کے نام پر مغلانی بیگم کو ہی ان حالات کا ذمہ
دار قرار دیا تھا۔

*

سید صابر شاہ کے مزار پر قرآن خوانی کی مجلس میں
حاضری بہت زیادہ تھی لیکن بابا خان ولی محفل میں شریک
نہیں تھا۔ محفل کے خاتمہ پر دعا ہوئی اور غرباء میں تبرک
تقسیم کیا گیا۔ میر مومن خاں بابا خان ولی کی غیر حاضری پر
خاصے پریشان دکھائی دیتے تھے۔ وہ آج باباجی کے حضور
حاضری دینا چاہتے تھے اور اپنی طرف سے نذرانہ پیش
کرنے آئے تھے۔ باباجی کی صحت اور عدم شرکت کے
بارے میں کوئی تسلی بخش جواب نہ ملنے پر انہوں نے
تحائف ان کے خادم خاص کے سپرد کیے۔ مزار پر حاضری
دی اور درگاہ کے احاطہ سے باہر نکل آئے۔ ان کے چاک و
چوبند حفاظتی دستہ کے سواروں نے انہیں چاروں طرف
سے گھیر لیا اور جلوس کی صورت موچی دروازہ کی طرف چل
دیئے کسی نے نائب صوبیدار کے محافظوں کی اس خلاف
معمول ہوشیاری اور احتیاط کا نوٹس نہیں لیا مگر خواص نے
بابا خان ولی کی محفل میں عدم شرکت سے زیادہ اسی انداز کو
محسوس کیا تھا۔ میر مومن خاں اپنی ذاتی حفاظت کا بھی
زیادہ خیال نہیں کرتے تھے وہ ایک شریف حاکم کی حیثیت
سے جانے جاتے تھے اور اقتدار کی جنگ اور سازشوں
سے اکثر الگ رہتے تھے امراء اور سرداروں میں ان کا کوئی
ذاتی دشمن نہیں تھا۔ بھکاری خان انہیں اپنا مخالف سمجھتا
تھا۔ ان کے نائب صوبیدار کے منصب پر فائز کیے جانے
پر سب سے زیادہ اسی نے مخالفت کی تھی مگر مومن خاں نے
ثابت کر دیا تھا کہ وہ جیسا شریف انسان ہے ویسا ہی
شریف حاکم بھی ہے۔ مغلانی بیگم کے شدید مخالف بھی
اس کی عزت اور احترام کرتے تھے۔

شاہی مسجد میں عشاء کی نماز کے بعد امام بخاری نے
بڑے سوز سے سلطنت کی سلامتی اور تحفظ کی دعا کی تو
نمازیوں کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ پنجاب اور ملک کے
مختلف حصوں سے موصول ہونے والی شورشوں کی خبروں
اور شاہجہان آباد اور لاہور کے امراء کی سازشوں سے
مسلمان بہت پریشان تھے۔ وہ سب کچھ دیکھ اور سن رہے
تھے مگر کر کچھ نہیں سکتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو بالکل بے بس
محسوس کرتے تھے اور صرف دعا کر سکتے تھے اور دن رات
کسی نجات دہندہ کے لئے دعائیں کیا کرتے تھے۔ شہر
اور نواح شہر میں امن تھا، ضرورت کی ہر چیز وافر مل رہی
تھی، اہل لاہور کو کوئی تکلیف نہیں تھی مگر مجموعی حالات
سب کے لئے پریشان کن تھے۔ دعا کے بعد امام بخاری
بیٹھ کر وظیفہ پڑھتے رہے اور نمازی ایک ایک دو دو کر کے
جانے لگے۔ علماء کا ایک گروہ امام بخاری کے فارغ ہونے
کے انتظار میں کافی دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ امام وظیفہ
سے فارغ ہوئے تو وہ سب قلعہ کی طرف چل دیئے جہاں
دروازہ پر قلعہ دار نادر بیگ نے ان کا استقبال کیا۔

موتی مسجد کے سامنے چاندنیاں بچھی تھیں، قالینوں کے فرش پر قطار در قطار چوکیوں پر قرآن رکھے تھے، فرشی شمعدان جل رہے تھے۔ قرآن خوانی کی یہ محفل مغلانی بیگم کے بیٹے میر امین الدین کے لئے منعقد کی گئی تھی۔ محفل میں شہر اور بیرون شہر سے علماء کرام تشریف لائے تھے۔ محفل امام بخاری کے خطاب سے شروع ہوئی۔ شہر کے علماء درگاہوں کے سربراہ اور دینی مدارس کے منتظم سب ہی محفل میں شریک تھے۔ امام بخاری تھوڑی دیر بیٹھ کر رخصت ہونے چلے تو نادر بیگ نے آگے بڑھ کر انہیں جوتے پہنائے اور عمال حکومت کے جلو میں قلعہ کے دروازہ تک ان کے ساتھ گئے۔ پہریدار امام بخاری کو دیکھتے ہی سر جھکا کر کھڑے ہو گئے اور اس وقت تک کھڑے رہے جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

شب زوال کی منزل میں داخل ہو چکی تھی، موتی مسجد کے سامنے قرآن خوانی کی محفل جاری تھی۔ نادر بیگ اول شب کے پہریداروں کو چیک کرتا ہوا ڈیوڑھی تک پہنچا تو آخر شب کا دستہ ڈیوٹی سنبھال چکا تھا۔ وہ وہیں بیٹھ گیا اور دستہ کے کمانڈر سے حفاظتی انتظامات کے بارے میں تبادلہ خیال کرنے لگا۔ ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ قلعہ دار ایسے معاملات پر ڈیوڑھی میں بیٹھ کر رات کے وقت تبادلہ خیال کرے۔ وہ قلعہ کے سارے حفاظتی انتظامات ذمہ دار تھا۔ اس لئے کسی نے اس کے خلاف معمولی تبادلہ خیالات کو وقت گزارنے کا بہانہ نہیں سمجھا۔ وہ پہریداروں کے اسلحہ پر بات کر رہے تھے کہ ایک سپاہی نے اطلاع دی کہ چند علماء کرام آئے ہیں اور قرآن خوانی کی مجلس میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔ کمانڈر نے قلعہ دار کی طرف دیکھا تو اس نے حکم دیا۔ ''انہیں ہمارے روبرو پیش کریں''۔ سپاہی نے حکم کی سختی سے محسوس کیا کہ علماء کرام کو روک کر انہوں نے اچھا ہی کیا ہے۔

''اتنی رات بیتے آپ کا شریک محفل ہونا لازم نہیں''۔ نادر بیگ نے چار سرخ پوش علماء کو سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے روکھے انداز میں کہا۔

''ایک کم سن کے لئے قرآن خوانی بھی لازم نہیں، تم قرآن خوانی بند کرا دو ہم واپس چلے جاتے ہیں''۔ ایک سرخ پوش نے تحکمانہ انداز میں جواب دیا۔ اس کے سر کے طویل بال داڑھی کے بالوں سے دست و گریباں ہو رہے تھے اور سارا جسم طویل سرخ جبنہ میں چھپا ہوا تھا۔ ہاتھ میں موٹے سرخ منکوں کی تسبیح زمین کو چھو رہی تھی۔ تسبیح کا دانہ دانہ گراتے ہوئے بات کرنے کو جب وہ آنکھیں اوپر اٹھاتا تو محسوس ہوتا دنیاوی حاکمیت کا مذاق اڑا رہا ہے۔

''محفل تو تھوڑی دیر میں ختم ہونے والی ہے''۔ نادر بیگ نرم پڑ گیا۔

''باپ اور پانچ بھائی دنیاوی حاکم کے لئے لڑتے ہوئے جان ہار گئے۔ چھٹا بھائی حاکم کائنات کے کلام کی تلاوت میں مخل ہو رہا ہے''۔ سرخ آنکھوں والے سرخ پوش نے کہا۔

''چلیں میں خود آپ کو وہاں پہنچا دیتا ہوں''۔ نادر بیگ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

چاروں درویش اس کے ساتھ ہو لئے دیوان عام کے سامنے پہنچ کر اس نے اپنے محافظوں کو رخصت کر دیا اور سرخ پوشوں کے ہمراہ مکاتب خانہ کا چکر کاٹ کر مسجد کی طرف جانے کی بجائے چاہ خاص کی طرف مڑ گیا۔ تھوڑا آگے جا کر اس نے تین درویشوں کو مجلس کی طرف بھیج دیا اور چوتھے کے ساتھ ہاتھی پور کی سیڑھیاں اتر کر شیش محل کی منقش دیوار کی طرف مڑ گیا۔ آہستہ قدموں دیوار کے سایہ سایہ چلتے ہوئے ایک کھڑکی کے سامنے پہنچ کر اس نے آہستہ سے دستک دی، کسی نے اندر سے چابی گھمائی تو کھڑکی میں چھوٹا سا سوراخ نمودار ہو گیا۔

''کون؟'' سوراخ میں سے آواز آئی۔'' ساتواں جال

نثار"۔ نادر بیگ نے جواب دیا۔ اس نے کھڑکی کا پٹ تھوڑا سا کھول کر موم بتی اوپر اٹھا کر دیکھا اور دروازہ کھول دیا۔

مغلانی بیگم نشست میں داخل ہوئیں تو نادر بیگ اور سرخ پوش نے جواب تک کھڑے تھے، سر جھکا دیئے، نگاہیں اپنے اپنے پاؤں پر مرکوز کرلیں۔ بیگم آہستہ آہستہ چلتی ہوئی فرشی نشست تک گئی اور گاؤ تکیہ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر شب کے سفر کی دھول کا کوئی نشان نہیں تھا۔

"تشریف رکھیں"۔ بیگم کی آواز میں مردانہ اعتماد تھا۔

نادر بیگ اور سرخ پوش وہیں بیٹھ گئے، کسی نے آنکھ اٹھا کر مغلانی بیگم کی طرف نہیں دیکھا۔

"ہم نے سنا ہے بابا خان ولی آج قرآن خوانی کی محفل سے غیر حاضر تھے؟" بیگم نے پوچھا۔

"فرض کی حاضری مقدم تھی"۔ سرخ پوش نے جواب دیا۔

"آپ میر مومن خاں کے نذرانہ سے محروم رہے"۔

"میر منو مغفور کے جاں نثار تو اپنی زندگیاں ان کے وقار پر نذرانہ پیش کر دیا کرتے ہیں، یہ تو ایک حاکم کا نذرانہ تھا"۔ اس نے جواب دیا۔

"میر منو مغفور کی روح آپ کی جاں نثاری پر شاداں ہے"۔ مغلانی بیگم کی آواز کانپ گئی لیکن جلد ہی اس نے آواز پر گرفت مضبوط کرلی۔ "ہم جاننا چاہتے ہیں کہ آپ کے دوست شاہجہان آباد سے ہمارے لئے کیا خبر لائے ہیں؟"

"بندہ اگر کوئی اچھی خبر نہ دے سکے تو اس کی گستاخی معاف کر دی جائے"۔ سرخ پوش نے ہاتھ باندھ کر درخواست کی۔

"ہم بری خبریں سننے کے عادی ہو چکے ہیں، آپ بلاخوف بیان کریں"۔ بیگم نے حکم دیا۔

"مغل دربار سے میر مومن خاں کے لئے پنجاب کی صوبیداری کی سند جاری ہو چکی ہے"۔ سرخ پوش کی آواز بھی لرز گئی۔

"ہم اس خبر کی صداقت پر کہاں تک اعتماد کر سکتے ہیں؟" بیگم نے پوچھا۔

"کاش! اس خبر میں کچھ بھی صداقت نہ ہوتی، مجبوراً عرض کرنا پڑ رہا ہے کہ اس خادم کے ذرائع نے کبھی دھوکہ نہیں دیا"۔

"ہم نے میر منو مغفور کے اعتماد کو دیکھتے ہوئے میر مومن خاں کو نائب صوبیدار بنایا تھا۔ اسی تقرر سے نواب بھکاری خان آمادہ بغاوت ہوئے۔ ہمیں میر مومن خاں سے دغا کی امید نہ تھی مگر ان کی رگوں میں بھی ترک خون ہے، وہ اپنے خون سے دغا نہیں کر سکے۔ ہمیں یہ سن کر زیادہ افسوس نہیں ہوا"۔ بیگم کے لہجہ میں تلخی آ گئی۔

"یہ سند نواب بھکاری خان کے تعاون سے جاری ہوئی ہے، اس کے حامی امرائے پنجاب نے مل کر دربار کے امراء کے نام پر عرضداشت بھیجی تھی، اس کے بعد مغل شہنشاہ کو یہ فیصلہ کرنا پڑا"۔ سرخ پوش نے بتایا۔

"ہمیں مغل نوابوں کی سازشوں اور مغل شہنشاہ کے فیصلہ کا افسوس نہیں صرف دکھ ہے کہ اس میں ہمارے بیٹے کا نام بھی آئے گا"۔

"وزیراعظم عمادالملک اس معاملے میں بے قصور اور مجبور سمجھے جائیں"۔

"ہم ان کی مجبوریوں کو سمجھتے ہیں اور ایک ماں کا دل رکھتے ہیں۔ ہمیں اس سے کوئی شکوہ نہیں"۔

"سند حکمرانی کے ساتھ ایک دستہ دو چار روز تک لاہور پہنچنے والا ہے۔ میر مومن خاں کو اس کی خبر مل چکی ہے"۔ سرخ پوش نے بتایا۔

''ہم سمجھتے ہیں میر منو کے جاں نثار اس کے وقار کا تحفظ کریں گے۔ شہنشاہ کے ایلچیوں کے پہنچنے تک اس بارے میں کسی کو خبر نہ ہونا چاہئے میر مومن خاں کو شبہ تک نہ ہو کہ ہم کچھ جانتے ہیں''۔ بیگم نے ہدایت کی۔

''میر منو مغفور کے جاں نثار اس اعتماد پر بھی پورے اتریں گے''۔ نادر بیگ اور سرخ پوش نے کھڑے ہو کر اپنے دائیں ہاتھ اپنے اپنے سینوں پر رکھ دیئے۔

''ہم چاہتے ہیں شاہجہان آباد کی سند لاہور پہنچنے سے پہلے ہمیں خواجہ مرزا خان اور ان کے بھائیوں کے ارادوں اور سرگرمیوں کے بارے میں مکمل علم ہو۔ ہم امید کرتے ہیں کہ بابا خان ولی اس فرض سے غافل نہیں ہوں گے''۔ بیگم نے کہا۔

''آپ کا یہ غلام پہلے ہی تمام مخبروں سے رابطہ کر چکا ہے۔ دو روز بعد سب تفصیلات پیش کرنے کی سعادت حاصل کر سکے گا''۔ سرخ پوش نے عرض کیا۔

''بھوانی داس سے رابطہ کس مرحلہ میں ہے؟''

''حضور کا یہ غلام آدینہ بیگ کا نذرانہ وصول کر چکا ہے''۔

''مومن خاں کے لئے سند جاری ہو جانے پر آدینہ بیگ اس کے خلاف کام کر کے خوشی محسوس کرے گا۔ آپ بھوانی داس کو شرف باریابی عطا کر کے احمد شاہ ابدالی سے اس کا تعارف کرانے کا وعدہ کر لیں تو مناسب ہوگا''۔ بیگم نے کچھ سوچ کر کہا۔

''اس حکم کی تعمیل کل رات کے اندھیرے میں ہو جائے گی''۔ سرخ پوش نے ایک بار پھر سر تسلیم خم کرتے ہوئے جواب دیا۔

''کل سے قلعہ پر ڈیوٹی دینے والے دستوں میں کریم بخش کے سپاہیوں کی تعداد بڑھا دی جائے اور ان کی فوج کا کیمپ قلعہ کی فصیل سے قریب منتقل کر دیا جائے''۔ بیگم نے نادر بیگم کو حکم دیا۔

''حضور کے حکم پر کل کا سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے عمل مکمل ہو جائے گا''۔ نادر بیگ نے بھی ایک بار پھر سر تسلیم خم کر دیا۔

''ہم دو روز تک سب معلومات کے منتظر ہیں''۔ بیگم نے حکم دیا۔

یہ مشاورت کے خاتمہ کا اشارہ تھا نادر بیگ اور سرخ پوش فرشی سلام کر کے الٹے قدموں چلتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔

مغلانی بیگم نشست سے اٹھی اور کمرہ میں ٹہلنے لگی۔ اس نے محسوس کیا جیسے ریشمی قالینوں کا فرش اس کے پاؤں کاٹ رہا ہے۔ وہ رکی جھک کر فرش کا جائزہ لیا مگر وہاں کنکر تو کیا کوئی ذرہ خاک تک نہ تھا، وہ کھڑکی کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی تو راوی کے اس پار پوری رات کا چاند فضا کی پہنائیوں میں چلتے چلتے اچانک رک گیا۔ جب تک وہ کھڑی رہی چاند کے قدموں کی زنجیریں پھیلتی گئیں۔ اس نے مسکرا کر چاند کو دیکھا اور کھڑکی بند کر کے واپس نشست پر آ کر بیٹھ گئی۔ کمرے کی چھت میں جڑے چو وقت پہلو اور ہشت پہلو آئینے پھیلنا شروع ہو گئے۔ ہر آئینے میں ایک الگ شبیہ پیوست تھی۔ ان شبیہوں کو مختلف انداز میں جوڑ جوڑ کر وہ ماضی کے مختلف واقعات پر غور کرنے لگی۔

جب موتی مسجد سے صبح کی اذان بلند ہوئی تو اسے یاد آیا کہ قرآن خوانی کی محفل ختم ہونے والی ہے۔ اس نے تالی بجا کر گل بنفشہ کو بلایا اور میاں خوش فہم کے لئے ہدایت کی کہ وہ شرکاء محفل کے حضور اپنی نگرانی میں نذرانے پیش کریں۔ وہ ایک بار پھر کھڑکی کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور آنکھوں سے اس راہ کو ناپنے لگی جس سے اس کے اکلوتے بیٹے کا جنازہ گزرا تھا۔ اسے محسوس ہوا یہ راہ بہت طویل ہو گئی ہے اور وہ ننگے پاؤں اکیلی اس پر چلی جا رہی ہے۔

*

قلعہ کی فصیل کے سامنے فوج صفیں باندھے کھڑی

تھی۔ پیدل، گھوڑ سوار، بندوقچی، توپ خانہ، بخشی غازی بیگ خان معائنہ کرتے ہوئے آخری صف تک پہنچ کر رک گئے۔ ''آپ کو کوئی شکوہ کوئی شکایت ہو تو بتائیں تاکہ ہم دور کر سکیں''۔ انہوں نے متعدد سپاہیوں سے پوچھا۔

''مغلانی بیگم کے اقبال کے سایہ میں کوئی تکلیف ہے نہ شکایت''۔ انہوں نے جواب دیا غازی بیگ خان آگے بڑھ گئے۔ معائنہ مکمل کر کے تمام دستوں کے کمانداروں کو جمع کیا اور خوشخبری سنائی کہ وہ فوج کی اعلیٰ تربیت اور نظم دیکھ کر بہت خوش ہوئے ہیں اور بیگم عالیہ کے حضور سفارش کریں گے کہ ہر ایک کو پندرہ دن کی تنخواہ کے برابر انعام دیا جائے۔ بیگم عالیہ کی منظوری ملتے ہی انعام کی رقم تقسیم کر دی جائے گی۔ سپاہ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

''اپنی طرف سے ہم پرسوں دوپہر سب دستوں کے کمانداروں کو شالامار باغ میں دعوت دیں گے۔ ہر کماندار اپنے دو سپاہیوں کو دعوت میں ساتھ لائے گا''۔ انہوں نے اعلان کیا۔

کمانداروں نے سر جھکا کر دعوت پر خوشی کا اظہار کیا۔

''بیگم عالیہ نے کماندار کریم بخش کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں ''مرزا'' کا خطاب دیا ہے اور حکم دیا ہے کہ اس خطاب کی خوشی میں ان کی فوج کچھ عرصہ کے لئے قلعہ کے سامنے کے میدان میں مقیم رہے گی اور ان کی پسند کے دستے باری باری قلعہ کے اندر اور فصیل پر پہرہ دینے والے دستوں کے ساتھ ڈیوٹی دیں گے''۔

غازی بیگ خان کے اعلان پر دیسی دستوں کے کمانداروں نے کریم بخش کو مبارکباد دی۔

''بندہ اس اعزاز کے لئے حاکمہ کشور پنجاب کا دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہے''۔ کریم بخش نے تلوار پر ہاتھ رکھ کر شکریہ ادا کیا۔

اگلے روز غازی بیگ خاں نے شہر کی فصیل اور دروازوں پر پہرہ دینے والے دستوں کا معائنہ کیا اور ان کے لئے بھی پندرہ روز کی تنخواہ کے مساوی انعام کا اعلان کیا۔

مغلانی بیگم کا حکم تھا کہ لاہور اور نواح لاہور میں فوج کو دیسی ماہ کی پہلی تاریخ کو تنخواہ ادا کر دی جائے۔ گیارہ ماہ سے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ اس تاریخ کو تنخواہیں نہ ملی ہوں۔ عمدہ کارکردگی کے انعامات سے فوج اور بھی خوش ہو گئی۔

اگلے ہی روز تمام سپاہ میں نصف ماہ کی تنخواہ کے برابر انعام کی تقسیم شروع کر دی گئی۔

*

بارشوں کا موسم گزر چکا تھا لیکن راوی ابھی کناروں میں واپس نہیں آیا تھا کاتک کے آخری دنوں میں سورج برف پوش پہاڑوں کی طرف سے نگاہیں پھیر لیتا تو ملاح دریا کے مزاج کی تندی سے بے فکر ہو جاتے۔ چاول کی فصل لاہور کی منڈیوں میں آنا شروع ہو جاتی تھی۔ ایمن آباد کے پرگنہ میں خواجہ مرزا خاں کے نظم اور بارشوں کی فراوانی سے چاول کی فصل بہت اچھی ہوئی تھی۔ اس پار سے چاول لانے والے ملاح صبح سے شام گئے تک دریا میں رہتے تھے۔

کالو نے کشتی کنارے لگا کر اس کا رسا کھونٹی سے باندھا اور وہیں بیٹھ کر دن بھر کی کمائی گننے لگا۔ اس کے کپڑے بھیگے ہوئے تھے اور نوجوان بازوؤں میں تھکاوٹ سرایت کر رہی تھی مگر اچھا دن لگ جانے پر وہ خوش تھا۔ اس نے وزنی فلوس پٹکے کے پلو میں باندھ کر کمر پر ڈال لئے اور گنگناتا ہوا بستی کی طرف چل دیا۔ آج جب وہ اپنی بیوی کو اتنے سارے فلوس دے گا تو وہ کتنا خوش ہو گی۔ یہ خیال آتے ہی اس کی رفتار تیز ہو گئی۔

''یار کالو! کاتک جا رہا ہے، یہ راوی ابھی تک کناروں کے اندر نہیں آیا؟'' پیچھے آنے والے ملاح نے کہا تو اس کی سوچ کا دھاگا ٹوٹ گیا۔

''معلوم ہوتا ہے اوپر کہیں خواجہ خضر غسل فرما رہے ہیں''۔ کالو نے قہقہہ لگایا۔

''دونوں خواجوں کے آپس کے تعلقات ٹھیک معلوم نہیں دیتے، راوی ہموار ہوتا تو ایمن آباد والے خواجہ کو بہت آمدن دیتا''۔ دوسرے ملاح نے کہا۔

''خواجہ خضر اس سے ناراض کیوں ہووے گا، اس نے تو سکھوں کو خوب رگڑا ہے، خواجہ خضر سکھ تھوڑا ہووے''۔ کالو نے ایک اور قہقہہ لگایا۔

''تم کیسے کہو خواجہ خضر مسلمان ہووے ہے''۔ دوسرے ملاح نے پوچھا۔

''ہم نے تو آج تک سب خواجے مسلمان ہی دیکھے ہیں''۔ کالو نے جواب دیا۔

''ہاں یہ تو تم ٹھیک کہے ہو مگر راوی کو بھی مسلمانوں کا کچھ خیال کرنا چاہیے، میں تو تھک جاتا ہوں شام ہوتے ہوتے''۔

''تمہاری سوانی اتنے پیسے دیکھ کر تمہارا گھٹن چھن نہیں کرتی؟'' کالو نے پوچھا۔

''وہ بے چاری تو گھٹن چھن کرتی ہے پر یہ راوی سب کو تنگ کر رہا ہے''۔

جب وہ بستی میں داخل ہو رہے تھے تو شاہی مسجد سے عشاء کی اذان کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ بستی کی جھونپڑیوں میں ننھے ننھے دیے جل رہے تھے اور سرکنڈے کی چار دیواریوں کے اندر سے بچوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ باپ کی آواز پہچان کر کالو کے بچے باہر کی طرف دوڑے اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئے۔ اس نے فلوس کی گٹھڑی والا کپڑا بڑے بیٹے کو پکڑا دیا اور دونوں چھوٹے بچوں کو دونوں بازوؤں سے اٹھا لیا، بڑا بچہ گٹھڑی پکڑ کر ''اماں..... اماں!'' کہتا اندر کی طرف دوڑ پڑا۔

''دیکھو نہیں تمہارا بابا کیسے تھکا ہے تم ابھی سے سوار ہونے لگے ہو''۔ اس کی بیوی نے بناوٹی غصہ سے بچوں کو ڈانٹا۔

''آدھی تھکاوٹ تو ان کو اٹھانے سے دھل گئی بقیہ تم دھو دینا''۔ کالو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اک تو تمہارا بابا تم کو ٹھیک نہ ہونے دیوے''۔ اس کی بیوی نے جیسے بچوں سے شکایت کی۔

''تم کو بھی تو تمہارے بابا نے اتنا خراب کیا کہ اب تک ٹھیک نہ ہووے ہو''۔ کالو نے اسے تنگ کرنے کو کہا۔

''میری تو آدھی گزر گئی، تم ان کی فکر کرو''۔

''آدھی کہاں گزری ابھی تو تم نے دو سو سال جینا ہے۔ آج خواجہ خضر نے خود بتایا مجھے''۔ کالو موڈ میں تھا۔

''بابا! کہاں ملے تھے خواجہ خضر آپ کو؟'' بچوں نے بیک زبان پوچھا۔

''آج ان کی کشتی چلاتے رہے ہیں۔ بابا خضر کہتے تھے کہ تم تھک گئے ہو آرام کر لو''۔ بیوی نے طنز کیا۔

''بابا واقعی خواجہ خضر ہماری کشتی چلانے آئے تھے؟ کتنے پھیرے لگائے انہوں نے؟ کپڑے کیسے پہنے تھے؟ بانس کیسے پکڑتے تھے؟'' داڑھی کتنی لمبی تھی خواجہ بابا کی؟ ان پھیروں کے پیسے وہ خود لے گئے یا ہمیں دے دیئے؟'' بچے معصومانہ سوال پوچھنے لگے۔

کالو مسکراتا رہا ہاتھ دھو کر وہ بچوں کے ساتھ چارپائی پر بیٹھ گیا تو اس کی بیوی نے کھانا اس کے سامنے رکھ دیا۔ پہلا نوالہ توڑ کر وہ چھوٹے بچے کے منہ میں ڈالنے لگا تو بیوی نے آگے بڑھ کر اسے اٹھا لیا۔ ''دن بھر کے تھکے ہیں یہ تو کھانا بھی نہ کھانے دیں گے''۔

بچہ ضد کرنے لگا تو کالو نے ہاتھ بڑھا کر بچے کو پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا، بیوی پاس کھڑی رہی۔

''آدمی روٹی کا سوال ہے بابا''۔ دور سے فقیر کی آواز آئی۔

''لو یہ پھر آ گیا آدھی روٹی والا آج پھر کہے گا خواجہ خضر نے بلایا ہے، خواجہ خضر یہ بھی نہیں دیکھتے ہیں دن

بھر کشتی چلائی ہے"۔ کالو کی بیوی نے غصہ سے کہا۔

"بار بار کہا ہے تم سے ایسی بات نہ کرو، بابا نے سن لیا تو ناراض ہوں گے۔ تمہیں معلوم نہ ہے وہ ہم پر کیسے مہربان ہوویں"۔ کالو نے بیوی کو ڈانٹا اور جلدی جلدی نوالے نگلنے لگا۔

"آدھی روٹی کا سوال ہے بابا!" آواز قریب آتی گئی۔

کالو فقیر کے پہنچنے سے پہلے کھانا ختم کرنا چاہتا تھا مگر آواز کی رفتار سے معلوم ہوتا تھا بستی میں کسی نے بھی اس کے آدھی روٹی کے سوال کا جواب نہیں دیا۔

"آدھی روٹی کا سوال ہے بابا"۔ فقیر اس کی جھونپڑی کے سامنے پہنچ گیا تھا۔

کالو جلدی سے اٹھا اور جتنی روٹیاں سامنے تھیں اٹھا کر باہر نکل گیا۔

"فقیر کا سوال آدھی روٹی کا ہے، بابا باقی تمہارے بچوں کا حق ہے۔ جن کے بارے میں اللہ کے ہاں پوچھ ہوگی جس نے بندے کا حق نہ دیا وہ خالق کا مقروض ہے۔ سب سے پہلے حق بچوں کا ہے، جاؤ ان کا حق واپس کرو۔ پھر آؤ فقیر سے دعا لو"۔ فقیر نے آدھی روٹی توڑ کر اپنی زنبیل میں ڈال لی۔

کالو واپس آیا اور باقی روٹیاں چنگیر میں رکھ کر الٹے قدموں باہر نکل گیا۔

"ساتھ ہے، یہ ہمیش کا فکر نہ کر یو خویش کا"۔ فقیر نے کہا اور 'آدھی روٹی کا سوال ہے بابا' کی صدا لگاتا ہوا آگے نکل گیا۔

کالو نے سونے کے پانچ چمکدار سکے بیوی کے ہاتھ میں دیتے ہوئے خبردار کیا۔ "جس روز تم نے خواجہ خضر کا بھید توڑ دیا پھر نہ کبھی ملے یہ"۔

اس کی بیوی نے جلدی سے مٹھی بند کر لی۔ "میں کیوں توڑوں گی بھید"۔

"بس اب خاموش ہو جا کھانا ختم کر لوں، ایک گھڑی نیند بھر لوں تو تم جگا دینا کسی کو علم نہ ہو فجر سے اوّل جھونپڑی میں ہوں گا"۔ وہ تیز تیز نوالے چبانے لگا۔

کالو کنارے سے بندھی کشتی کے پھٹے پر سر رکھ کر گہری نیند سو رہا تھا کہ کشتی ڈولنے لگی وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور آنکھیں ملتا ہوا دریا کی لہروں کی طرف دیکھنے لگا۔ راوی پُرسکون تھا اندھیری رات میں ہلکی ہلکی لہریں کشتی کو تھپکیاں دے رہی تھیں۔ نیند کا خمار ٹھنڈی ہوا اور شب کی خاموشی میں جیسے نشہ میں ہو کشتی پھر سے ڈولی تو اسے یاد آیا کہ وہ تو خواجہ خضر کے مہمانوں کے انتظار میں کشتی میں لیٹا تھا۔ وہ جلدی سے پانی میں اتر گیا۔ کشتی کو کھینچ کر کنارے کے اور قریب کیا اور دو درویشوں کو سہارا دے کر کشتی تک پہنچایا۔ رسا کھول کر بانس کی ٹیک سے کشتی گہرے پانی میں دھکیلی اور موجوں سے لڑنے لگا۔ درویشوں کو کنارے تک پہنچایا پاؤں دھلا کر جوتے پہنائے اور سر جھکا کر آگے آگے چلنے لگا۔ تھوڑی دور جا کر درویش اسے دعا اور اجازت دے کر اندھیرے میں گم ہو گئے۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑا انہیں گم ہوتے دیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا جھونپڑی کی طرف چل دیا دربار عام میں مغلانی بیگم سے اس کے عمال کی شکایت، کوڑوں کا حکم، شیش محل میں حاضری اور پھر خواجہ خضر کے مہمانوں کو رات کے اندھیروں میں دریا پار لے جانے اور واپس لانے کی ذمہ داری وہ حیران تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ اس بارے میں وہ کسی سے بات بھی نہیں کر سکتا تھا، اس کی اجازت نہیں تھی ورنہ وہ بستی کے سب سے بوڑھے ملاح سے ضرور پوچھتا کہ اس سے پہلے بھی کسی حاکم کے خواجہ خضر سے اتنے گہرے تعلقات تھے؟ جھونپڑی میں اس کی بیوی ابھی تک جاگ رہی تھی۔ اس نے سوئے ہوئے بچوں کو پیار بھری نظروں سے دیکھا اور ننگی چارپائی پر دراز ہو گیا۔ بیوی کو خواجہ خضر کے مہمانوں کے بارے میں کچھ پوچھنے کا

موقع بھی نہ دیا۔

*

شیش محل کی نشست گاہ میں مغلانی بیگم تخت پوش پر گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے بیٹھی پرچہ نویسوں کے تازہ مراسلے دیکھ رہی تھی۔ ایک مراسلہ پڑھ کر اس نے ایک طرف رکھا دوسرا اٹھا کر دیکھا اور پھر وہی پہلے والا مراسلہ اٹھا کر پڑھنے لگی اور سامنے دست بستہ کھڑی گل بنفشہ کو حکم دیا۔ ''ہمیں میاں خوش فہم کو حکم دینا ہے''۔

گل بنفشہ فرشی سلام کر کے الٹے قدموں چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

''حضوری کے لئے کون کون حاضر ہے؟'' مغلانی بیگم نے نظریں اٹھا کر پوچھا۔

''حضور غازی بیگ خاں بخشی، سرفراز خان، نادر بیگ اور چمن لال شرف باریابی کے منتظر ہیں''۔ میاں خوش فہم نے بتایا۔

''غازی بیگ خان کو ہماری اجازت سے مطلع کیا جائے''۔ بیگم نے حکم دیا۔

میاں خوش فہم کے جانے کے تھوڑی دیر بعد غازی بیگ خاں بخشی مغلانی بیگم کے سامنے کھڑے تھے۔

''ہمیں امید ہے ساری سپاہ میں انعام بٹ چکا ہو گا''۔ بیگم نے پوچھا۔

''حضور عالیہ کے ارشاد کی تکمیل کی خبر دیتے ہوئے بندہ خوشی محسوس کرتا ہے''۔ غازی بیگ خاں نے دایاں ہاتھ سینے پر رکھ کر خمیدہ حالت میں خبر دی۔

''قلعہ کے میدان میں کس کے دستے خیمہ زن ہیں؟'' بیگم نے دوسرا سوال کیا۔

''مرزا کریم بخش کی فوج حضور کے حکم کی تعمیل میں قلعہ کے نواح میں خیمہ زن ہو چکی ہے''۔ غازی بیگ نے بتایا۔

''مغل اور ترک دستوں کے سرداروں کا ردعمل کیا رہا؟'' بیگم نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''حضور کی فراست نے مفسدوں کے منہ بند کر دیئے ہیں''۔ غازی بیگ خاں اس کے سوا اور کیا جواب دے سکتا تھا۔

''مغل شہنشاہ کے سندر رساں کل کسی وقت لاہور پہنچنے والے ہیں''۔ بیگم نے ایک مراسلہ نکال کر دکھاتے ہوئے کہا۔

''ہماری طرف سے شاہی سندر رسانوں کے شایان شان استقبال کے انتظامات مکمل ہیں''۔ غازی بیگ خاں نے بتایا۔

''آپ خود دہلی دروازہ سے باہر ان کا استقبال کریں گے اور انہیں عزت و احترام کے ساتھ مہمان خانے تک لے جائیں گے''۔ بیگم نے حکم دیا۔

''حضور کے حکم کی تعمیل میں کوتاہی نہیں ہو گی''۔ غازی بیگ خاں نے یقین دلایا۔

''ہم قلعہ دار سے بھی بات کرنا چاہیں گے''۔

یہ اشارہ تھا کہ آپ جا سکتے ہیں قلعہ دار کو بھجوا دیں۔ غازی بیگ خان آداب بجا لا کر باہر نکل گیا۔ چند ساعتے بعد نادر بیگ بیگم کے سامنے کھڑا تھا۔

''مغل شہنشاہ کے سندر رسانوں کے قیام و آرام کا اہتمام مکمل ہو چکا؟'' بیگم نے پوچھا۔

''بندہ سب اہتمام مکمل ہونے کی خبر دے کر خوشی محسوس کرتا ہے''۔ نادر بیگ نے سر جھکا کر جواب دیا۔

''ہم سمجھتے ہیں مرزا کریم بخش کے سپاہی قلعہ اور فصیل کی ڈیوٹی پر متعین ہو چکے ہیں''۔ غازی بیگ خان کے بتا چکنے کے باوجود اس نے تصدیق کرنے کو پوچھا۔

''جی حضور! وہ نہایت مستعدی سے اپنا فرض ادا کر رہے ہیں''۔ نادر بیگ نے بتایا۔

''آپ کو کچھ علم ہے کہ بادشاہ کے سندر رساں کس منزل میں ہیں؟''

''بندہ اس بے علمی کا اعتراف کر کے شرمندہ ہے''۔

''کل رات وہ آپ کے مہمان ہوں گے''۔ بیگم نے وہی مراسلہ اٹھا کر اسے دکھاتے ہوئے کہا۔

نادر بیگ نے ظاہر کیا جیسے وہ ابھی یہ خبر سننے کے لئے تیار نہ تھا۔

''ہم چاہتے ہیں سرفراز خان کو جلد فارغ کریں''۔

حکم رخصتی پر نادر بیگ سلام کر کے باہر نکل گیا اور سرفراز خان اندر داخل ہوا۔

''ہم پرگنہ ایمن آباد کے ناظم اور اس کی سپاہ کے بارے میں تازہ معلوم چاہتے ہیں''۔ بیگم نے کہا۔

''ایمن آباد کا ناظم اور اس کی سپاہ حضور عالیہ کے وفادار ہیں''۔ سرفراز نے سر جھکا کر اطلاع دی۔

''ان کی وفا کا یقین تم نے کیسے کیا؟''

''اس خاکسار اور بابا خان ولی نے گزشتہ شب دو بار راوی عبور کیا''۔

''لہروں کا شور کیا کہتا ہے؟''

''لہریں نغمہ سرا ہیں''۔

''بابا خان ولی بھوانی داس کے ساتھ چلہ کاٹ چکے؟'' بیگم نے پوچھا۔

''بھوانی داس کی خواہش کی تکمیل کا ابھی اہتمام نہیں ہوسکا؟'' سرفراز خاں نے جواب دیا۔

''ہم چاہتے ہیں آدینہ بیگ تک بابا خان ولی کا پیغام جلد پہنچ جائے۔ آپ ہماری خواہش سے انہیں آگاہ کردیں''۔ بیگم نے حکم دیا۔

''حضور کے ارشاد کی آج کی شب تعمیل ہو جائے گی''۔ سرفراز خاں نے سر جھکا دیا۔

''فریق ثانی کی صحت کیسی ہے؟''

''سند رسانوں کی روانگی کی اطلاع سے ان کی صحت پر خوشگوار اثرات مرتب ہوئے تھے، حضور کے انتظامات کی خبر سے وہ پریشان ہیں''۔ اس نے بتایا۔

''ہمارا حکم تھا انہیں کسی طرح خبر نہ ہونے پائے یہ شبہ کیسے ہوا؟ اس فرش میں نہ کوئی سوراخ ہے نہ یہ دیواریں زبان رکھتی ہیں''۔ بیگم کے لہجہ میں تلخی آ گئی۔

''ممکن ہے خلاف معمول اقدامات سے ان کے اندر کا چور جاگ اٹھا ہو''۔

''ہم چاہتے ہیں جو چور جاگ گیا ہے وہ آج ساری رات بھر جاگتا رہے تاکہ کل رات وہ چوری پر نہ جا سکے''۔ بیگم نے کہا۔

''حضور کے غلام نیند کو چور کی آنکھوں کی خواب گاہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے''۔ سرفراز نے یقین دلایا۔

''نیند پر ایسا پہریدار بٹھا دیں کہ چور رات بھر اس کے انتظار میں بے چین رہے''۔

''یہ فکر اور اہتمام اس غلام کے سپرد کر کے حضور بے فکر ہو جائیں''۔

''ہمیں بتایا گیا تھا چمن لال بار یابی کا منتظر ہے''۔

''بندہ ابھی اسے اس کی خوش بختی سے آگاہ کرتا ہے''۔

سرفراز خان یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا تو مغلانی بیگم نے مراسلے ایک طرف رکھے اور کچھ لکھنا شروع کر دیا۔ چمن لال اندر آیا فرشی سلام کیا اور دست بستہ کھڑا ہو گیا۔ مغلانی بیگم لکھنے میں مصروف رہی اور وہ خاموش کھڑا رہا۔ بیگم نے کاغذ تہہ کر کے ایک طرف رکھا اور چمن لال سے مخاطب ہوئیں۔ ''اہل لاہور کی تمہارے نظم شہر کے بارے میں کیا رائے ہے؟''

''حضور کا غلام اپنے بارے میں اپنی زبان سے کچھ کہنے کی گستاخی نہیں کر سکتا''۔ چمن لال نے سر جھکا کر عرض کیا۔

''ہم سمجھتے ہیں شہر کی منڈیوں اور بازاروں میں غلہ وافر ہوگا؟'' بیگم نے پوچھا۔

"حضور کے اقبال کی بدولت شہر میں انسانی ضرورت کی ہر چیز وافر دستیاب ہے"۔ چمن لال نے بتایا۔

"کسی چیز کا بھاؤ نہیں بڑھنا چاہئے"۔

"جملہ عمال ہوشیار ہیں، اشیاء کی آمد کے راستے محفوظ ہیں، دو ماہ سے کسی چیز کی قیمت نہیں بڑھی"۔

"چاول کے تاجروں کو آڑھتیوں سے کوئی شکایت؟"

"کسی آڑھتی کو ایسی گستاخی کی جرأت نہیں ہو سکتی"۔

"اس مہینے تاجروں کے کتنے قافلے لاہور آئے؟"

"سمرقند اور قندھار کے تاجروں کا ایک قافلہ لاہور پہنچا ہے، وہ ابھی لاہور میں ہیں کوئی واپس نہیں گیا"۔ چمن لال نے بتایا۔

"ہمارا حکم تھا قندھار کے تاجروں کو ہر سہولت میسر آئے تاکہ واپس جا کر وہ تمہارے حسن انتظام سے دیگر تاجروں کے حوصلے بڑھائیں اور امن کا پیغام پہنچائیں"۔

"حضور کے حکم کی خاص طور پر تعمیل ہو رہی ہے"۔

"فتنہ پرداز کس حال میں ہیں؟" بیگم اصل موضوع کی طرف آئی۔

"حضور کے خوف سے سب اپنے اپنے بلوں میں چھپے ہوئے ہیں"۔

"غازی بیگ خان سے نئے احکامات حاصل کر کے ان پر عمل کریں اور ہوشیار رہیں، عوام کو کوئی شکایت نہیں ہونا چاہئے"۔

چمن لال نے سر جھکا کر شرف باریابی اور احکامات پر شکریہ ادا کیا اور الٹے قدموں چلتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس رات شہر کے دروازوں پر چراغاں کیا گیا اور موچی دروازہ کے باہر رات بھر آتش بازی ہوتی رہی۔ میر مومن خان کی حویلی موچی دروازہ کے اندر تھی۔ وہ اس اظہار شادمانی کے غم میں رات ایک لمحہ کے لئے بھی سو نہ سکا۔ اگر مغلانی بیگم کے مخبروں نے اسے خبردار کر دیا ہے کہ شاہجہان آباد سے سند حکومت اس کے نام جاری کر دی گئی ہے تو وہ خوشیاں کیوں منا رہی ہے۔ اگر وہ اب تک بے خبر ہے تو فوجی اور حفاظتی تیاریاں کس لئے ہیں؟ وہ ساری رات سوچتا رہا، صبح جب بھکاری خان کے آدمی اور ان کے حامی امراء میر مومن خاں کی حویلی میں جمع ہوئے تو سند حکومت موصول ہونے اور نظام حکومت پر قبضہ کے طریقوں پر غور کی بجائے وہ شب گزشتہ کے واقعات پر غور کرنے لگے۔ کسی نے کہا۔ سند حکمرانی کی روانگی کے بعد عمادالملک نے شہنشاہ سے اپنی ساس کے حق میں نئی سند جاری کروا دی ہوگی۔ کسی دوسرے نے اس سے اختلاف کیا تیسرے نے رائے دی کہ احمد شاہ ابدالی نے کوئی نئی سفارت بھیجی ہوگی۔ یہ اس کے استقبال کا اہتمام ہے کسی نے مغلانی بیگم کی ملامت کی۔ "کل اس خاتون کا اکلوتا بیٹا فوت ہوا، آج یہ خوشیاں منا رہی ہے"۔

نماز عصر کے بعد جب میر مومن خان اور بھکاری خان کے حامی موچی دروازہ کی حویلی میں سند حکومت لانے والی سفارت کے استقبال کے لئے جمع تھے تو شہر کی گلیوں اور بازاروں میں ڈھنڈورچی ڈھنڈورا پیٹتے پھر رہے تھے۔ "حضور عالیہ حاکم پنجاب مغلانی بیگم کا اقبال بلند ناظم لاہور چمن لال آج شام اہل شہر کی شکایات سننے کے لئے مسجد وزیر خاں کے سامنے دربار عام لگا رہے ہیں۔ اگر کسی خاتون مرد بچے یا بوڑھے کو کسی قسم کی کوئی شکایت ہو، کوئی شکوہ ہو تو وہ دربار عام میں حاضر ہو کر پیش کرے۔ حضور حاکم عالیہ کا حکم ہے کہ ہر کسی کی موقع پر دادرسی کی جائے"۔

(جاری ہے)

داستان ایک عامل کی

قسط: 8 ☆ ------------- 0314-4652230, 0303-9801291 ------------- محمد افضل رحمانی

تو بادو حصوں میں بٹ گیا ہے سرکار! اور مذہب عشق میں یہ جائز نہیں......
تو بے سے کہنا میں مر جاؤں تو دو ٹنک مٹی میری قبر پر ڈال جائے۔

شیطان اپنی پوری قوت سے مجھ پر سوار ہو چکا تھا کہ اچانک زوردار دھاکے سے دروازہ کھلا، کوئی شخص تیزی سے اندر آ کر میری طرف بڑھا۔

مَیں نے غور سے دیکھا تو قوبا پہلوان تھا، وہ بپھرے ہوئے ہاتھی کی طرح میری طرف بڑھ رہا تھا۔ جب وہ میرے قریب آیا، میں جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک زوردار ڈنڈ میری گردن پر لگایا میں دیوار کے ساتھ ٹکرایا، میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ میں اس غیر متوقع صورتِ حال سے سخت گھبرا گیا تھا۔ پھر وہ میرے قریب آیا، مجھے گریبان سے پکڑ کر اوپر اٹھایا اور ایک زوردار چپت میرے منہ پر رسید کی۔ درد کی اذیت سے میری روح سمٹ گئی لیکن ابھی میں ہوش میں تھا کہ ناجا پہلوان اندر داخل ہوا۔

''او قوبے! یہ کیا بے وقوفی ہے؟'' اس نے قوبے کو سخت لہجے میں کہا۔ ''فقیر سائیں کی بددعا بھی لگ سکتی ہے''۔

''نہیں، بھائی جی! یہ فقیر سائیں نہیں ہے، شیطان ہے''۔ قوبے نے غصے سے کہا۔ ''اس نے جنت کے ساتھ بے حیائی کرنے کی کوشش کی ہے''۔

''تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''بھائی جی! میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے''۔ قوبے نے کہا۔ ''مجھے اس پر پہلے ہی کچھ شک سا ہو گیا تھا۔ میں نے بند دروازے کے سوراخ سے جھانک کر دیکھا تو......''

''کیوں اوئے بدمعاش! قوبا ٹھیک کہہ رہا ہے؟''

ناجے نے قہر زدہ آواز میں مجھ سے پوچھا۔

''بھائی جی! تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے؟'' قوبے نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ غصے کی زیادتی کی وجہ سے اس کے جسم پر رعشہ طاری تھا۔

''دیکھ قوبے! اس کا یہ علاج نہیں جو تو کر رہا ہے''۔

''تو پھر اس کا کیا علاج ہے؟'' قوبے کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔

''قوبے! کسی لے کر مکان کے پچھلے کمرے میں اس کے لئے قبر تیار کر''۔ ناجے نے سرد لہجے میں کہا۔ ''ہم اس کو زندہ دفن کر دیں گے اور دیکھ اس کام میں دیر نہ کر، جا جلدی سے اپنا کام کر''۔

قوبا چلا گیا اور اپنے کام میں لگ گیا۔ زمین کھودنے کی آواز میرے کانوں میں آ رہی تھی۔ ایک اذیت ناک موت میری منتظر تھی۔

''ناجے! مجھے زندہ دفن نہ کرو، مجھے قتل کر دو''۔ میں نے ناجے پہلوان سے التجا کی۔ ''مجھے کوئی افسوس نہیں ہو گا لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں نے جنت کے ساتھ کوئی گناہ نہیں کیا''۔

''او بے غیرت! قوبا میرے ساتھ کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا''۔ ناجے نے متاثر ہوئے بغیر کہا۔ ''تیرے ساتھ ہم جو کچھ کرنے والے ہیں وہ تیرے جرم کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ جوانی ہم پر بھی آئی تھی بلکہ ابھی بھی ہے لیکن جوانی کسی کی دھی بہن کی عزت سے کھیلنے کے لئے نہیں ہوتی بلکہ دھی بہن کی عزت کی حفاظت کے لئے ہوتی ہے۔ میرے والد ماجے پہلوان کی مجھے یہ وصیت تھی کہ کسی کی دھی بہن کو بُری نظر سے کبھی نہ دیکھنا اور جو تمہاری دھی بہن کی طرف میلی نظر سے دیکھے اسے بھی زندہ نہ چھوڑنا''۔

جنت ہوش میں آ گئی تھی، وہ اس صورتِ حال کو سمجھنے سے قاصر تھی۔

''جنت! باہر چلی جاؤ اور دیکھو اگر کوئی آدمی یا عورت دروازہ کھٹکھٹائے تو دروازہ مت کھولنا''۔ ناجے نے بہن سے کہا۔

''ناجے! ادھر دیکھ''۔ میں نے بلند آواز سے کہا۔

غیر اختیاری طور پر ناجے نے میری طرف دیکھا اور پھر وہ

میری نظروں کے حصار میں تھا اور پھر میں نے نظریں اس سے ہٹائیں تو وہ چکرایا اور زمین پر گر پڑا۔

میں تیزی سے باہر نکلا اور بیرونی دروازہ کھول کر جتنی تیزی سے بھاگ سکتا تھا بھاگنا شروع کیا۔ میں مصروف راستے سے ہٹ کر کھیتوں کے درمیان میں سے بھاگ رہا تھا لیکن یہ بھول گیا کہ راستے میں پڑنے والی نہر کے پُل سے دور نکل جاؤں گا۔ جب میں نہر کی پٹری پر پہنچا تو پُل کافی دور رہ گیا تھا۔ اب یہ میرے لئے مسئلہ بن گیا کیونکہ نہر سے گزرنا میرے لئے مشکل تھا۔ میں تیرنا نہیں جانتا تھا لیکن پُل کی طرف جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ہوسکتا تھا وہ میرا پیچھا کرتے ہوئے ادھر آ نکلیں اور میں دوبارہ موت کے منہ میں چلا جاؤں۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ رات ہونے کا انتظار کیا جائے۔ لہٰذا میں جوار کے ایک کھیت میں چھپ کر بیٹھ گیا اور جب اچھی طرح اندھیرا پھیل گیا تو نہایت احتیاط سے میں پُل پر پہنچا اور پھر بمشکل خانقاہ تک پہنچ گیا۔

رکھا میرے انتظار میں تھا اور بہت پریشان ہوگیا تھا اس نے مجھ سے پوچھا۔ نذیرے تو نے اتنی دیر کہاں لگائی اور تمہارے پاس نیاز وغیرہ بھی نہیں ہے میں نے جھوٹ بولا۔ رکھے! میرے پاس نیاز کے روپے اور چاول وغیرہ کافی تھے کہ راستے میں ڈاکوؤں نے مجھے پکڑ لیا اور چاول روپے وغیرہ سب چھین لئے اور پھر مجھے رسوں سے باندھ کر فرار ہوگئے۔ میں بڑی مشکل سے ہاتھ پاؤں کھول کر یہاں تک پہنچا ہوں۔ رکھے نے مجھے تسلی تشفی دی اور میری دل جوئی کرنے لگا۔ میں نے فقیری لباس اتارا اور بالوں کی مصنوعی لٹیں اتار کر حجرے میں چھپا دیں۔ مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ اگر وہ پیچھا کرتے ہوئے کسی وقت ادھر پہنچ گئے تو بہت برا ہوگا لیکن کئی دن گزر گئے کوئی ادھر نہ آیا۔ اب مجھے کچھ حوصلہ ہوگیا تھا۔

یادِ رفتگاں

یہاں میں (محمد افضل رحمانی) نذیر کی کہانی روک کر وہ حصہ پیش کر رہا ہوں جو میرے ساتھ پیش آیا۔ اس کہانی کے چار کرداروں سے میری ملاقات ہوئی تھی جن میں نذیر، رابعہ، جنت اور توبا پہلوان شامل ہیں۔ رابعہ سے ملاقات تو آگے چل کر بیان کروں گا جنت سے ملاقات کا احوال مختصر پیش خدمت ہے۔ نذیر کی وفات کے تقریباً چھ سات ماہ بعد جنت اور توبا پہلوان میرے پاس آئے تھے۔ اس وقت نذیر والے واقعے کو اندازاً بائیس سال گزر گئے ہوں گے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس طرح اتفاقیہ ملاقات ہوجائے گی۔

جنت کی شادی انیس برس کی عمر میں ہوئی تھی۔ اس طرح اس وقت اس کی عمر اکتالیس برس تھی جبکہ توبا پہلوان اندازاً 45 سال کی عمر کا ہوگا لیکن دونوں میاں بیوی قابلِ رشک صحت ہونے کی وجہ سے بالکل جوان نظر آتے تھے۔ ویسے بھی ان کی عمریں ابھی بڑھاپے کی نہیں تھیں۔ اپنی روایتی شرافت اور رکھ رکھاؤ کی وجہ سے دونوں کا اندازِ گفتگو انتہائی مہذب اور ملنسار طبیعت ہونے کی وجہ سے طبیعت پر بوجھ نہیں بنتے تھے بلکہ میں ان کی ہر حرکت سے بہت ہی خوش ہوا تھا۔ سوائے ایک بات کے اور وہ یہ تھی توبا پہلوان مجھے ملتے وقت ذرا زیادہ ہی عقیدت مندانہ انداز میں ملا تھا اور جنت نے بھی اس کی تقلید میں میرے پاؤں چھوئے اور پھر ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے انہیں بیٹھنے کے لئے کہا اور انہیں سمجھایا کہ سوائے خدا کے کسی کے آگے جھکنا مسلمان کے شایانِ شان نہیں اور ملتے وقت السلام علیکم سے بڑھ کر اور کوئی طریقہ نہیں ہے۔ میں نے انہیں اور بھی چند نصیحتیں کیں جو انہوں نے خوش دلی سے سنیں اور میرے قریب ہی بیٹھ گئے۔

قارئین کرام! آپ یقین کریں جنت کا نام کسی نے یوں ہی جنت نہیں رکھ دیا تھا وہ واقعی جنت تھی۔ متناسب الاعضاء ہونے کی وجہ سے اس کے حسن میں ایک قسم کا رعب اور دبدبہ تھا۔ صنفِ نازک ہونے کے باوجود اُس کا سراپا جاندارا ور مضبوط تھا۔ وہ جاپانی گڑیا نہیں مصری بدوی عورت کی طرح تھی۔ اس کے چہرے پہ جو نور سمٹ اور پھیل رہا تھا وہ اس کی روحانی پاکیزگی کی دلیل تھا۔ میں ابھی اُن سے پوچھنے ہی والا تھا کہ کہاں سے آئے ہو اور کیا کام ہے کہ میری بیوی نے مجھے آواز دی۔

قاری صاحب! ذرا بات سنیں۔

''قاری صاحب! شاید باجو آپ کو بلا رہی ہیں''۔ جنت نے ہلکا سا مسکراتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے میں ابھی آیا''۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''ہاں بھئی کیا بات ہے؟'' میں نے بیگم سے کہا۔

''ذرا اس عورت کو باہر بھیجئے''۔

''کیوں کیا بات ہے؟''

''بس آپ اس کو بھیج دیں بات کوئی نہیں ہے''۔

''ٹھیک ہے، جناب! جیسے آپ کا حکم''۔

''دیکھو بہن! تمہیں باجو باہر بلا رہی ہیں''۔ میں نے جنت سے کہا تو وہ جلدی سے اٹھ کر باہر آ گئی۔ میری بیوی نے اسے بنی سے پکڑا اور اسے لے کر کمرے کی طرف چل دی اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے کہنے لگی آپ جائیں میں ابھی اسے بھیج دیتی ہوں۔ وجہ دراصل یہ تھی کہ چند عورتوں نے جنت کو ہمارے گھر آتے گلی میں دیکھ لیا تھا اور وہ اس کے قد کاٹھ اور حُسن سے اتنی متاثر ہو گئی تھیں کہ انہوں نے میری بیوی سے فرمائش کی ذرا اس عورت کو اِدھر بلاؤ، ہم اُسے دیکھنا چاہتی ہیں۔ میں واپس قوبے پہلوان کے پاس آ گیا اور اُس سے اس کا نام پوچھا۔

''جناب میرا نام یعقوب ہے''۔ اس نے بتایا۔ ''مگر لوگ پیار سے مجھے قوبا کہتے ہیں''۔

''کیا کام کرتے ہو؟''

''جناب! زمیندارہ کرتا ہوں خدا کا فضل ہے''۔ قوبے نے کہا۔ ''دو مربع زمین ہے اور والدین کا اکلوتا بیٹا ہوں ویسے مجھے پہلوانی کا شوق ہے روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں لہٰذا میں یہ شوق بھی کرتا ہوں دراصل پہلوانی ہمارے خاندان میں ایک ورثے کی حیثیت سے چلی آ رہی ہے''۔

''کیا آپ کے ساتھ یہ آپ کی بیوی ہے؟''

''ہاں جی، یہ میری بیوی ہے''۔

''اس کا نام کیا ہے؟''

''جناب! اس کا نام جنت ہے''۔

میرے ذہن میں پہلے ہی ایک شک سا پیدا ہو گیا تھا لیکن قوبے کے تعارف کے بعد میں چونک سا گیا۔ آپ کا گاؤں کون سا ہے؟ میں نے اپنے احساسات پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔ اس نے اپنے گاؤں کا نام بتایا۔ اب مجھے کوئی شک نہیں رہا تھا بلکہ یقین ہو گیا کہ یہ وہی جنت ہے جس کا ذکر نذیر نے میرے سامنے کیا تھا۔

''آپ میرے پاس کس کام سے آئے ہیں؟''

''سرکار! آپ سے دوا لینے آئے ہیں اور ساتھ دعا بھی''۔

''آپ کو کیا بیماری ہے؟''

''سرکار! بیماری تو کوئی نہیں اللہ کا شکر ہے ہم دونوں میاں بیوی بالکل تندرست ہیں''۔ اس نے عاجزی سے کہا۔ ''لیکن ہم اولاد سے محروم ہیں۔ کسی نے آپ کے بارے میں بتایا، بس آپ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ بڑے بڑے حکیموں اور بزرگوں کے پاس گئے ہیں، پانی کی طرح پیسہ بہایا ہے لیکن جنت کی گود ہری نہیں ہو سکی۔ میں بھی اپنے ماں باپ کی آخری عمر کی اولاد

ہوں اور وہ بھی بالکل مایوس ہوگئے تھے لیکن پھر اللہ نے اُن کی فریاد سنی اور میں پیدا ہوا لیکن انہوں نے میرا کچھ بھی نہیں دیکھا جلد ہی بیچارے اللہ کو پیارے ہوگئے۔ میرا والد بھی اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا"۔

"جنت کے کتنے بھائی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"سرکار! ماشاء اللہ جنت کے چار بھائی ہیں"۔ قوبے نے کہا۔ "بڑا بھائی نامور پہلوان ہے، اس کا نام نیاز احمد ہے لیکن اسے ہم سب پیار سے ناجا کہتے ہیں۔ بڑا جی دار آدمی ہے جی لیکن اب اس کی عمر ڈھل گئی ہے"۔

"جنت تمہاری رشتہ دار ہے؟"

"نہیں جی!"

"تمہارا رشتہ کیسے طے ہوا؟"

"سرکار! ایک اکھاڑے میں ناجے بھائی نے میری کشتی دیکھی، میری کارکردگی اچھی تھی۔ ناجے نے مجھ سے میرے حالات تفصیل سے پوچھے۔ میں ان کے جوڑ کا نوجوان تھا، اس نے مجھے پسند کرلیا۔ اس طرح جنت میری زندگی میں آئی"۔

"جنت کیسی بیوی ہے؟"

"اس کا تو جی جواب ہی نہیں"۔ قوبے نے عقیدت سے کہا۔ "میں نے جب اسے پہلی مرتبہ دیکھا تو میں نے اپنے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔ او قوبے! تیری قسمت جاگ گئی ہے۔ سرکار! بڑے بڑے حسین لوگ دیکھے ہیں لیکن جنت کے پائے کا حُسن کہیں دیکھنے کو نہیں ملا"۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو چومتے ہوئے کہا۔

"سرکار! جنت کسی نیک گھڑی میں پیدا ہوئی تھی، اس کے کردار میں بھی کوئی کمزوری نہیں ہے۔ میرے دل میں کبھی یہ خیال تک بھی نہیں کہ جنت کبھی بہک بھی سکتی ہے اور پھر مجھ سے پیار بھی کرتی ہے۔ اتنا پیار کہ جس کا کوئی خاوند تصور بھی نہیں کرسکتا"۔

ابھی ہم باتوں میں مشغول تھے کہ جنت پورے بانکپن سے چلتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور قوبے کے پاس دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

"سرکار! آپ کی باجو تو بہت اچھی ہیں"۔ اس نے میری بیوی کی تعریف کے انداز میں کہا۔

"میری باجو!" میں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ "دیکھو، جنت! جو لفظ تم نے استعمال کیا ہے اگر میں کہہ دیتا تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا پڑ جاتا یا متواتر ساٹھ روزے رکھنے پڑتے"۔

جنت کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا، احساسِ ندامت نے اس کے سفید چہرے پر سرخی کی تہہ جما دی جیسے میدے میں سندور ملا دیا گیا ہو۔ پھر وہ زور سے ہنسی جلترنگ سی بجی، قوسِ قزح کے رنگ بدلے، موتیے نے بہار دکھائی اور پھر اس نے قوبے کے مونڈھے کی اوٹ میں اپنا چہرہ چھپالیا۔ میں نے قوبے کو اشارے سے سمجھایا کہ ادھر ذرا میں طرف ہوجاؤ۔ قوبا بھی شاید مذاق کے موڈ میں تھا، وہ جلدی سے ایک طرف کو ہوگیا اور جنت کو سر سے پکڑ کر سیدھا کردیا۔

"دیکھو، جنت! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ بعض دفعہ انسان سے غلطی ہو جاتی ہے"۔ میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"دیکھو سرکار! آپ ناراض نہ ہوں"۔ جنت نے شرمندہ سے لہجے میں کہا۔ "وہ آپ کی نہیں میری باجو ہیں"۔

"میں نے کب کہا کہ میں ناراض ہوں"۔ میں نے کہا۔ "ویسے تمہیں یہ بتانا ہوگا کہ اگر وہ تمہاری باجو ہیں تو پھر تم ہماری کیا لگتی ہو؟"

اس نے ذرا سا سوچا اور پھر کہنے لگی بہن۔

"ہاں، یہ تو ٹھیک ہے لیکن بیوی کی بہن کو کیا کہتے ہیں؟" وہ سوچ میں پڑ گئی۔

"سرکار! میں بتاتا ہوں"۔ قوبا کہنے لگا۔ "بیوی کی بہن کو سالی کہتے ہیں"۔

"ہاں، یہ ہوئی ناں بات"۔ میں نے شوخی بھرے انداز میں کہا۔ "جنت کیا تمہیں ہماری سالی ہونے پر کوئی اعتراض ہے؟"

"نہیں، سرکار! سالی بھی تو بہن ہی ہوتی ہے"۔

"لیکن سالی کو آدھی گھر والی کہتے ہیں"۔ قوبا اب صحیح طریقے سے محظوظ ہو رہا تھا۔

"نہیں، سرکار! یہ کسی نے غلط کہا ہے"۔ جنت نے اعتراض کیا۔

"دیکھو جنت! یہ ایک پنجابی اکھان ہے اور سو عقلمند جمع ہوں تو ایک اکھان بنتا ہے"۔ میں نے کہا۔

"اتنے ڈھیر سارے لوگ غلط کہہ گئے ہیں؟"

"نہیں، سرکار! عقل مند لوگوں کی باتیں غلط نہیں ہوتیں"۔ جنت نے کہا۔ "لیکن اس اکھان میں جان بوجھ کر لوگوں نے ڈنڈی ماری ہے"۔

"اچھا تو پھر تم بتا دو کہ صحیح کس طرح ہے؟"

"سرکار! صحیح اس طرح ہے 'سالی آدھے گھر والی' یعنی سالی بہن کے آدھے کی مالک ہوتی ہے۔ اب آدھی گھر والی اور آدھے گھر والی کا فرق آپ سمجھ جائیں"۔

"یہ کہاں لکھا ہے؟" میں نے ڈنڈی مارنے والے انداز میں کہا۔

"لیکن سرکار! آپ جو کہتے ہیں وہ کہاں لکھا ہے؟" اس نے جوابی حملہ کیا۔

ظاہر ہے اس کا جواب میرے پاس نہیں تھا لہٰذا مناظرانہ اصول کے مطابق مجھے اپنی شکست تسلیم کر لینے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا جبکہ حقیقت اور سچائی اور پاکیزگی بھی جنت کے بیان کردہ معانی میں ہی تھی کیونکہ سالی کا رشتہ ایک نہایت پاکیزہ اور حد درجہ قابل احترام ہے۔ اسی لئے خالق کائنات نے بیوی کی موجودگی میں اس کی بہن سے نکاح کرنا حرام کر دیا ہے۔

(دیکھیں سورۃ نساء)

اب ہم سیریس ہو گئے تھے۔ میں نے بڑی توجہ سے جنت کو چیک کیا اور اس سے چند باتیں پوچھیں۔ وہ احتباس طمث کی مریضہ تھی جو میرے خیال میں اس قدر پیچیدہ تھی کہ ایک فیصد چانس بھی ٹھیک ہونے کے نہیں تھے لہٰذا میں نے انہیں اندھیرے میں رکھنا مناسب نہ سمجھا اور صحیح صورت حال سے انہیں آگاہ کر دیا۔

"یہ نقص تمہیں کب سے ہوا؟"

"سرکار! شادی کے دو ڈھائی سال بعد میں ایک اللہ والے کے پاس گئی تھی"۔ جنت نے بتایا۔ "ہمارے گاؤں سے کافی دور ایک خانقاہ تھی جس کے متولی بڑے خدا رسیدہ بزرگ تھے، انہوں نے مجھے دوا دی تھی۔ بس وہ دوائی کھانے کے بعد مجھے یہ بیماری لاحق ہو گئی"۔

میرے ذہن میں فوراً ایک خیال آیا میں نے پوچھا۔ "کیا انہیں موتیوں والی سرکار تو نہیں کہتے تھے؟"

"ہاں جی! لوگ انہیں موتیوں والی سرکار ہی کہتے تھے"۔ جنت نے حیران ہو کر کہا۔

"نیم حکیم خطرہ جان، نیم ملا خطرہ ایمان"۔ میں بڑبڑایا۔

"سرکار! آپ انہیں کیسے جانتے ہیں؟" جنت نے پوچھا۔

"بھئی! وہ ایک مشہور و معروف آدمی تھے"۔

"سرکار! کیا آپ نے انہیں دیکھا تھا؟"

"نہیں لیکن ان کے مزار کی زیارت کی ہے"۔ میں نے کہا۔ "ان کے عقیدت مندوں نے مزار کی تزئین و آرائش پر لکھوکھا روپیہ خرچ کیا ہے"۔

"ہاں، جی! سنا ہے اب ان کا پوتا وہاں گدی نشین ہے"۔

"لیکن ان کی کوئی اولاد نہیں تھی"۔ میں نے حیرانگی

سے کہا۔

''نہیں، سرکار! ان کے بیٹے کا نام نذیر تھا۔ نذیر کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا گدی نشین ہے''۔

''نذیر کا بیٹا؟''

''جی، سرکار!''

''لیکن نذیر کا تو کوئی بیٹا نہیں تھا''۔

''آپ کو کیسے پتہ ہے، کیا آپ نذیر کو جانتے ہیں؟''

''نہیں تو لیکن مجھے کسی نے بتایا تھا''۔ میں نے بات گول کرتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو، جنت! میں نے تمہارے والد ماجے پہلوان اور تمہاری والدہ بیشاں کے بارے میں بھی سنا تھا کہ وہ دونوں ایک ہی دن فوت ہوئے تھے اور پھر ایک ہی قبر میں دفن کیے گئے تھے''۔

جنت اور توبا بیک وقت چونکے اور پھر جنت نے توبے کے کندھے پر سر رکھا اور سسکیوں سے رونے لگی۔ توبا اسے تسلی دلاسا دینے لگا اور آہستہ آہستہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ چند ہی لمحوں میں پیاروں کی یاد اور جدائی نے جنت کو تڑپا کر رکھ دیا۔ اس کے چاندی رنگ چہرے پر زردی چھا گئی تھی پھر اسے کوئی خیال آیا، وہ تڑپ کر رہ گئی اور بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔

''سرکار! وہ دن میرے لئے قیامت سے کم نہیں تھا۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کسی بیٹی کو اس کے والد اور والدہ ایک ہی دن میں داغ جدائی دے جائیں''۔ پھر وہ خلاؤں میں گھورنے لگی جیسے کھوئے ہوئے پیاروں کا کھوج لگا رہی ہو۔ پھر کہنے لگی۔ ''میرا ماموں اللہ جوایا اپنے بیٹے رکھنے کی جدائی میں گھل گھل کر مر گیا اور میری والدہ دونوں کی جدائی میں بستر سے لگ گئی اور پھر موت نے اسے اپنے آہنی پنجوں میں لے لیا اور میرا والد میری والدہ کی جدائی برداشت نہ کر سکا اور والدہ کے ساتھ ہی جنت کو سدھار گیا''۔

کمرے کا ماحول انتہائی افسردہ ہو گیا تھا۔ میں دل ہی دل میں اپنے آپ کو کوس رہا تھا۔ ایک ہنستے بستے جوڑے کو ماضی میں لے جا کر ان کا دل دکھی کر دیا تھا لیکن میرا اپنا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ پیاروں کی یاد میں چند آنسو بہا لینے سے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جاتا ہے لیکن بعض یادیں دل کا روگ بھی بن جاتی ہیں اور قبر تک ساتھ جاتی ہیں لیکن جانے والے اتنے سنگ دل ہوتے ہیں کہ واپس آنے کا نام ہی نہیں لیتے۔

کیا جانئے، افق کے اُدھر کیا طلسم ہے؟
لوٹے نہیں زمین پہ، اک بار جو گئے

میرے جی میں آیا کہ جنت کو بتا دوں رکھا تمہارا ماموں زاد بھائی تھا اور موتیوں والی سرکار کا ڈھونگ اسی نے رچا رکھا تھا لیکن میں رکھے کے بھید کو ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا جس بھید کو اس نے ساری عمر چھپائے رکھا۔

''جنت! جب تم موتیوں والی سرکار کے پاس گئی تھی تو اس نے تمہیں کیا کہا تھا؟''

''سرکار! اس نے مجھے کہا تھا کہ آئندہ کے لئے کبھی کسی خانقاہ یا مجاور کے پاس نہ جانا''۔

''پھر تم نے اس کی بات پر عمل کیا؟''

''ہاں، سرکار! میں کبھی کسی خانقاہ وغیرہ پر نہیں گئی''۔ جنت نے کہا۔ ''ویسے بھی مجھے اچھا نہیں لگتا اگر خدا تعالیٰ مجھے اولاد سے محروم رکھنا چاہتے ہیں تو کوئی بھی میری جھولی نہیں بھر سکتا۔ میں نے تو توبے سے کئی بار کہا ہے کہ وہ دوسری شادی کر لے لیکن توبا نہیں مانتا''۔

''اچھا، سرکار! اب ہم چلتے ہیں''۔ توبے نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''نہیں، توبے آج میں تمہیں نہیں جانے دوں گا''۔ میں نے کہا۔ ''تم آج میرے مہمان ہو گے''۔

''اس کا فیصلہ جنت کرے گی''۔ توبے نے جنت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے توبے! ہم کل چلے جائیں گے''۔ جنت نے کہا۔ ''باجو بھی کہہ رہی تھیں کہ آج واپس نہ جانا، ادھر ایک رات ہمارے پاس ٹھہرو''۔

''ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی''۔ توبے نے میٹھے ہوئے کہا۔ جنت اٹھ کر اندر چلی گئی، میں اس کے پیچھے پیچھے اندر گیا اور بیگم سے کہا۔

''لو بھئی! جنت آج ہماری مہمان ہوگی''۔

''سچ!'' میری بیگم نے خوش ہوتے ہوئے کہا اور جنت کو اپنے ساتھ چمٹا لیا۔

دراصل میں پہلوانوں کی کشتی دیکھنے اور ان کی طاقت کے مظاہرے دیکھنے کا شوقین تھا اور یہی وجہ تھی کہ میں نے توبے کو ایک رات کے لئے روک لیا اور بہانے بہانے سے اس کی خوراک کے متعلق بھی پوچھ لیا۔ جس کا میں نے انتظام کر لیا اور پھر میری فرمائش پر توبے نے ہمارے علاقے کے ایک معروف پہلوان کے ساتھ کشتی کی اور سہاگے پر مٹی کے چار توڑے رکھ کر وزن اٹھایا۔ قریب دیہات کے لوگوں کو بھی اطلاع دے دی گئی، لوگوں کی بڑی تعداد نے توبے کی طاقت کا مظاہرہ دیکھا۔ رخصت ہوتے وقت توبے اور جنت سے دوبارہ ملنے کے وعدے پر میں نے انہیں الوداع کیا۔ اس کے بعد کی مختصر داستان یوں ہے کہ جنت نے اپنے بڑے اصرار کے ساتھ توبے کی دوسری شادی کروائی اور پروین کے ان شعروں کا مصداق بن گئی۔

کمالِ ضبط کو خود بھی تو آزماؤں گی
مَیں اپنے ہاتھ سے اس کی دلہن سجاؤں گی
بدن کے کرب کو وہ بھی سمجھ نہ پائے گا
میں دل میں روؤں گی، آنکھوں میں مسکراؤں گی

لیکن وہ محبت و وفا کی دیوی صرف دل میں ہی نہیں آنکھوں سے بھی رونے لگی۔

''توبے! مجھے میرے بھائیوں کے پاس چھوڑ آ''۔ اس نے شادی کے دوسرے دن روتے ہوئے توبے سے کہا۔ ''آگ کے دریا میں اگلی رات بسر کرنا میرے بس میں نہیں''۔

توبے نے منت سماجت کی۔ ہاتھ جوڑے یہاں تک بھی کہہ دیا۔ ''جنت! اگر تم چلی گئی تو میں دوسری بیوی کو طلاق دے دوں گا''۔

''نہیں، توبے اگر تم نے طلاق دی تو میں اپنے باپ کی شرافت کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ جیتے جی میرا منہ نہیں دیکھ پائے گا''۔ اور پھر پیا کے دیس سے ایسی سدھاری کہ کبھی سسرال کا منہ نہ دیکھا۔

توبے کی فرمائش پر میں بھی جنت کے گاؤں گیا تھا، میں نے بھی اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن جذبات کے سامنے الفاظ کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔

''سرکار! آپ میرے چھوٹے بھائی ہیں''۔ اس نے رندھی آواز میں کہا۔ ''کیا آپ چاہتے ہیں کہ اپنی بہن کو جہنم کے عین وسط میں پھینک دیں''۔

''نہیں، جنت! میں ایسا نہیں چاہتا''۔

''تو پھر آپ ضد نہ کریں، مجھے توبے سے یا اس کی بیوی سے نفرت نہیں۔ توبا اب بھی میرے سر کا سائیں ہے لیکن توبا.....'' اس کی بات حلق میں اٹک گئی پھر اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا۔ ذرا سنبھلی تو میں نے پوچھا کیا ہوا توبے کو؟

سرکار! توبا دو حصوں میں بٹ گیا ہے اور مذہب عشق میں یہ جائز نہیں''۔

''لیکن توبے نے کوئی جرم نہیں کیا''۔ میں نے کہا۔ ''مجبوری کی حالت میں جائز اور شرعی طریقے سے دوسرا نکاح کیا ہے جس میں تمہاری رائے اور کوشش بھی شامل تھی''۔

''یہ ٹھیک ہے سرکار! لیکن دل کا کیا کروں؟'' اس نے کہا۔ ''وہ بھی میری مجبوری تھی لیکن اب یہ بھی میری

مجبوری ہے۔ قوبے سے کہا میں مر جاؤں تو دو ٹک مٹی دے میری قبر تے پا جاوے اور ساتھ یہ بھی کہہ دینا۔

دل وچ ورد اے تے اکھاں وچ اتھرو
سانبھ سانبھ رکھیاں نیں تیریاں نشانیاں
دل تیرے پیار دیاں پاندا اے کہانیاں

اور پھر جنت واقعی کبھی سسرال نہ گئی۔ وہ ٹی بی کی مریضہ بن گئی اور جب مری تو ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکی تھی۔ قوبے کو اللہ نے دو بیٹے عطا کئے۔ آخری عمر میں مذہب کی طرف رجوع ہو گیا اور تبلیغی جماعت کے ساتھ ایک دن ہمارے گاؤں آیا، مجھ سے ملا، میں نے اسے پہچان لیا۔ منہ پر سنت رسول سر پر کپڑے کی سادہ سی ٹوپی، ہاتھ میں تسبیح، کمزور سی صحت۔

''بھائی قوبے! تمہاری صحت تو ٹھیک ہے، بہت کمزور سے ہو گئے ہو''۔

قاری صاحب! سچی بات بتاؤں''۔

''ہاں بھائی!''

''قاری صاحب! جنت کی جدائی نے خون چوس لیا ہے۔ جب جنت کی قبر پر مٹی کے دو ٹک ڈالے تو دل سے آواز آئی او قوبے بتا تجھے کیا حاصل ہوا۔ بس دنیا سے دل اچاٹ ہو گیا۔ اب تبلیغی کام میں مصروف ہو گیا ہوں۔ گھر دل نہیں لگتا ہر وقت جنت کے ایصال ثواب کے لئے قرآن حکیم کی تلاوت اور دعائیں کرتا رہتا ہوں۔ آپ بھی جنت کے لئے دعا کیا کریں اور میری یہ گزارش ہے کہ میرا جنازہ آپ نے پڑھانا ہے''۔

''دیکھ بھائی قوبے! یہ کیا پتہ ہے کہ کون پہلے مرے گا۔ ہاں البتہ میرا تم سے وعدہ ہے کہ اگر میں زندہ رہا اور مجھے اطلاع مل گئی تو میں ضرور تیری بات پر عمل کروں گا''۔

چند ہی سال بعد میں نے اپنے ایک دوست کے ساتھ موٹر سائیکل پر ایک راجباہ کی پٹری پر سفر کر رہا تھا کہ نہر کے قریب قبرستان میں کافی آدمی جمع تھے۔ میں نے اپنے ساتھی سے کہا۔ یار مفت کا ثواب ہے آؤ جنازے میں شامل ہو جائیں۔

''ٹھیک ہے قاری صاحب! ویسے بھی یہ بری بات ہے کہ جنازے کے پاس سے گزر جائیں''۔ ساتھی نے کہا۔

ہم نے موٹر سائیکل کھڑی کی اور قبرستان کے نلکے سے وضو کیا اور میت کا آخری دیدار کرنے کی فرمائش کی۔ ایک بزرگ نے بلند آواز سے کہا۔ ''آؤ جی سو بسم اللہ دیدار کریں''۔ جب اس نے میت کے منہ سے کپڑا اٹھایا تو میں بری طرح چونکا، وہ قوبے پہلوان کی میت تھی۔

''بزرگو! یہ مرنے والا قوبا پہلوان تو نہیں؟''

''ہاں جی، بیٹا جی! یہ قوبا پہلوان ہی ہے''۔ میں نے ایک گہری اور لمبی سانس لی اور ان سے درخواست کی کہ اگر آپ کی اجازت ہو تو اس کا جنازہ میں پڑھا دوں۔ انہوں نے کہا۔ جی، یہ تو مولوی صاحب یا قوبے کے بیٹے ہی اجازت دے سکتے ہیں۔ اتنے میں مولوی صاحب اور قوبے کے دونوں لڑکے ہمارے قریب آ گئے تو میں نے ان سے قوبے کی خواہش کا اظہار کیا۔

''چاچو! آپ کا نام کیا ہے؟'' میں نے انہیں اپنا نام بتایا تو وہ دونوں مجھ سے لپٹ گئے اور کہنے لگے۔ ''چاچو! ہمارے ابا نے ہمیں وصیت کی تھی کہ میں جب مروں تو میرا جنازہ آپ پڑھائیں''۔

''ہاں بیٹا! تمہارے ابو نے مجھے بھی اپنی زندگی میں کہا تھا''۔ میں نے کہا۔ ''لیکن پھر تم نے مجھے اطلاع کیوں نہیں دی؟''

''چاچو! ہمیں آپ کا نام تو یاد تھا لیکن ہم آپ کے گاؤں کا نام بھول گئے تھے''۔

''لیکن مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے قوبے مرحوم کا گاؤں تو ادھر نہیں ہے''۔

''ہاں، چاچو! آپ ٹھیک کہتے ہیں، یہ ہمارے

ننھیال ہیں"۔ اس نے کہا۔ "ہمارے ابو نے یہ وصیت بھی کی تھی کہ ہم اُسے اپنی بڑی والدہ کی قبر کے ساتھ دفن کریں"۔

میرے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا میں نے پوچھا۔ تمہاری بڑی والدہ کا نام کیا تھا؟

"چاچو! ان کا نام جنت تھا"۔ لڑکے نے کہا۔ "ہمارے ابو نے دو شادیاں کی تھیں، جنت کو ہم بڑی اماں کہا کرتے تھے"۔

میں نے جنازہ پڑھا اور پھر قوبے کو جنت کے پہلو میں دفن کر دیا گیا پھر میں نے جونہی دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو پتہ نہیں کیا ہوا میری آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا اور میری آواز بھرا گئی۔ میں نے اتنی رقت اور توجہ سے دعا کی کہ اس وقت موجود کوئی آنکھ ہو گی جو بہہ نہ نکلی ہو۔ میری عجیب کیفیت ہو گئی تھی میری زبان پر بے اختیار یہ شعر آ گیا۔

لے اوئے یار! حوالے رب دے، میلے چار دناں دے
اُس دن روز قیامت ہوسی جس دن فیر ملاں گے

جنت کی قبر مشرق کی طرف تھی اور اس کے ساتھ قوبے کی قبر مغرب کی طرف تھی۔ میں نے جنت کی قبر پر علیحدہ سے دوبارہ دعا مانگی۔ دونوں لڑکوں نے ڈھیر سارے پھول جنت کی قبر پر بکھیر دیئے پھر میں نے دونوں بچوں کو پیار کیا اور واپسی کی اجازت چاہی۔ وہ بڑی ہی مشکل سے مانے کیونکہ میرے پاس معقول بہانہ تھا جو میں نے ان کے سامنے بیان کیا۔ جب ہم راجباہ کے پُل کے پاس آئے تو مجھے یاد آ گیا کہ اسی پُل سے گزر کر میں جنت کے گاؤں گیا تھا لیکن اس وقت میں گھوڑی پر سوار ہو کر گیا تھا۔ جاتی دفعہ ہم یہیں سے گزر کر گئے تھے لیکن اس وقت مجھے یاد نہیں رہا تھا کہ اِدھر جنت کا گاؤں ہے۔ پھر میں نے ساتھ والے لڑکے کو قوبے اور جنت کی کہانی سنائی تو وہ یہ کہانی سن کر بہت محظوظ ہوا لیکن کہانی کے انجام سے پریشان ہو گیا۔

اندھے جذبات

اب میں پھر نذیر کی رُوداد کی طرف آتا ہوں۔

نذیر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ موت کے منہ میں پہنچ کر میں بچ نکلا تھا۔ اس وقت میں نے ارادہ کر لیا کہ آئندہ جنت کے بارے میں سوچوں گا بھی نہیں لیکن کچھ ہی عرصے بعد دوبارہ جنون میں مبتلا ہو گیا اور ایک دن شام کے بعد گنڈاسہ لے کر قوبے کے گاؤں کی طرف چل پڑا۔ قاری صاحب! جب میں یہ باتیں سوچتا ہوں تو اپنی بے وقوفی پر حیران ہوتا ہوں۔ میں بڑی احتیاط کے ساتھ تیز رفتاری سے چلا جا رہا تھا۔ جب میں جنت کے دروازے کے پاس پہنچا اور ہاتھ کے ساتھ دروازے کو دھکیلا تو دروازہ بند تھا کہ اچانک کسی نے زوردار ڈنڈ میری گردن پہ مارا کہ میں قلابازیاں کھاتا ہوا گلی میں دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ گنڈاسہ میرے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔ میں جلدی سے اٹھ کر سنبھلا اور دوڑ لگا دی۔ کوئی آدمی میرے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ رات کے اندھیرے میں راستے کا کوئی پتہ نہیں چل رہا تھا۔ گاؤں سے کافی دور آ کر مجھے کسی نے آواز دی۔ نذیر ٹھہر جا۔ میں نے پہچان لیا آواز رکھے کی تھی۔ میں ٹھہر گیا۔

"رکھے! تُو یہاں کیسے آ گیا؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"پہلے تجھے بتانا ہو گا تُو یہاں کیوں آیا ہے؟" رکھے نے سخت لہجے میں پوچھا۔ "اور رات کے اس اندھیرے میں تیرا کیا مقصد تھا؟"

"دیکھ رکھے! یہ میرا ذاتی معاملہ ہے"۔ میں نے کہا۔ "بہتر ہے تُو اس کو رہنے دے"۔

"نہیں نذیر! تمہیں بتانا ہو گا"۔ رکھے نے کہا۔

"میں کئی دن سے تیرے طور طریقے چیک کر رہا تھا"۔

مجھے تم پر شک سا ہو گیا تھا کہ تیرے دل میں کوئی بات ہے جس نے تجھے پریشان کر رکھا ہے۔ اسی لئے آج شام کے بعد جب تُو خانقاہ سے نکلا تو میں کچھ فاصلے پر رہتے ہوئے تیرے پیچھے چل پڑا تھا اور پھر تُو نے جب یہ دروازہ ٹٹولا تو میں نے غصے میں آ کر تمہیں ڈنڈا لگایا۔ مجھے بتا یہ کس کا گھر ہے اور تُو یہاں کیا لینے آیا تھا، تیرا مقصد کیا تھا؟''

ظاہر ہے میں رکھے سے سچی بات نہیں کر سکتا تھا۔ اب مجھے اس پر غصہ آ رہا تھا ورنہ آج رات میں توبے کو ضرور قتل کر دیتا اور پھر میاں اکرام مجھے جنت کا مالک بنا دیتا اور جب مجھے جنت مل جاتی تو مجھے نہ رکھے کی پروا تھی نہ رکھے کی، شعبدہ بازیوں کی ضرورت۔ مجھے خاموش دیکھ کر رکھے نے بااصرار مجھ سے پوچھنا شروع کیا۔

''دیکھ رکھے! اس گھر میں وہ آدمی رہتا ہے جس نے میری بیوہ ماں کے ساتھ زیادتی کی تھی''۔ میں نے اسے بتایا۔''میں نے تجھے بتایا تھا کہ میری ماں شادی کے دو سال بعد ہی بیوہ ہو گئی تھی۔ میری ماں نے مجھے وصیت کی تھی کہ اس آدمی سے بدلہ ضرور لینا اور آج میں اسے قتل کرنے کے ارادے سے آیا تھا لیکن تُو نے کام بگاڑ دیا''۔

''اچھا، یہ بات ہے''۔ رکھے نے میری رام کہانی پر یقین کرتے ہوئے کہا۔''دیکھ نذیرا! اگر تُو مجھ سے مشورہ کر لیتا تو یہ کام کوئی اتنا مشکل نہیں تھا۔ خیر، ابھی کچھ نہیں بگڑا چل میں تیرے ساتھ چلتا ہوں''۔

''نہیں رکھے! میرا گنڈاسہ کہیں گر گیا ہے''۔ میں نے بہانہ کیا۔''ویسے بھی گلی میں ہمارے بھاگنے کی وجہ سے لوگ جاگ گئے ہوں گے۔ اب اس کام کو کسی اور وقت پر اٹھا رکھتے ہیں''۔

''ٹھیک ہے جیسے تیری مرضی''۔ رکھے نے آہستہ سے کہا پھر ہم واپس خانقاہ کی طرف چل پڑے۔ جب ہم نہر کے پُل پر پہنچے تو رکھے نے میرے ہاتھ کو زور سے دبایا اور آہستہ سے کہنے لگا۔ نذیرا! نیچے بیٹھ جا پھر وہ پُل سے مشرق کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ مجھے بھی اندھیرے میں کچھ ہیولے دکھائی دے رہے تھے۔

''نذیرا! ایک گھوڑی اور دو یا تین آدمی ہیں''۔ رکھے نے کہا۔''میرے خیال میں یہ کوئی وارداتیے معلوم ہوتے ہیں''۔

ہم نے دوسری طرف جانا تھا یہ لوگ ہمارے راستے سے ہٹ کر تھے۔ پھر ایسا محسوس ہوا کہ وہ دو ہیولے ایک آدمی کو ٹانگوں اور بازوؤں سے پکڑ کر نہر کے کنارے پر لے آئے پھر ہمارے کانوں میں کسی عورت کے کراہنے کی آواز آئی۔ گھوڑی بار بار بدک رہی تھی۔ شاید اس کی باگ کسی درخت کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔

''نذیرا! یہاں قتل کی واردات ہونے والی ہے''۔ رکھے نے سرگوشی کی۔''یہ کوئی عورت ہے جس کو قتل کر کے نہر میں بہانے کا پروگرام بن رہا ہے۔ اگر تم بہادر بنو اور میرا ساتھ دو تو ہم ایک جان بچا سکتے ہیں''۔

''ٹھیک ہے رکھے! میں تیار ہوں''۔ میں نے کہا۔

''اوئے تم کون ہو؟'' رکھے نے بلند آواز سے کہا۔

''ان کو پکڑ لو بھاگنے نہ پائیں''۔ میں نے بھی بلند آواز سے کہا۔

ان آدمیوں نے عورت کو وہیں چھوڑا اور بھاگ کر گھوڑی پر سوار ہونے کی کوشش کی۔ پیشتر اس کے کہ وہ فرار ہوتے رکھے نے گھوڑی کی باگ پکڑ لی۔

''نیچے اترو!'' رکھے نے تحکم سے کہا۔''ہم پولیس والے ہیں، ہم تمہیں گولی سے اڑا دیں گے''۔ وہ دونوں نیچے اتر آئے اور ہماری منت ساجت کرنے لگے کہ چوہدری صاحب ہمیں گولی نہ مارنا۔

''سچ سچ بتاؤ تم یہاں کیا کرنے آئے ہو؟'' رکھے نے کڑک کر پوچھا۔

''جناب! ہم پیشہ ور قاتل ہیں''۔ ایک آدمی نے کہا۔ ''ہم اس عورت کو قتل کر کے نہر میں بہانے والے تھے ہمیں معاف کر دیا جائے، ہم نے کوئی گناہ نہیں کیا عورت زندہ ہے''۔

''اس عورت کو کہاں سے لائے ہو اور یہ کون ہے؟''

''جناب! یہ گاؤں سے لائے ہیں اور یہ چوہدری رمضان کی لڑکی ہے''۔ میں بُری طرح سے چونکا چوہدری رمضان رابعہ کا والد تھا۔

''تمہیں یہ کس نے کہا کہ اس لڑکی کو قتل کر دو؟'' میں نے پوچھا۔

''چوہدری امان اللہ کی والدہ نے''۔ انہوں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ چوہدری امان اللہ رابعہ کا خاوند تھا جسے رابعہ کے بھائیوں نے قتل کر دیا تھا اور جس کے نتیجے میں رابعہ کے ایک بھائی کو پھانسی ہوگئی تھی اور ایک کو عمر قید۔ ظاہر ہے ہم خود مجرم تھے ہم انہیں کیا کہہ سکتے تھے۔

''تمہارے پاس کتنی رقم ہے؟'' رکھے نے ڈپٹ کر پوچھا۔

''دس ہزار''۔ اس نے کہا۔ ''دس ہزار ہمیں کام کرنے کے بعد ملنے تھے''۔

''نکالو پیسے''۔ رکھے نے غراتے ہوئے کہا۔ دس ہزار اس وقت بہت بڑی رقم تھی۔ انہوں نے روپے ہمارے حوالے کیے اور رکھے نے کہا۔ چلو گھوڑی پر سوار ہو جاؤ اور نو دو گیارہ ہو جاؤ۔ عورت اب زور زور سے کراہنے لگی تھی۔ ہم نے اس کے قریب گئے شاید اس کے حواس کچھ بحال ہو گئے تھے۔ اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

''ظالمو! مجھے نہ مارو، میرا کیا قصور ہے؟''

''رابعہ! ہوش کرو، میں ہوں نذیر۔ تمہارے دشمن بھاگ گئے ہیں''۔ رابعہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''نذیر تم یہاں کیسے؟''

''بس، رابعہ! تیری زندگی ابھی باقی تھی''۔ میں نے کہا۔ ''اللہ نے کرم کیا اگر ذرا دیر ہو جاتی تو تم اس وقت تک اگلے جہان ہوتی۔ مجھے بتاؤ یہ سب کیسے ہوا؟''

''میں نوراں کے ساتھ شام کے بعد حوائج ضروریہ کے لئے کھیتوں میں گئی تو اچانک دو آدمیوں نے ہمیں قابو کر لیا''۔ رابعہ بتانے لگی۔ ''پتہ نہیں نوراں زندہ ہے یا مر چکی ہے پھر انہوں نے مجھے گھوڑی پر لادا اور گھوڑی دوڑا دی شدت خوف سے میں بیہوش ہو گئی تھی۔ بس مجھے اتنا ہی پتہ ہے''۔

''رابعہ! یہ واردات جاگیردارنی نے کرائی ہے''۔ میں نے اسے کہا۔ ''اس نے تمہیں قتل کرانے کے لئے بیس ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اگر ہم یہاں قریب موجود نہ ہوتے تو قاتل اپنا کام کر چکے ہوتے''۔

''نذیر یہ تیرے ساتھ کون ہے؟''

''رابعہ یہ رکھا ہے۔ موتیوں والی سرکار''۔

''کیا تم بھی کسی واردات پر گئے ہوئے تھے؟''

''ہاں، یونہی سمجھ لے۔ اٹھ اب تُو ہمارے ساتھ خانقاہ پر چل صبح ہم تمہیں تیرے گاؤں پہنچا دیں گے''۔

''نہیں، نذیر! مجھے ابھی گاؤں چھوڑ کے آؤ، میرا بچہ اکیلا ہے۔ ویسے بھی میرے بھائی میری تلاش میں ہوں گے''۔

''لیکن رابعہ تمہارا گاؤں تو یہاں سے کافی دور ہے اور ہمارے پاس اِدھر گھوڑی وغیرہ کا انتظام بھی نہیں ہے''۔

ابھی ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ہمیں دور سے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں آنی شروع ہوئیں جو آہستہ آہستہ ہماری طرف بڑھ رہے تھے غالباً وہ نہر کی پٹری پر آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک دو کے پاس

ٹارچیں بھی تھیں، وہ ہمارے قریب آ کر رک گئے اور تحکم سے بولے۔ اوئے تم کون ہو؟ رابعہ نے آواز پہچان لی وہ آگے بڑھی اور روتے ہوئے کہنے لگی۔ ویرا! میں رابعہ ہوں۔ گھوڑ سوار گھوڑی سے اترا اور بھاگ کر رابعہ کو کلاوے میں لے لیا۔ بے اختیار اس کی بلکیں نکل گئیں۔

"اوئے تم کون ہو؟" ایک گھوڑ سوار سے ہم سے پوچھا۔

"ویرا! انہوں نے مجھے ان ظالموں سے بچایا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتے تو وہ ظالم مجھے قتل کر کے نہر میں بہا چکے ہوتے"۔

پھر انہوں نے ہم سے تفصیل پوچھی تو ہم نے انہیں سب کچھ بتا دیا۔

"ہمیں پہلے ہی یہی شک تھا۔ ہم اس بوڑھی کی تکا بوٹی کر دیں گے"۔ ایک نوجوان نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

میں رابعہ کے بھائیوں کو پہچان گیا تھا لیکن وہ مجھے پہچان نہیں سکے تھے۔ انہوں نے ہمارا شکریہ ادا کیا اور گھوڑیوں پر سوار ہو کر واپس اپنے گاؤں کی طرح چلے گئے تھے۔ مجھے ایک انجانی سی خوشی محسوس ہوئی۔ رابعہ کا قتل میرے لئے زندگی کا روگ بن جاتا۔

جب ہم واپس خانقاہ پر پہنچے تو میاں اکرام وہاں موجود تھا۔ وہ شام کے بعد ہمارے جان کے ذرا بعد خانقاہ پر آیا تھا۔ وہ اپنے سفلی علوم کی وجہ سے جان گیا تھا کہ ہمارے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ پھر جب رکھا اپنے حجرے میں چلا گیا تو میاں اکرام میرے پاس بیٹھ گیا۔

"جنت تیری قسمت میں نہیں ہے نذیر!" اس نے کہا۔ "تُو اس کے عشق میں خواہ مخواہ پھنس گیا ہے۔ اگر اُس دن تُو ناجے کو بیہوش کر کے بھاگ نہ آتا تو تجھے عشق کا خمیازہ بھگتنا پڑتا۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ اس کے عشق سے توبہ کر لے ورنہ کسی وقت بڑا نقصان اٹھائے گا"۔

"لیکن کیا اگر میں توبے پہلوان کو قتل کر دوں تو پھر بھی کچھ نہیں ہوگا؟"

"دیکھو نذیر! تم توبے کو قتل نہیں کر سکو گے"۔ اس نے کہا۔ "تمہارے لئے ہر حال میں بہتر یہی ہے کہ خیال دل سے نکال دو"۔

"ٹھیک ہے، میں کوشش کروں گا"۔ میں نے کہا۔

اسے ضرور پڑھیں

سعادت علی، قرۃ العین اور اکرام یہ تینوں سفلی علوم پر کچھ نہ کچھ دسترس رکھتے تھے۔ سعادت علی کے استاد کے بارے میں نذیر کچھ نہیں جانتا تھا۔ قرۃ العین اور اکرام سعادت علی کے شاگرد تھے۔ سعادت علی نے اکرام سے ہر وہ کام کرایا جس کا ایک مسلمان تصور بھی نہیں کر سکتا۔ شرک، معصوم بچوں کا قتل، محرمات سے زنا، قرآن حکیم کی بے حرمتی، شعائر اللہ کی ہتک اور ان سب کبیرہ گناہوں کے بدلے میں اُسے ملا کیا۔ صرف یہ کہ وہ بعض ایسے علوم جان گیا جس سے بظاہر لوگ متاثر ہو جایا کرتے تھے جن کا میں پیچھے ذکر کر چکا ہوں۔

وہ علوم کیا تھے؟ تو معزز قارئین وہ محض دھوکہ تھے وہ شیاطین کا ساتھی بن گیا جس طرح خود سعادت علی ان کا ساتھی تھا۔ شیطان نے ان سے ایمان کا سودا کر لیا تھا اور وہ آخرت برباد کر چکے تھے۔ اب شیطان ان کو بعض باتیں بتلا دیا کرتا جو عام حالات میں عام آدمی نہیں جان سکتا۔ جنات ان کے ساتھ سرگوشی کرتے اور وہ سائل کا نام اس کے خاندان کے لوگوں کے نام، گاؤں کا نام، متعلقہ کام کے بارے میں حیران کن معلومات بتا دیتے۔ بعض گم شدہ چیزوں کی نشاندہی بھی کر دیتے۔ اب بھی پاکستان میں کئی عامل حضرات ایسا کرتے ہیں اور سادہ لوح لوگوں کو متاثر کر کے اپنی اولیائی اور غیب دانی کا دعویٰ

کرتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کو اس حقیقت سے باخبر کر دوں تا کہ آپ صحیح راستے سے بھٹک نہ جائیں اور ان شیطان کے چیلوں کے چکر میں نہ آ جائیں۔ پہلے تو آپ یہ عقیدہ پختہ کر لیں کہ غیب جاننا در شہ خداوندی ہے۔ مسلمانوں میں کسی مسلک کا بھی یہ عقیدہ نہیں ہے کہ سوائے خدا تعالیٰ کے کوئی غیب دان ہو سکتا ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کرام علیہم السلام کو جتنا چاہتا ہے غیب کا علم عطا کر دیتا ہے۔ ذاتی علم غیب صرف اللہ کو ہے اور یہ خاصہ باری تعالیٰ ہے۔ عطائی طور پر بعض اخبار غیبیہ ماضویہ یا بعض اخبار استقبالیہ انبیاء کرام کو ہو سکتی ہیں۔ برکت کے لئے صرف چند حوالے قرآن کریم سے ملاحظہ فرمالیں۔

"فرما دیجئے اے پیغمبر (ﷺ) نہیں جانتا جو کوئی بھی ہے بیچ آسمانوں کے اور زمین کے غیب، مگر صرف اللہ تعالیٰ اور نہیں شعور رکھتے کب دوبارہ اٹھائے جائیں گے"۔ (پارہ 20 سورہ نمل آیت 65)

رسول اللہ کو مخاطب کر کے آپ سے علم غیب ذاتی کی نفی کی گئی چند حوالے لکھ دیتا ہوں براہ کرم ضرور ملاحظہ فرمائیں۔

پارہ 3 سورہ آل عمران آیت 44، پارہ 12 سورہ یوسف آیت 3، پارہ 20 سورہ قصص آیت 44-45، پارہ 21 سورہ عنکبوت آیت 48، پارہ 25 سورہ شوریٰ آیت 52، پارہ 12 سورہ قصص آیت 86، پارہ 12 سورہ ہود آیت 49، پارہ 13 سورہ یوسف آیت 102، پارہ 9 سورہ اعراف آیت 188، پارہ 7 سورہ انعام آیت 50، پارہ 12 سورہ ہود آیت 123۔ اس کے علاوہ بھی بے شمار حوالے ہیں۔ بہر حال اتنے آپ ضرور ملاحظہ فرمائیں۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر بعض عامل حضرات بعض غیبی باتوں کا علم کیسے حاصل کرتے ہیں؟ یا نجومی حضرات کے دعوے کہ جو چاہو سو پوچھو اور کچھ باتیں بتا بھی دیتے ہیں۔

تو جناب یہ سارا کمال ان جنات کا ہے جن کے ساتھ ان کے تعلقات ہوتے ہیں اور ان کو راضی کرنے کے لئے بڑے سے بڑا گناہ کر کے اور ایمان بیچ کر ان کا اعتماد حاصل کرتے ہیں۔ اب پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ جنات کو یہ غیب کی باتیں کہاں سے مل جاتی ہیں۔ کیا وہ غیب دان ہیں؟ جواب یہ ہے کہ جناب ہرگز غیب نہیں جانتے البتہ اُن کے پاس کچھ ایسے وسائل ہیں جن کے ذریعے انہیں بعض باتوں کا پتہ چل جاتا ہے۔ مختصراً ملاحظہ فرمائیں۔

(1) خدائی فیصلے سے کچھ اُچک لینا

اللہ تعالیٰ آسمانوں پر ایسے فیصلے اور حکم جاری کرتے ہیں جن کا تعلق ہماری اس مادی کائنات اور اس کے مکینوں سے ہوتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کوئی حکم یا فیصلہ جاری فرماتے ہیں تو فرشتے اس حکم کو سننے کی تاب نہ لاتے ہوئے بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ سب سے پہلے حضرت جبرائیل سر اٹھاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اُن کی طرف وحی کر کے اپنا فیصلہ سناتے ہیں۔ پھر حضرت جبرائیل پہلے آسمان کے فرشتوں کو اس فیصلے یا حکم سے آگاہ کرتے ہیں۔ پھر وہ فرشتے اپنے سے نیچے دوسرے آسمان کے فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے حکم یا خبر سے آگاہ کرتے ہیں۔ پھر وہ فرشتے اپنے سے نیچے آسمان کے فرشتوں کو اور وہ اپنے سے نیچے والوں کو۔ اس طرح آخری آسمان (جسے دنیوی آسمان کہا جاتا ہے) کے فرشتوں تک وہ فیصلہ یا خبر پہنچ جاتی ہے۔ اس طرح ایک طرف آسمان دنیا کے فرشتوں میں اللہ کا وہ فیصلہ یا حکم (جو اس کائنات سے تعلق رکھتا ہے) گردش کر رہا ہوتا ہے جبکہ دوسری طرف سے شیاطین و جنات اس خدائی فیصلے اور حکم کو چوری چھپے سننے کے لئے زمین سے ایک قطار بنا کر آسمان دنیا تک

پہنچے ہوتے ہیں اور وہاں چھپ کر یہ سننے کی کوشش کرتے ہیں کہ فرشتے آپس میں کون سی باتیں کر رہے ہیں۔ جب ان جنوں اور شیطانوں کی قطار میں شامل سب سے اوپر والا جن کوئی بات سننے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو وہ فوراً اپنے سے نیچے والے جن کو اس سے آگاہ کر دیتا ہے اور وہ آگے اپنے سے نیچے والے شیطان کو وہ بات بتاتا ہے اور اس طرح سب سے نیچے زمین پر موجود جن و شیطان تک وہ بات پہنچ جاتی ہے جس کا تعلق اس کائنات کے کسی پیش آمدہ مسئلہ پر ہوتا ہے پھر یہ شیطان و جنات بعض کاہنوں، عاملوں کو اس خدائی فیصلے سے آگاہ کر دیتے ہیں جو آئندہ کسی بھی وقت رُونما ہونے والا ہوتا ہے۔

دیکھئے بخاری شریف کتاب التفسیر باب الامن، ابوداؤد حدیث نمبر 3989، ترمذی حدیث 3223، ابن ماجہ حدیث 194، ابن حبان حدیث 36، حمیدی حدیث 1151۔

پھر یہ جنات اپنے متبعین کو خدائی فیصلوں سے آگاہ کرتے ہیں اسے وحی شیطانی کہا جاتا ہے قرآن مجید میں اس وحی شیطانی کا ذکر اس انداز سے ملتا ہے۔

ترجمہ: اس طرح ہم نے شیطان صفت انسانوں اور جنوں کو ہر نبی کا دشمن بنایا جو دھوکہ دینے کی غرض سے کچھ خوش آئند باتیں ایک دوسرے کے کانوں میں پھونکتے رہتے ہیں۔ (سورہ انعام آیت 112)

اس بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے مندرجہ ذیل آیات بھی دیکھ لیں۔

سورہ الجن آیت 8تا10، سورہ الصفات آیت 6 تا 10، سورہ الحجر آیت 17 تا 18۔

نبی کریم کی بعثت کے بعد جنات کی آزادانہ نقل و حرکت ختم ہوگئی مگر آج بھی ان کی کوشش جاری ہے۔ اب انہیں زیادہ تر ناکامی اور ہلاکت ہی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے باوجود وہ باز نہیں آتے کیونکہ اس کے ذریعے وہ کاہنوں اور عاملوں کو کفر و شرک کا مرتکب بنا کر اپنے مقصد کی تکمیل کرتے ہیں اور پھر وہ کاہن یا عامل حضرات مزید آگے لوگوں کے ایمان برباد کرتے ہیں اور لوگوں کو گمراہی کی راہ پر لگانا اور جہنم کا ایندھن بنانا ہی ان شیطانوں کا سب سے بڑا مشن ہے۔ جس کے لئے وہ جان جوکھوں میں ڈال کر آسمانوں سے خبریں چرا کر لاتے ہیں اور پھر ان عاملوں اور جادوگروں وغیرہ کی طرف ان خبروں کو وحی کرتے ہیں۔ یہ چونکہ ایک انتہائی اہم اور خطرناک طریقہ ہے اور یہی ان عاملوں کی شہرت اور عوام کی حماقت کا سب سے بڑا سبب بھی ہے اسی لئے آنحضرتؐ نے بڑی سختی سے ایسے لوگوں کے پاس جانے سے روک دیا۔ فرمان نبویؐ ہے۔

ترجمہ: جو شخص کسی کاہن کے پاس جائے اور اس کی تصدیق کرے تو اس نے اس (دین) کا کفر کیا جو محمد (ﷺ) پر نازل ہوا ہے۔ (مجمع الزوائد، مسند بزار، طبرانی، ابن ہیثمی نے اس کی سند کے راویوں کو ثقہ قرار دیا ہے)

آج کل تو ہر شہر ہر گاؤں میں اس قسم کے لوگ دندناتے پھر رہے ہیں ستم یہ ہے ٹی وی پر باقاعدہ ان کے انٹرویوز نشر کیے جاتے ہیں اور ان کے بلند بانگ دعوے سن کر میں ورطۂ حیرت میں گم ہو جاتا ہوں۔

(2) سرعتِ رفتار

جنات و شیاطین کو جس سرعت رفتار سے نوازا گیا ہے وہ انسانوں کو حاصل نہیں۔ قرآن مجید میں حضرت سلیمان کے واقعہ میں مذکور ہے۔ دیکھیں قرآن۔

ترجمہ: جب آپ (سلیمان) نے کہا اے سردارو! تم میں سے کوئی ہے جو ان (یعنی اہل یمن) کے مسلمان ہو کر پہنچنے سے پہلے ہی اس (ملکہ یمن) کا تخت مجھے لا دے؟ ایک قوی ہیکل جن کہنے لگا کہ آپ کے اپنی مجلس

سے اٹھنے سے پہلے ہی میں اسے آپ کے پاس لا دیتا ہوں اور یقین مانیے کہ میں اس پر قادر ہوں اور ہوں بھی امانتدار۔ (سورۃ النمل آیت 38،39)

کہا جاتا ہے کہ حضرت سلیمان اس وقت یروشلم میں تھے اور وہاں سے ملکہ سبا کا تخت تقریباً دو ہزار کلو میٹر دور تھا اور تھا بھی بہت وزنی مگر قوی ہیکل جن نے کہا کہ میں آپ کی یہ مجلس برخاست ہونے سے پہلے پہلے یہ تخت آپ کی خدمت میں حاضر کر سکتا ہوں۔ ظاہر ہے یہ کام ایک انسان بغیر مادی اسباب کے نہیں کر سکتا مگر جنوں کو اتنی سرعت رفتار اور قوت وطاقت سے نوازا گیا ہے۔

(3) نظر نہ آنا

جنات ایک ایسی مخلوق ہے جو ہمیں نظر نہیں آتی۔ یہ بات بھی قرآن مجید سے ثابت ہے۔

ترجمہ: وہ (شیطان) اور اس کا قبیلہ تمہیں وہاں سے دیکھتا ہے جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھ سکتے۔

(سورہ اعراف آیت نمبر 28)

اب اگر کوئی سائل کسی عامل کے پاس گیا اور اس عامل کا رابطہ جن سے ہے تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جن اپنی خداداد طاقت، سرعت رفتار اور نظر نہ آنے کی سہولت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عامل کو آپ کی بعض خفیہ باتیں بتا دے گا اور عامل آپ کے نام، گاؤں اور کام سے واقف ہو جائے گا یا بعض گم شدہ چیزوں کی اطلاع دے دے گا۔

ذاتی تجربہ

جن لوگوں نے میری کہانی "پُراسرار عورت" پڑھی ہے اس میں بھی میں نے بعض واقعات لکھے ہیں جو ذاتی طور پر خود میرے ساتھ پیش آئے۔ مجھے مریضوں کے حالات سے آگاہی ہو جاتی تھی اور پُراسرار عورت باقاعدہ میرے کان میں سرگوشی کرتی تھی۔ اس زمانے میں کئی گمشدہ چیزیں میری نشاندہی پر برآمد ہوئی تھیں لیکن اکثر اوقات اس کی اطلاع غلط ہوتی تھی۔ جہاں تک میرا علم اور تجربہ ہے ایسا اس لئے ہوتا تھا تو اُسے خود ان گمشدہ چیزوں کے بارے میں اطلاع نہیں ہوتی تھی اور وہ انکل پچو یا جھوٹ بول دیتی تھی۔ ہاں البتہ جن جو چیز خود مشاہدہ کر کے آئے اور عامل کو اطلاع دے تو وہ عموماً ٹھیک ہوتی ہے اسی لئے جو عامل فال وغیرہ ڈالتے ہیں کبھی نہ کبھی اُن کی کوئی نہ کوئی اطلاع بالکل درست ہوتی ہے۔ ورنہ عموماً جھوٹی نکلتی ہے۔ اگر ان کی ہر بات ہی سچی ہوتی ہوتو پھر بڑی بڑی خفیہ ایجنسیوں پر بھاری بھرکم بجٹ خرچ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں رہتی، بس ہر تھانے میں ایک عامل بھرتی کر لیا جائے جو جن کو حاضر کرے اور پولیس مجرم کو پکڑ کر لے آئے۔

میرا خیال ہے اب آپ ساری صورت حال کو سمجھ چکے ہوں گے۔ ایسے لوگ نہ ولی ہوتے ہیں نہ خدارسیدہ بزرگ بلکہ محض جنات کو خوش کر کے اور منکرات وفواحش میں مبتلا ہو کر اپنا دین اور ایمان برباد کر کے چند شعبدے سیکھ لیتے ہیں اور مخلوقِ خدا کو گمراہ کرتے ہیں۔ یہاں میں یہ بات حلفاً کہتا ہوں کہ میں نے پراسرار عورت کو قابو کرنے کے لئے کوئی چلہ وغیرہ نہیں کیا تھا۔ بس وہ مجھے گمراہ کرنا چاہتی تھی لیکن خدا کے فضل اور قرآن وحدیث کے علوم کی برکت سے اللہ نے مجھے اپنی پناہ میں رکھا۔ نہ وہ میرے قبضہ میں تھی نہ جن کسی کے قبضہ میں رہ سکتا ہے۔ جو شخص بھی جنوں کو اپنے قبضہ میں رکھنے کا دعویدار ہے وہ بہت بڑا فریبی ہے۔ ہاں یہ علیحدہ بات ہے کوئی جن کسی شخص کی اطاعت کرتا ہے تو وہ اس کے قبضہ میں ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی رضامندی سے کرتا ہے یا اسے گمراہ اور جہنمی بنانے کے لئے اس سے بڑے بڑے گناہ سرزد کرا کے اس کی بعض باتیں مان لیتا ہے جیسا کہ

رکھے، نذیر، قرۃ العین، سعادت علی اور اکرام کے واقعات آپ پیچھے پڑھ آئے ہیں۔ کہانی کے اختتام تک مزید حقائق آپ کے سامنے آجائیں گے۔

جنات کی انسانوں کے ساتھ تعلق کی ایک اور قسم

غازی عزیز مبارکپوری اپنی کتاب "جادو کی حقیقت" کے صفحہ 368 پر رقمطراز ہیں کہ اُن کے والد شیخ محمد امین اثری الرحمانی اور تایا شیخ حکیم عبدالسمیع شفاء اثری سے سنا ہے کہ ان کے دادا محدث شہر علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوری اپنی کتاب "تحفۃ الاحوذی" شرح جامع ترمذی اکثر رات کو وہ کمرہ چھوڑ کر گھر آجایا کرتے تھے جسے آپ نے تصنیف وتالیف کے لئے مختص کر رکھا تھا اور کہتے تھے کہ ان کے تلامذہ (جو جنات تھے) انہیں سونے نہیں دیتے۔ باری باری کوئی تسر دباتا ہے تو کوئی پیر منع کرنے کے باوجود وہ نہیں مانتے۔

اس ضمن میں ایک اور واقعہ لکھتے ہیں کہ دادا کے بعض عرب اور دور دراز کے علاقوں سے تعلق رکھنے والے غیر عرب شاگرد اپنے اہل وعیال کا خط کچھ عرصہ نہ پاکر افسردہ ہوتے تو دادا ان سے کہتے کہ رات کو سوتے وقت اپنے تکیہ کے نیچے لفافہ پر پتہ لکھ کر اس میں ایک سادہ کاغذ رکھ کر سو جانا اور پھر وہ جنوں میں سے اپنے کسی شاگرد کو حکم دیتے تھے کہ وہ اس کے گھر سے خیریت معلوم کر کے لائے۔ صبح تکیہ کے نیچے لفافہ میں اس شخص کے اہل خانہ کی اصل تحریر میں لکھا خیریت کا خط ملتا جب راقم نے دادا کے ایک معروف عرب شاگرد ڈاکٹر محمد تقی الدین الہلالی المراکشی سابق استاد جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے مدینہ النبی میں ایک ملاقات کے دوران اس بارے میں استفسار کیا تو آپ نے نہ صرف ان واقعات کی تائید کی بلکہ متعدد بار اپنے اور دادا کے دوسرے تلامذہ مثلاً شیخ عبداللہ القویعی الندی وغیرہ کے ذاتی تجربات مشاہدات کی حکایت بھی کی۔

میرے استاد محترم جناب مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامی بادشاہی مسجد لاہور کی خطابت سے پہلے گوجرانوالہ میں جمعہ پڑھایا کرتے تھے ان کا کہنا تھا کہ کئی جنات میری اقتدا میں جمعہ پڑھتے ہیں۔ ایک دن میں نے عرض کی کہ میں جنات کو دیکھنا چاہتا ہوں تو فرمانے لگے کہ جب میں نماز سے فارغ ہو کر واپس آنے لگوں تو تم میرے ساتھ ساتھ رہنا چونکہ لوگوں کو ایک کثیر تعداد آپ سے مصافحے کے لئے ہاتھ ملاتی تو فرمانے لگے کہ جس سے میں ہاتھ ملاؤں تم بھی اس سے ہاتھ ملانا اور اچھی طرح سے ہاتھ کو دبانا جس کے ہاتھ میں ہڈی نہیں ہوگی بلکہ صرف گوشت کا لوتھڑا ہوگا بس وہی جن ہوگا اور اس کی آنکھوں میں مقناطیسیت بھی ہوگی چنانچہ کئی دفعہ ایسا اتفاق ہوا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

لیکن یہ باتیں آپ محض ایف ایس سی سائنس اور چار سالہ میڈیکل سائنس کا کورس کر کے معلوم نہیں کر سکتے۔ اس کے لئے قرآن وحدیث کا مکمل علم اور بے تحاشا مطالعہ اور وسیع تجربے کی ضرورت ہے۔

میاں اکرام کا انجام

چونکہ اکثر جادوگر بُرے انجام کا ہی شکار ہوتے ہیں، اکرام بھی اپنے انجام بد کو پہنچا اور ایک دن لوگوں کی فرمائش پر کنویں میں چھلانگ لگائی اور ایک دور کے کنویں کا نام بتایا کہ میں اس کنویں سے باہر نکلوں گا۔ لوگ اس کنویں پر پہنچ گئے لیکن اکرام باہر نہ نکلا۔ پھر لوگوں نے پہلے کنویں سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن غوطہ خوروں کی اطلاع کے مطابق وہ اس کنویں میں بھی نہیں تھا۔ خدا جانے وہ کہاں گیا کسی کو آج تک اس کا پتہ نہیں

چل بسا۔ جب اکرام کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا اس وقت تک نذیر رکھے سے کئی عملی علوم سیکھ چکا تھا اور رکھے کو زہر دے کر ہلاک کر چکا تھا اور خانقاہ کی گدی نشینی اس کے پاس تھی۔

رکھے کی بقیہ کہانی

بیگم کا میرے ساتھ ایک قسم کا سمجھوتہ ہو گیا تھا، اب وہ نذیر کو برداشت کرنے پر تیار ہو گئی تھی۔ میں نے نذیر کو بیگم کے موڈ کے بارے میں بتا دیا تھا اور اس نے بالکل بُرا محسوس نہیں کیا تھا بلکہ ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ وہ ٹھیک کہتی ہیں کیونکہ جو شخص رنگ میں بھنگ ڈالے وہ کب اچھا لگتا ہے۔ یاد رہے کہ میں نے اس کی داستان کے وہ حصے چھوڑ دیئے ہیں جو میرے خیال میں حوالہ قلم کرنے کے قابل نہیں تھے۔ میں نے کہا۔ نذیر ان باتوں کو چھوڑ اور رکھے کے بارے میں کچھ بتا۔

''ٹھیک ہے قاری صاحب!'' نذیر نے آمادگی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

میلہ اور ساون بھادوں کا موسم گزر گیا تو ایک دن میں نے رکھے کو بھنگ پلائی، جب وہ ترنگ میں آیا تو میں نے کہا۔ رکھے تُو نے میرے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ میلہ گزرنے کے بعد تمہیں ہندو جوگی کے ساتھ گزرے ہوئے وقت کی کہانی سناؤں گا۔ آج میرا جی چاہتا ہے کہ تُو اپنے وعدے کو پورا کرے۔

ٹھیک ہے نذیر اس کے لئے رات بہتر رہے گی۔ چلو ٹھیک ہے۔ میں نے اس کے ساتھ اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ اس دن میں نے مرغ گھی میں بھونا اور شراب کا انتظام بھی کیا۔ موسم میں خنکی بڑھ گئی تھی لہٰذا میں نے حجرے میں چار پائیاں ڈال دیں۔ پتیلی میں دودھ بھی ابال لیا۔ پھر ہم شراب و کباب سے لطف اندوز ہوئے۔ رکھے نے حقے کا ایک کش لگایا پھر کچھ دیر سوچتا رہا شاید واقعات کی کڑیاں ملا رہا تھا پھر اپنی آپ بیتی شروع کر دی۔

دیکھ نذیر! جب جتو کی لاش گاؤں میں آئی تو میرا پھوپھا جوں ہی اندر سے گنڈاسہ لے کر میری طرف بڑھا میں نے پوری طاقت اور تیزی سے باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ میرا آج بھی یقین ہے کہ اگر میں اس وقت بھاگ نہ نکلتا تو پھوپھا ضرور مجھے قتل کر دیتا۔ پھر مجھے یہ ڈر کھائے جا رہا تھا کہ اگر پھوپھا میرے پیچھے بھاگ نکلا تو یقیناً مجھے پکڑ لے گا لیکن یہ دیکھ کر مجھے کچھ حوصلہ ہوا کہ پھوپھا نے میرا پیچھا نہیں کیا تھا۔ میں تیز رفتاری سے بھاگا جا رہا تھا۔ مجھے اپنی منزل کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ مشکل یہ تھی کہ میں اپنے گاؤں بھی نہیں جا سکتا تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ میرا والد کبھی بھی مجھے قبول نہیں کرے گا۔ پھر اس میں پکڑے جانے کا احتمال بھی تھا۔ میں نے صبح سے کچھ کھایا پیا بھی نہیں تھا۔ کئی کوس سفر بھی کیا تھا، پھوپھا سے ڈنڈے بھی کھائے اور سب سے بڑی بات اپنوں سے بچھڑ جانے کا افسوس۔

نذیر! خدا کسی کو ایسا وقت نہ دکھائے میں اس وقت بے پناہ جسمانی اور اعصابی قوت کا مالک تھا لیکن اس کے باوجود میں ٹوٹ پھوٹ کر بکھر چکا تھا۔ میرا کوئی ٹھکانہ اور کوئی منزل نہیں تھی۔ طرہ یہ کہ میں قانون کو بھی مطلوب تھا۔ میرے پاس صرف تن کے کپڑے تھے یا ایک جان۔ دنیا میرے لئے اندھیر نگری بن گئی تھی۔ دن غروب ہونے کو تھا، رات سر پہ آ گئی تھی بلکہ میں چاہ رہا تھا کہ جلدی اندھیرا ہو جائے تاکہ رات کی سیاہی مجھے اپنے دامن میں سمو لے کہ اچانک مجھے کسی لڑکی کی آواز آئی میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا وہ لڑکی مجھے رکنے کا کہہ رہی تھی۔ میں رک گیا۔ جب وہ میرے قریب آئی تو میں نے اسے پہچان لیا وہ بشیرے کی بیٹی رجو تھی۔

(یہ پُراسرار اور شرمناک داستان جاری ہے)

غزل

ممتاز ہاشمی

کیسی کیسی تدبیریں میں کرتا ہوں
زندہ رہنے کی خواہش پہ مرتا ہوں

بھوک، پیاس، جہالت، غربت، بیماری
تمام مصائب سے جرأت سے لڑتا ہوں

دل کی آنکھ سے خونی چشمے پھوٹتے ہیں
چپ چہروں کی جب تحریریں پڑھتا ہوں

جس کی گلی میں بچپن میں ہم کھیلتے تھے
اُس کی گلی میں اب جانے سے ڈرتا ہوں

علم کی شمعیں جن کے فیض سے روشن ہیں
اُسی قبیلے کا میں کرتا دھرتا ہوں

میری کون گواہی دے گا گلشن میں
پیار کی خوشبو بن کے جہاں بکھرتا ہوں

ہوتا وہی ہے جو قسمت میں لکھا ہو
کاہے کو الزام کسی پہ دھرتا ہوں

خوش طبعی سے پالے میں نے غم ممتاز
اپنے پیاروں کی خاطر میں مرتا ہوں

وقاص کو یہ معلوم تھا کہ اس کی وائرلیس اس کی جان سے بھی قیمتی ہے
وہ ڈاکوؤں سے بچ بھی گیا تو محکمہ اور معاشرہ اسے نہیں چھوڑیں گے۔
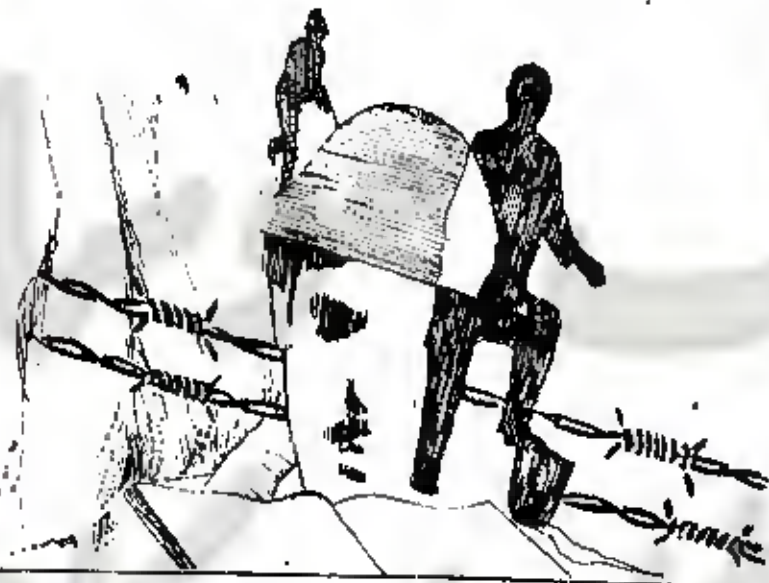
☆------------------------------0300-7232272---------احمد عدنان طارق/انسپکٹر پولیس

پینسرہ گوجرہ روڈ کے عین درمیان برلب سڑک شوگر مل ہے۔ پینسرہ سے گوجرہ جائیں تو اس شوگر ملز سے تھوڑا پہلے ایک چھوٹا سا اڈا آتا ہے جسے 83 پکی اڈا کہتے ہیں۔ برلب سڑک یہاں بیس پچیس دُکانیں ہیں لیکن اتنی چھوٹی سی جگہ پر یہاں ایک پولیس چیک پوسٹ بھی ہے۔ ایک بہت ہی چھوٹی بلڈنگ محکمہ پولیس نے کرایہ پر لے کر یہاں روزنامچہ رکھا ہوا ہے۔ اس چیک پوسٹ میں پولیس ملازمین کی عام طور پر تعداد ایک ASI اور چار کانسٹیبلان پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ چیک پوسٹ یہاں اس لئے قائم کی گئی ہے کیوں کہ یہ جگہ محلِ وقوع کے لحاظ سے کچھ اس طرح ہے کہ سڑک کی ایک جانب تھانہ نیالاہور کی باؤنڈری ہے، دوسری طرف اس اڈہ کی پچھلی طرف سے سارا علاقہ تھانہ صدر گوجرہ کا لگتا ہے اور ایک تکونی سا علاقہ نیالاہور کا چھوڑ کر باقی تمام علاقہ فیصل آباد کے تھانہ ٹھیکری والا کا ہے۔ وارداتیوں کے لئے یہ علاقہ رات کو سونے کی چڑیا بن جاتا ہے۔ کیوں کہ ملزمان باآسانی واردات کر کے ایک ضلع سے دوسرے ضلع میں فرار ہوسکتے ہیں۔

اس سارے علاقے میں دور دور تک آبادی نہیں ہے۔ پچھلے کئی روز سے متواتر اطلاع آرہی تھی کہ ڈاکوؤں کا ایک بڑا جتھہ جس کی تعداد پندرہ سولہ ہوتی ہے اور جن کے ہاتھوں میں ڈنڈے ہوتے ہیں، رات کو نکلتا ہے اور دور دور ڈھاریوں پر تنہا سوئے کسان جو بے چارے اپنے مال مویشی کی رکھوالی کے لئے مجبوراً ڈھاری پر سوتے ہیں ان کو جگا کر باندھ کر ان کا کوئی نہ کوئی مویشی لے جاتا۔ اگر کسی کے پاس بندوق ہے تو وہ زبردستی لے جاتی۔ اس

علاقے میں اکثر لوگوں نے مرغی خانے بنائے ہوئے تھے۔ یہ ڈاکوؤں کے لئے گویا راشن گھر تھے۔ وہاں اکثر مالکان کے پاس سیل کی تھوڑی بہت رقم بھی ہوتی تھی۔ وہ رقم بھی یہ ڈاکو چھینتے اور ساتھ مرغیاں بھی لے جاتے۔ بظاہر یہ حرکتیں اوڈ اور چنگڑ قوم کے افراد کرتے ہیں۔ اوڈ بہت ظالم قوم گنی جاتی ہے۔ ان کا وصف ہے کہ یہ ڈکیتی کے دوران تشدد کے بہت قائل ہیں۔ یہ لوگوں پر بہت تشدد کرتے ہیں۔

یہ علاقہ اگرچہ بہت کھلا اور وسیع تھا لیکن دو حصوں میں تقسیم تھا۔ یہ دو حصے گوجرہ ٹھیکریوالا کے درمیان سے گزرنے والی سیم نہر کی وجہ سے تقسیم ہیں۔ 83 پلی سے ایک پختہ سڑک پکا انا اور ڈجکوٹ کو جاتی ہے اس کے درمیان یہ بہت بڑی سیم نہر گزرتی ہے۔ سیم نہر کی ایک طرف کھدائی کے بعد اس نہر سے نکالی گئی مٹی کی وجہ سے بہت اونچی دیوار بنی ہوئی ہے۔ جب کہ نہر کی دوسری سمت میں گاؤں آباد ہیں۔

میں نے بطور ایس ایچ او تھانہ صدر گوجرہ چارج سنبھالا تو اس تھانہ میں سب سے زیادہ مجھے یہی چیلنج درپیش تھا۔ میں نے دو کام کئے ایک تو ہر رات گشت کے دوران ایک دو چکر اس علاقے کے ضرور لگائے۔ ایس ایچ او کی گشت رات بارہ بجے ختم ہو جاتی ہے لیکن میں نے اگلے افسران جن کی گشت میرے بعد شروع ہوتی تھی کو بھی تنبیہ کر رکھی تھی کہ ہر صورت اس علاقے میں گشت کرنے جانا ہے۔ دوسری بات جو میں نے ضروری سمجھی وہ اس علاقے کے لوگوں کے ساتھ میل ملاپ بڑھانا تھا۔ ان دنوں ہر علاقے کے ناظم تھے، یہ 2007ء کی بات ہے۔ میں نے اس علاقے کے دونوں ناظمین سے اچھے تعلقات قائم کئے۔ ان میں سے ایک ناظم میرے ایک ماتحت کانسٹیبل کا فرسٹ کزن بھی تھا۔

اس دن بلا کی گرمی تھی۔ ناظم صاحب نے مجھے درخواست کی تھی کہ جب میں رات کو گشت پر آؤں تو کھانا اس کے ساتھ کھاؤں۔ گاڑی میں گشت کرتے وقت پھر بھی ہوا لگتی رہتی ہے لیکن گاؤں میں کسی کی بیٹھک میں بیٹھنا اور وہ بھی جب بجلی گئی ہوئی ہو خاصا دل گردے کا کام ہوتا ہے۔ چیک پوسٹ 83 پلی کے اے ایس آئی صاحب میرے حکم سے بجائے پینسرہ گوجرہ مین روڈ کے اپنے چار کانسٹیبلان کے ہمراہ ناکہ عین سیم نہر کے اوپر ایک ایسی جگہ پر لگائے بیٹھے تھے جہاں سے ہم سمجھتے تھے کہ ڈاکوؤں کی آمدورفت ہو سکتی ہے لیکن اس ناکے کی ایک تکنیکی غلطی یہ تھی کہ ڈاکو اگر ٹھیکری والا سمت سے آئیں تو وہ سیم کے دوسرے کنارے پر بنے ہوئے مٹی کے بند سے ہمارے ناکے اور جوانوں کو اونچائی سے دیکھ سکتے تھے لیکن ہم نیچے ہونے کی وجہ سے اندھیرے میں انہیں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ میں خود بھی اسی ناکے پر چلا گیا تاکہ ایک تو ناکے پر میرے جانے سے ناکہ پر جوانوں کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا، دوسرا سبھی جوان اکٹھے کھانا کھائیں جس کے لئے میں نے ناظم صاحب کو درخواست کی تھی کہ وہ کھانا ناکے پر ہی لے آئیں تاکہ ڈیوٹی بھی ہوتی رہے اور کھانا بھی کھالیا جائے۔

ہر پولیس والے کے ذہن میں ہمیشہ یہ بات ہوتی ہے، میں خصوصاً پنجاب پولیس کی بات کر رہا ہوں کہ اتنی نفری دیکھ کر کسی ڈاکو کا حوصلہ ادھر سے گزرنے کا نہیں ہو سکتا۔ ہم نے ناکے پر کھانا کھایا۔ اے ایس آئی کو کھانا کھانے کے بعد میں نے روزمرہ کی ہدایات دیں۔ قریب ہی ایک ٹیوب ویل سے پانی رواں تھا جس سے سچی بات ہے کہ ایک سماں سا بندھ گیا تھا۔ کھانا بھی ہم نے روزمرہ سے زیادہ کھایا کیونکہ اب روزمرہ کی گشت تھی۔ ویسے اللہ تعالیٰ کے فضل سے چین تھا۔ میں گشت کرنے والے جوانوں کو گاڑی میں لے کر گوجرہ کی طرف جانے والے روڈ پر نکلا اور ابھی میں شوگر ملز کے قریب پہنچا تھا کہ مجھے

اے ایس آئی ابرار کا فون آیا۔ میں نے فون اٹھایا تو اس کی گھبرائے انداز کی آواز نے لمحوں میں میری ساری سستی اتار دی۔

ابرار نے مجھے بتایا کہ میرے نکلتے ہی دس بارہ مسلح افراد نے پولیس پارٹی پریسیم کی طرف سے حملہ کیا۔ پولیس نے بساط بھر مزاحمت کی کوشش کی لیکن ان افراد کی آمد اتنی تیز اور خفیہ تھی کہ پولیس والوں کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ ڈاکو نہ صرف پولیس کی ایک رائفل چھین کر لے گئے تھے بلکہ ایک کانسٹیبل وقاص کو اس کے وائرلیس سیٹ اور موٹر سائیکل سمیت اغوا کر کے لے گئے تھے۔ میں نے اسی لمحے اپنے ڈرائیور کو گاڑی واپس موڑنے کو کہا پیچھے بیٹھے جوانوں کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ گاڑی کے اتنے تیز واپس مڑنے سے وہ سمجھ گئے تھے کہ کوئی ایمرجنسی ہے۔ وہ میرے گن مین تھے، تھانہ میں سب سے اچھے سپاہی تھے، وہ الرٹ ہو گئے۔ میں نے ابرار کو حوصلہ رکھنے کا کہا اور ساتھ تنبیہ بھی کی کہ ابھی وائرلیس پر کچھ اناؤنس نہ کرے اور مجھے ٹیلیفون پر مطلع رکھے۔ اس کے بعد میں نے تھانہ کی دوسری سرکاری گاڑی جو تھانے کی حدود میں کسی اور جگہ معمول کی گشت کر رہی تھی، اس پر گشت کرتے ہوئے افسر کو ٹیلی فون پر ساری بات بتائی اور فوراً 83 پلی پہنچنے کو کہا۔

میں جب دوبارہ ناکے پر پہنچا تو ابرار اور میرے جوان کمال بہادری دکھاتے ہوئے ابھی وہیں تھے، میں نے ان کا حوصلہ بڑھایا۔ ان کو ساتھ لیا اور اپنے اغوا شدہ کانسٹیبل وقاص کی تلاش میں نکل پڑا۔ کچھ ہی لمحوں میں دوسری سرکاری گاڑی بھی وہیں پہنچ گئی، میں نے دوسری گاڑی والوں کو ایریا مختص کیا کہ اس جگہ کو گھیرے میں لے لیں۔ مجھے اچھی طرح یقین تھا کہ ملزمان ابھی باہر نہیں گئے کیونکہ دوسری طرف آباد گاؤں تھے اگر وہ ادھر سے گزرتے تو لامحالہ ٹھیکری پہرے والوں کی نظر میں آتے اور فائرنگ کا سلسلہ دونوں طرف سے شروع ہوتا جو کہ روز کا معمول تھا۔ وہ جگہ جو ہم نے دونوں گاڑیوں سے گھیری ہوئی تھی، ایک تکونی سی جگہ بنتی تھی۔ دونوں گاڑیاں اس طرح سیدھائی میں چلتی رہیں جس طرح ریل کی پٹڑی پر چلتی ہیں۔ میں دل میں قرآن پاک کی جتنی سورتیں یاد تھیں پڑھ رہا تھا۔

کیونکہ میرے کانسٹیبل کی زندگی موت کا مسئلہ تھا اور ویسے بھی اب مجھے جلد یہ فیصلہ کرنا تھا کہ میں نے اپنے سینئر افسران کو کب اطلاع کرنی ہے۔ انہیں اطلاع کا مطلب تھا کہ ساری زندگی میرے کریکٹر پر داغ لگ جائے کہ میرے ہوتے ہوئے میرا کانسٹیبل ناکے سے اغوا کر لیا گیا تھا لیکن اگر اسے کوئی نقصان ہوتا ہے تو اس کا ذمہ دار بھی میں تھا۔ آخر اس محاصرے کا سکوت ٹوٹا اور میرے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں حالانکہ ٹیلی فون آنے کی امید ہر وقت رکھتا تھا پھر بھی ایک ہچکچاہٹ تھی کہ ٹیلی فون نہ ہی دیکھوں۔ پتا نہیں کسی سینئر افسر کا فون ہے یا کوئی اور بری اطلاع ہے جو دوسری گاڑی کے افسر کی طرف سے ہو۔ بہرکیف اس وقت ٹوبہ ٹیک سنگھ میں میرے ڈی پی او راجہ منور تھے جو پولیس میں بڑے بہادر پولیس آفیسر گنے جاتے تھے اب وہ ریٹائرڈ ہو چکے ہیں اور میرے ایس ڈی پی او طاہر مقصود تھے جو خوش قسمتی سے میرے ایف ایس سی کے کلاس فیلو اور میرے دوست بھی تھے۔ مجھے یقین تھا کہ اللہ کے بعد وہ ہر معاملے میں میرا ساتھ دیں گے۔ میں نے جی کڑا کر کے ٹیلی فون کا نمبر دیکھا تو وہ میرے ٹیلی فون میں محفوظ نہیں تھا۔ میں نے فون سنا تو خدا کی مہربانی ہو گئی۔ وہ آواز بھی اس وقت مجھے فرشتوں کی لگی۔ دوسری طرف سے اغوا شدہ کانسٹیبل وقاص بول رہا تھا، اس نے مجھے بتایا کہ وہ سڑک کی فلاں جگہ پر کھڑا ہے۔ وائرلیس اس کے پاس تھی۔ تبھی وہ گاڑیوں کے اوپر ریوالونگ لائٹس بھی دیکھ رہا تھا اور وائرلیس پر ہماری

پوزیشن بھی اسے پتا چل رہی تھی۔ میں دیوانہ وار اس جگہ پر پہنچا جہاں وقاص کھڑا تھا۔ میں نے وقاص کو دیکھا اور ایک نعرہ مستانہ لگا کر اس سے لپٹ گیا۔ اے ایس آئی جو سر پر چوٹ لگنے سے زخمی تھا، وہ بھی بے چارہ اپنی چوٹ بھول کر وقاص سے اس کا حال پوچھنے لگا۔

دو تین منٹ وقاص کو اپنے اوسان درست کرنے میں لگ گئے۔ اس نے مجھے اپنی کہانی سنانے سے پہلے سرکاری موٹر سائیکل ڈھونڈنے کو کہا جو اس کے بقول ڈاکو راستے میں پھینک گئے تھے۔ دوسری طرف خوشی تھی کہ جو وقاص کی بازیابی کے بعد خدا نے مجھے دکھائی کیوں کہ اگر موٹر سائیکل نہ ملتا تو تب بھی سارے وقوعہ کا ساری دنیا کو علم ہوتا تھا۔ مجھے ایک بات بھول گئی وہ بات معمولی ہے لیکن اس سارے واقعہ نے اسے اہم بنا دیا وہ یہ کہ میں نے اکثر گشت کے دوران سرکاری گاڑی میں فلیش لائٹس رکھی ہوتی تھیں جن کے استعمال سے دور دور تک اندھیرے میں چھپے ہوئے ملزمان نظر آ جاتے تھے ورنہ سڑک کے کنارے اندھیرے میں کوئی بیٹھ جائے تو گاڑی میں سفر کرتے نظر نہیں آتا۔ میری گاڑی میں سرچ لائٹس کی وجہ سے بھی ملزمان کو چھپنا پڑا۔ وقاص کی مدد سے ہم نے بڑی آسانی سے موٹر سائیکل تلاش کر لی۔ اس کے بعد ہم چیک پوسٹ 83 پلی آ گئے جہاں روشنی میں میں نے وقاص اور ابرار کو دیکھا۔ ابرار کے سر پر انہوں نے بندوق کا بٹ مارا تھا لیکن زخم اتنا کاری نہیں تھا جب کہ وقاص ویسے تو ٹھیک تھا لیکن اس کی دائیں آنکھ کے نزدیک زخم تھا۔ یہ زخم بھی اسے ان ملزمان سے نبرد آزما ہوتے ہوئے لگا تھا۔ وقاص کی وائرلیس ان ملزمان نے قابو کر لی تھی۔ موٹر سائیکل انہوں نے پہلے ہی راستے میں چھوڑ دی تھی۔ یہ کہانی ہمیں وقاص نے سنائی۔ ملزمان کا پولیس پر حملہ صرف اس لئے تھا کہ وہ اتنی سی پولیس کو اپنے سامنے درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے لیکن جب وقت پر دونوں گاڑیوں نے ان کے نکلنے کا راستہ مسدود کر دیا تو وہ وہیں رکے رہے لیکن اس اثناء میں وقاص نے کمال جرأت کا مظاہرہ کیا۔ اسے صورت حال کا علم تھا کہ اگر وہ یہاں سے بھاگے تو اسے وہ نہیں مار سکتے کیونکہ پھر وہ پولیس کے نرغے سے نہیں نکل سکتے۔

میں نے دو دفعہ اقوام متحدہ کے مشنز میں شرکت کی ہے، ساری دنیا کا اصول ہے کہ وہ اپنے آفیسرز کی جان سب سے قیمتی سمجھتے ہیں وہ پہلے دن سے ٹریننگ میں انہیں بتاتے ہیں کہ سب سے قیمتی چیز ان کی جان ہے، باقی سب چیزیں بعد میں ہیں لیکن یہاں کہانی کچھ مختلف ہے، وقاص کو یہ معلوم تھا کہ اس کی وائرلیس اس کی جان سے بھی قیمتی ہے وہ ڈاکوؤں سے بچ بھی گیا تو محکمہ اور معاشرہ اسے نہیں چھوڑیں گے۔ اس نے اپنی جان پر کھیل کر ڈاکوؤں سے وائرلیس چھینی اور لے کر وہاں سے دوڑ لگا دی۔ ایک دو ڈاکو اس کے پیچھے جانے لگے لیکن پھر ٹھٹک گئے۔ ایک نے پیچھے سے فائر کرنا چاہا لیکن پھر وقاص کے اندازے کے عین مطابق فائر نہ کر سکا۔ بہرکیف وقاص نے اپنی جان داؤ پر لگا دی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ ہمارا مقابلہ ان ڈاکوؤں سے تبھی ہو جاتا اگر وقاص کے پاس موبائل ہوتا پر کسی راہ گیر کے موبائل ملنے تک وہ ڈاکو رفو چکر ہو گئیں میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور کہا کہ اب اس تعیناتی کے دوران یا یہ ڈاکو رہیں گے یا پھر میں یہاں ایس ایچ او رہوں گا۔

میں نے صبح اٹھ کر ڈی ایس پی صاحب کو خود ہی سارا واقعہ سنایا اور ساتھ خود ہی وعدہ کیا کہ اب ان ڈاکوؤں کی خیر نہیں۔ ایک ہزیمت تھی جو میرے ذہن میں کلبلا رہی تھی۔ میں اس رات بھی قطعی نہیں سو سکا تھا جس رات یہ واقعہ ہوا۔ بہرکیف میری ساری عمر کی عادت ہے کہ جو بیت گیا وہ ماضی ہے، آگے کی سوچنا چاہیے۔ میرا اگلا دن اے ایس آئی کے ساتھ سوچ بچار میں گزر گیا۔

ابرار کی تعیناتی اس چیک پوسٹ پر تھی اور وہ خاصی حد تک یہاں کے مجرمان کو جانتا تھا۔ ڈی ایس پی صاحب نے مجھے تسلی دی تھی کہ کسی بھی مشکل میں وہ سب سے پہلے مجھے ملیں گے۔ ابرار کے مطابق یہ گروپ اوڈھوں کا تھا جن کی اب خاصی بڑی آبادی ٹھیکری والا ڈجکوٹ اور گوجرہ بارڈر پر رہتی ہے۔ میں نے اسی دن مخبر لگا دیئے جو ان آبادیوں میں جا کر معلومات لیں کہ آخر یہ بارہ تیرہ لوگ اگر اوڈھ ہیں تو یہ کون ہیں اور کہاں اکٹھے ہوتے ہیں۔ اتنے بڑے گروہ کا اکٹھا ہونا اور پھر تیاری کر کے کسی جگہ پر واردات کرنا اور پھر علیحدہ ہونا یہ اتنی بڑی کارروائی تھی، اس کی مخبری ہونی چاہیے تھی لیکن دوسری طرف اے ایس آئی ابرار کا یہ کہنا کہ یہ ان کا روز کا وطیرہ ہے اور کئی وارداتیں لوگ پولیس کو بتاتے ہیں اور کئی نہیں۔ یوں لگتا تھا کہ یہ گروہ عادتاً یا ازراہِ شغل یہ وارداتیں کرتا ہے۔ میں اس رات کا ایک پروگرام ذہن میں ترتیب دے چکا تھا اور اس کی مکمل رازداری رکھی تھی۔

اس دن سرِ شام ہی میں اپنے گن مین اور ابرار کے عملے کے ساتھ نا کے والی جگہ پر پہنچ گیا تھا۔ ہم سب سادہ کپڑوں میں ملبوس تھے اور پرائیویٹ گاڑیوں پر ناکے والی جگہ پر پہنچے تھے۔ شام کے قریباً پانچ بجے تھے اور گرمی کی انتہا تھی۔ گرمی سے زیادہ حبس تھا جس کی وجہ سے ہر ذی روح کی زبان منہ سے باہر نکلی ہوئی تھی۔ بہرکیف میرا سارا عملہ سمجھ رہا تھا کہ میں جو کرنے جا رہا ہوں وہ ضرور کوئی بے وقوفی کی بات نہیں ہوگی۔ کچھ حد تک وہ میرا پلان سمجھ چکے تھے۔ میں نے قریبی کماد کی فصل میں تھوڑی تھوڑی جگہ بنا کر سب جوانوں کو اس میں چھپا دیا اور خود بھی اپنا سانس بند کرنے کے لئے حبس زدہ فصل میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ اتنی دیر قبل اس طرح خود کو چھپانے کا مطلب یہ تھا کہ کوئی آتا جاتا بھی ہمیں نہ دیکھے۔ کل رات اتنا بڑا واقعہ ہوا تھا مجھے یہ امید تھی کہ شام کو ہو سکتا ہے کوئی انہی کا ساتھی یہ دیکھنے آئے کہ پولیس کا کیا ردعمل ہوا ہے اور جب وہ یہ دیکھیں کہ ناکہ بالکل خالی پڑا ہوا ہے تو ظاہر ہے کہ ان کے ذہن میں آئے گا کہ پولیس نے ڈر کر اس ناکہ پر نفری بھیجنا ہی ختم کر دیا ہے۔

وہ تین گھنٹے شاید میری زندگی کے سب سے مشکل تھے۔ کماد کی فصل کی بھڑاس ہماری جان نکال رہی تھی۔ اس کے علاوہ ہمیں کسی اَن ہونی کی امید تھی، یہ بات مستند تھی بھی یا نہیں کہ ہم کن کا انتظار کر رہے ہیں۔ ہمیں یہ علم نہیں تھا کہ آیا وہ کل صرف ادھر سے گزرے تھے یا یہی وہ لوگ ہیں جو روز اسی علاقے میں واردات کرتے ہیں۔ کیا یہ واقعی اوڈھ برادری سے تعلق رکھتے ہیں یا کوئی اور گروپ ہے۔ آیا یہ گروپ اسی علاقے سے تعلق رکھتا ہے یا باہر سے کوئی واردات کرنے آئے تھے؟ ویسے میں نے سارا دن اس بات کا بھی انتظار کیا تھا کہ خدانہ کرے اس گروپ کا کھلایا ہوا گل کوئی سامنے نہ آ جائے۔ اس کے علاوہ اس گرمی میں بیٹھنے کے بعد ہمیں معلوم نہیں تھا کہ ہم نے آخر کتنی دیر تک اسی طرح یہاں چھپے رہنا ہے۔ میں نے اپنے عملہ کو سمجھا دیا تھا کہ وہ جب کسی کو دیکھیں تو گھٹنوں کے بل لیٹ جائیں کیونکہ ہمیں اندازہ تھا کہ آنے والے کس قماش کے ہیں اور ان سے یہ امر کوئی بعید نہیں کہ وہ کوئی حرکت دیکھیں تو سیدھا ہماری طرف فائر کر دیں۔

ہمارا انتظار جوں جوں لمبا ہوتا گیا ایک ناگواری کا احساس ہم پر طاری ہونے لگا خود میں بور ہو گیا تھا مجھے لگ رہا تھا کہ شاید آج رات کوئی ادھر نہ آئے۔ اندھیرا ہونے کے بعد تو کسی انسان کا ادھر سے گزر ہی نہیں ہوتا تھا۔ آخر پانچ گھنٹے کے انتظار کے بعد تقریباً دس بجے رات ہماری قسمت نے یاوری کی۔ یہ وہ وقت تھا جب ہم دل چھوڑ چکے تھے اور واپس جانے کا سوچ رہے تھے۔ کسی نے اندھیرے میں سگریٹ سلگایا، ظاہر ہے جدھر سے

سگریٹ کی لائٹ ہمیں نظر آ رہی تھی یہ وہی سمت تھی جہاں سے وہ لوگ اکثر آتے تھے یعنی سیم نہر کی طرف سے میں نے اس امید پر اس شخص سے پوچھا کہ وہ کون ہے؟ کہ طے شدہ پروگرام کے مطابق میری آواز سن کر میرے ہمراہی زمین پر لیٹے ہوں گے اور وہی ہوا جو میرے ذہن میں تھا۔ اس شخص نے جواب دینے کی بجائے میری طرف سیدھا پسٹل کا فائر کیا۔ جو ظاہر ہے کہ ہم سب کے لیٹے ہونے کی وجہ سے خالی گیا لیکن اس کے بعد فائرنگ دونوں سمت سے شروع ہوگئی۔ اس دفعہ ہم آڑ میں تھے اور وہ توقع کے بالکل برعکس ہمارے سامنے نشانے پر تھے۔ پندرہ بیس منٹ مسلسل فائرنگ ہوتی رہی لیکن آہستہ آہستہ ہمیں سمجھ آتی گئی کہ وہ پیچھے کی طرف پسپا ہو رہے ہیں کیونکہ فائرنگ کی آواز سے ہمیں اس کا اندازہ ہو رہا تھا۔ انہیں پسپا ہونے کی ضرورت بھی تھی کیونکہ ہمارے عقب میں آباد ہر گاؤں سے بھی فائرنگ عام لوگوں نے شروع کر دی تھی۔ کچھ ہی دیر میں میدان صاف ہو گیا اور اب کوئی اکا دکا فائر ہمارے یا گاؤں والوں کی طرف سے ہی ہوتا تھا ورنہ دشمن ہمارے خیال سے بھاگ گیا تھا۔ ہم نے اچھی آڑ میں بیٹھ کر گاؤں والوں کو ساری سچویشن سمجھائی اور کچھ ہی دیر میں لوگ اچھی خاصی تعداد میں ہمارے ساتھ آ ملے ان کے پاس سرچ لائٹس بھی تھیں۔ سرچ لائٹوں سے ہمیں ان کے چھوڑے ہوئے تین مردہ ساتھی نظر آ گئے۔ ہم نے پوری احتیاط سے انہیں چیک کیا لیکن وہ مر چکے تھے۔ میں نے ڈی ایس پی سے فون پر بات کی اور پھر وائرلیس پر سارے ضلع کو اطلاع دی کہ ہمارا مقابلہ ہو رہا ہے۔

کچھ ہی دیر میں ڈی ایس پی صاحب موقع پر آ گئے ان کے آنے سے قبل ہم نے ان کو ملاحظہ موقع کروانے کی تیاری کر لی تھی۔ نعشوں کا ملاحظہ کرنے کے بعد ابھی ہم ڈی پی او صاحب کو بتانے ہی والے تھے کہ ان کی خود میرے نمبر پر کال آ گئی، ہماری کارروائی سے وہ بہت خوش ہوئے اور مجھے شاباش ملی۔ میرے اردگرد کے دو ایس ایچ او یعنی نیا لاہور تھانہ اور پنسی گوجرہ تھانہ بھی موقع پر آ گئے تھے۔ ڈی ایس پی صاحب نے ایک کو کہا کہ وہ ان کا تعاقب کرے جو یہاں سے بھاگے ہیں اور دوسرے ایس ایچ او کو کہا کہ وہ مقابلہ کرنے والی ٹیم کے لئے دودھ سوڈا منگوائے۔

واقعی پیاس بے تحاشہ لگی ہوئی تھی لیکن دودھ سوڈا آنے سے قبل ہی پبلک بڑے شوق سے ہمیں کھلا پلا رہی تھی اور ہمارے حق میں نعرے بھی لگا رہی تھی۔ ان تین ڈاکوؤں کی شناخت اوڈھ ہی ہوئی وہ ٹوبہ کے قریب ایک گاؤں کے رہنے والے تھے۔ ان کا باقی گروپ بھی کتے کی موت مرا آپ میں سے کئی نے ساہیوال کا پولیس مقابلہ پڑھا ہوگا جس میں 13 ڈاکوؤں کو گاؤں والوں نے مل کر ہلاک کیا۔ یہ وہ گروہ تھا جس کے پہلے 3 ساتھی ہمارے ساتھ مقابلے میں ہلاک ہوئے تھے۔ اس مقابلے کی جوڈیشل انکوائری میں قریباً پانچ سو بندوں نے ہمارے حق میں بیانات دیئے اور بڑی دیر تک اس علاقے میں واردات نہیں ہوئی۔

آج میں ٹوبہ میں تعینات نہیں ہوں میں اکثر 83 پلی پر ہونے والی وارداتوں کو اخبار میں پڑھتا ہوں تو کڑھتا ہوں مجھے پتا ہے کہ وہ علاقہ صاف کرنے کے لئے اسی پاگل پن کا اظہار ضروری ہے جو میں نے اور میری ٹیم نے دکھایا تھا اور پانچ گھنٹے سخت گرمی میں کماد کی فصل میں بیٹھے رہے۔ اس موہوم امید پر کہ شاید ڈاکو آ گئیں۔ وقاص خوش تھا کہ اس کا بدلہ ہو گیا تھا۔ اے ایس آئی ابرار بھی بہت راضی تھا کیونکہ اس کی تعیناتی کے اگلے دن آرام وچین سے گزرنے والے تھے۔

❁❁❁

امن کی آشا

ہمیں معلوم ہے کہ ہر پاکستانی انڈیا آنا چاہتا ہے لیکن راستے میں اس زہریلے سانپ جیسی لکیر کی وجہ سے نہیں آسکتا۔ جب تک یہ لکیر رہے گی، سرحد کے دونوں طرف آگ لگی رہے گی۔

نوید اسلام صدیقی

ہم آج کل ہندوستان سے محبت کرنے کے اعلانات پر اعلانات کیے جا رہے ہیں اور وہ ہماری ہر بات کو چٹکیوں میں اُڑا دیتا ہے۔ اس مکار قوم کے چکر میں ایک دفعہ میرا دوست پھنستے پھنستے بچا، اُس کو اللہ تعالیٰ نے اور اُس کی ماں کی دعاؤں نے بچالیا۔

غالباً ۱۹۶۴ء یا ۱۹۶۵ء کی بات ہوگی، میں ہیلی کالج میں بی کام کا طالب علم تھا۔ خلیل کے ساتھ میری بہت دوستی تھی، ہم اکٹھے پڑھتے تھے، اکٹھے کہیں آتے جاتے تھے۔ ایک دن خلیل مجھے کہنے لگا کہ ایک بہت زبردست پروگرام بن رہا ہے، تم نے میرے ساتھ جانا ہوگا، ناں نہیں کرنی۔ میں نے کہا بتاؤ تو سہی کہاں جانا ہے کہنے لگا یہ تو میں بعد میں بتاؤں گا پہلے تم وعدہ کرو کہ تم میرے ساتھ جاؤ گے۔ میں نے کہا ایسا نہیں ہوسکتا۔ آخر تنگ آکر اُس نے بتایا کہ یہاں سمن آباد میں ہمارے گھر کے پاس ہی میرے ایک دوست کا گھر ہے، اُن کے گھر اکثر ایک آدمی آتا رہتا ہے، وہ میرا دوست بھی بن گیا ہے، اُس کی رہائش مشہور برکی قصبے کے قریب ایک گاؤں میں ہے۔ اُس نے مجھے صاف صاف بتا دیا ہے کہ اس کے تمام عزیز سمگلنگ کے دھندے میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ کہتا ہے میں یہ کام نہیں کرتا لیکن اکثر ہندوستان جاتا رہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ اگر میں انڈیا جانا چاہوں تو کیا جاسکتا ہوں۔ اُس نے کہا کیوں نہیں۔ جب جانا ہو بتانا میں خود تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گا۔ جو شہر کہو گے وہ تم کو دکھاؤں گا۔ میں نے اسے کہا ہے کہ پہلی دفعہ تم مجھے امرتسر دکھا دینا، اگلی دفعہ پھر کوئی اور شہر دیکھیں گے۔

خلیل نے بتایا کہ میں نے اُسے بتا دیا تھا کہ میرا ایک دوست ہے، وہ اور میں جہاں جاتے ہیں اکٹھے جاتے ہیں، وہ اگر جانا چاہے تو؟ اُس نے کہا کہ وہ بھی

جا سکتا ہے، کہتے ہیں ایک سے دو بھلے۔

میں نے خلیل سے کہا کہ میں والدین سے پوچھ کر بتاؤں گا، اُس نے کہا کہ میں تو والدین کو صرف یہ بتاؤں گا کہ میں برکی کے پاس ایک گاؤں میں جا رہا ہوں۔ وہاں ایک دو دن رہوں گا، انڈیا کا تو میں اُن کے سامنے نام نہیں لوں گا، کیونکہ پھر تو وہ مجھے اجازت نہیں دیں گے۔

میں نے والد صاحب سے بات کی تو انہوں نے ایک لمبا لیکچر دیا کہ کبھی بھی کسی ایسے کام میں نہیں پڑنا چاہئے جو غیر قانونی ہو، بغیر پاسپورٹ اور ویزہ کے انڈیا میں گھسنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

خلیل مجھ سے ناراض رہا، آخر ایک جمعہ کے دن وہ اپنے والد صاحب کی کار لے کر برکی جانے کے لیے سمن آباد سے ہمارے گھر اچھرہ آیا اور ایک دفعہ پھر ساتھ چلنے کی دعوت دی اور نہ جانے کی صورت میں زندگی بھر کے لیے دوستی ختم کرنے کی دھمکی بھی دی۔ میں نے پوچھا کہ کیا تم نے گھر والوں سے اجازت لے لی ہے، اُس نے بتایا کہ والد صاحب تو اپنے کاروبار میں اتنے مصروف رہتے ہیں کہ ان کو گھر کی ہوش ہی نہیں ہے، ویسے بھی آج کل وہ کراچی گئے ہوئے ہیں، کچھ سامان بندرگاہ سے جا کر وصول کرنا ہے۔ والدہ سے بات کی تھی، میں نے بتایا کہ میں برکی کے پاس ایک گاؤں کی سیر کرنے جا رہا ہوں ایک دو دن بعد واپس آؤں گا۔ انہوں نے پوچھا کہ وہاں کیا خاص چیز ہے، جس کو تم دیکھنے جا رہے ہو۔ میں نے بتایا کہ ان کے گاؤں کے ساتھ ہی ہندوستان کا بارڈر ہے۔ میں وہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ ماں نے کہا، میں اللہ سے دعا کرتی رہوں گی تم برکی سے بخیر و عافیت واپس آ جاؤ، اللہ تعالیٰ کرے کسی منحوس ہندو کی نظر بھی میرے بیٹے پر نہ پڑے۔ خدا تجھے انڈیا کی سرحد سے بچائے۔ اور نجانے کیا کیا عجیب دعائیں کرتی رہیں۔ میں سنتا رہا، زیادہ کھل کر میں بھی بات نہیں کر سکتا تھا۔

خلیل نے بعد میں مجھے بتایا کہ میں تین چار بجے کے درمیان برکی اپنی کار پر پہنچ گیا تھا۔ وہاں سڑک پر ہی ایک آدمی نے مجھے رکنے کا اشارہ کیا، مجھ سے پوچھا کیا آپ کا نام خلیل احمد ہے؟ میں نے کہا، آپ کون ہیں اور شوکت صاحب کہاں ہیں۔ اُس آدمی نے بتایا کہ میرا نام برکت ہے میں شوکت کا بڑا بھائی ہوں، شوکت کو ایک ضروری کام سے لاہور جانا پڑ گیا، وہ بارہ بجے یہاں سے اپنی کار پر گئے تھے اور جاتے ہوئے آپ کا بتا گئے تھے، انہوں نے آپ کے لیے یہ پیغام دیا تھا کہ میں ہر صورت مغرب سے قبل آ جاؤں گا۔ اور بارڈر پار جانے کا پروگرام کنفرم ہے۔ آپ ہمارے گھر چلیں، چائے پئیں، آرام کریں اتنے میں وہ آ جائیں گے۔

ہم کار کے پاس کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں میری نظر سڑک کے دوسری جانب کھڑے ہوئے ایک صاحب پر پڑی جو متواتر میری طرف دیکھ رہے تھے، جیسے کوئی کسی کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے۔ میں نے ان کی طرف غور سے دیکھا تو مجھے ایک دم یاد آ گیا کہ یہ تو میرے سکول ماسٹر عبدالحمید صاحب ہیں جن سے میں نے میٹرک میں سائنس کے مضامین پڑھے تھے۔ میں دوڑ کر ان کی طرف گیا، انہوں نے مجھے گلے لگا لیا، اور میرے کان میں کہا کہ اس آدمی سے جان چھڑاؤ۔

ماسٹر صاحب نے مجھ سے پوچھا تم اِدھر کدھر۔ میں نے کہا اس آدمی کا بڑا بھائی مجھے آج رات انڈیا کی سیر کرانے لے کر جائے گا۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا بہت خوب۔ میں نے کہا کہ ماسٹر صاحب آپ بھی تو بتائیں ناں آپ اِدھر کدھر؟ انہوں نے

بتایا کہ ملک معراج خالد نے برکی جیسے پسماندہ قصبے میں یہ سامنے والی عمارت ہائی اسکول کے لیے بنوائی ہے۔ ملک صاحب زبردستی مجھے پکڑ کر یہاں لے آئے ہیں۔ آج کل گرمیوں کی چھٹیاں ہیں لیکن میں روزانہ بچوں کو سائنس کے مضامین پڑھاتا ہوں۔ جاؤ اس آدمی سے کہہ آؤ کہ میں تمہارے بھائی کے آنے تک ماسٹر صاحب کے ساتھ سکول میں ہی رہوں گا۔ شوکت کے بھائی برکت نے کچھ تھوڑی بہت چوں چراں کی لیکن آخر وہ مان گیا۔

میں اور ماسٹر صاحب سکول کی طرف چل دیئے، جو وہاں قریب ہی مین روڈ پر تھا۔ ماسٹر صاحب نے چپڑاسی سے کہا کہ ماسٹر منیر صاحب کو بلا لاؤ، واپسی میں چائے کا سامان لیتے آنا۔ تھوڑی دیر میں منیر صاحب تشریف لے آئے۔ معلوم ہوا کہ وہ طلبا کو آج کل 'حساب' پڑھا رہے ہیں۔

ماسٹر صاحب نے منیر صاحب کو بتایا کہ آپ کا دوست شوکت یہ نیا شکار پھنسا لایا ہے۔ یہ بچہ میٹرک میں میرا طالب علم رہا ہے۔ منیر صاحب نے کہا کہ اگر آپ نے اس کے شکار کو روکا تو وہ آپ کے پیچھے پڑ جائے گا، پورا خاندان بدمعاشوں کا ہے، اس لیے ذرا احتیاط سے۔ ماسٹر صاحب نے منیر صاحب سے کہا کہ دو تین ماہ قبل جو ایک لڑکا اڈیا سے معجزۃً بچ کر آ گیا تھا اُس کا قصہ ذرا اِس کو بھی سنا دیں۔

ہم ایک میز کے گرد کرسیوں پر کچھ اس طرح بیٹھے تھے کہ میرا منہ شمال مغرب کی طرف تھا۔ میں نے کہا وہ پیچھے دیکھیں آسمان اس طرف بالکل کالا سیاہ ہو گیا ہے، میرا خیال ہے کہ شدید آندھی آ رہی ہے۔ میں نے آج تک ایسی شدید آندھی اپنی زندگی میں نہیں دیکھی۔ سب نے کہا کہ یہ کھلا علاقہ ہے اس لیے یہ آندھی اتنی خوفناک نظر آ رہی ہے۔ چند منٹوں

کے اندر اندر وہ طوفان برکی پہنچ چکا تھا۔ ہم سب لوگ دوڑ کر عمارت کے اندر چلے گئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ آندھی اور بارش کا طوفان دروازے کھڑکیاں توڑ کر اندر گھس آئے گا۔ میں نے اور چپڑاسی نے کھڑکی کو مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا اور دونوں ماسٹر صاحبان دروازے کو قابو کیے ہوئے تھے۔ طوفان کا زور ٹوٹتے ٹوٹتے مغرب ہو چکی تھی۔ ہر طرف کالا سیاہ اندھیرا تھا۔ ماسٹر صاحب کو گاؤں میں ایک مکان ملا ہوا تھا لیکن انہوں نے کہا کہ آج رات ہم ادھر سکول ہی میں رہیں گے۔ شوکت کا بھائی برکت کہہ گیا تھا کہ آپ کے لیے دیسی مرغ پک رہا ہے، دونوں اساتذہ بھی اس دعوت میں شریک ہوں گے۔

مغرب کے دو ڈھائی گھنٹے بعد برکت آیا اور کہنے لگا کہ ایک تو یہ بتانا تھا کہ شوکت کا فون آیا تھا، اُس نے بتایا ہے کہ اُس کی گاڑی پر راستے میں درخت کا ایک تنا گر گیا تھا جس سے گاڑی کا سامنے کا شیشہ ٹوٹ گیا ہے اور انجن بند ہو گیا ہے۔ وہ اب صبح ہی آئے گا۔ اُس نے کہا ہے کہ کل شام ہم ضرور امرتسر جائیں گے۔ دوسری بات اُس نے یہ بتائی کہ کھانا کھانے کے لیے سب لوگ ڈیرے پر چلیں۔ کھانا بہت پُرتکلف تھا۔ برکت اصرار کرتا رہا کہ رات ادھر ہی رہیں، لیکن میں نے کہا کہ ہم لوگ اُدھر سکول کی چھت پر ہی گپ شپ کریں گے۔ شوکت کے گھر میں ہی ہم بیٹھے ہوئے تھے کہ کسی نے بتایا کہ ریڈیو پر خبروں میں بتایا گیا ہے کہ داتا دربار کی مسجد کا ایک مینار طوفان کی وجہ سے شہید ہو گیا ہے، مینار کے گرنے سے کچھ لوگ ہلاک اور کچھ زخمی ہوئے ہیں۔ وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ آج جمعہ کی نماز کے لیے شامیانہ صحن پر لگایا گیا تھا، دونوں میناروں کے ساتھ بھی رسے باندھے گئے تھے، اُس شامیانے میں ہوا بھر گئی، اور

ہوا کی طاقت سے وہ مینار شہید ہوگیا۔ (اُس زمانے میں مسجد بہت چھوٹی تھی، میں بھی وہاں نماز پڑھنے کئی دفعہ جا چکا تھا۔)

رات کو میں نے چارپائی پر لیٹے لیٹے منیر صاحب سے کہا کہ آپ نے وہ کسی لڑکے کا قصہ سنانا تھا۔

منیر صاحب نے بتایا کہ دو تین ماہ قبل میں اور عبدالحمید صاحب سکول کے لان میں اپنی اپنی چارپائیوں پر لیٹے ہوئے تھے، رات کے گیارہ بارہ بجے کا وقت ہوگا کہ میری آنکھ کھل گئی کوئی سکول کے پاس کھڑا اونچی اونچی آواز سے رو رہا تھا۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا اور عبدالحمید صاحب بھی اٹھ گئے۔ باہر دیکھا تو ایک نوجوان نظر آیا جس کی عمر بیس پچیس سال کے درمیان ہوگی۔ میں نے کہا تم کون ہو اور کیا ہوا ہے۔ اُس نے بتایا کہ میرا نام محمد شریف ہے، یہاں ایک شخص شوکت رہتا ہے، وہ آج شام مجھے انڈیا لے گیا تھا، مجھے وہاں سرکاری کارندوں کے حوالے کر کے خود اِدھر بھاگ آیا۔ خدا کا شکر ہے میں زندہ واپس آگیا ہوں۔ مجھے خدا کے واسطے اپنے پاس پناہ دے دو۔ صبح میں اپنے گھر واپس چلا جاؤں گا۔

ہمارے ساتھ وہ اسکول کے احاطے میں آگیا اور ہمارے پاس چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اُس نے بتایا کہ شوکت سے کچھ عرصہ قبل ہی میری واقفیت ہوئی۔ مجھے اکثر کہتا رہتا کہ اگر تمہیں انڈیا دیکھنے کا شوق ہو تو مجھے بتانا میں تمہارے ساتھ انڈیا چلوں گا۔ آخر اس کے ساتھ پروگرام بن گیا۔ مجھے ایک دوست آج دوپہر یہاں بر کی چھوڑ گیا تھا، میں شوکت سے ملا، ہم دونوں مغرب کے بعد الٹے پلٹے راستوں پر چلتے رہے۔ آخر ہم کو کچھ لوگ نظر آئے، ہندوؤں کی تو کوئی پہچان نہیں ہوتی لیکن سکھ اپنی پگڑیوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے وہ سب ہندو اور سکھ تھے۔ انہوں نے شوکت اور مجھے بہت خوش آمدید کہا۔ کئی مجھے دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ اُن کی ہنسی مجھے عجیب سی لگ رہی تھی۔ وہیں ایک سکھ کھڑا تھا، وہ بھی شوکت کا واقف معلوم ہو رہا تھا۔ اُس نے کہا کہ صاحب جی! جلدی نکل چلیں آج رات سنا ہے کہ سڑک پر چیکنگ ہوگی۔ شوکت نے میرا بازو پکڑا اور ہم باہر کھڑی ٹیکسی میں بیٹھ کر امرتسر کی طرف روانہ ہوگئے۔ ابھی تین چار میل ہی گاڑی چلی ہوگی کہ ڈرائیور چیخ اٹھا "مارے گئے آگے تو روڈ بند کیا ہوا ہے، رب خیر کرے۔" کچھ دیر بعد ہم وہاں بندوق تانے سپاہیوں کے درمیان تھے۔ پہلے تو ایک آدمی ڈرائیور کو پکڑ کر اندر لے گیا۔ شوکت مجھے کہنے لگا، یہ ایک ایک آدمی کو علیحدہ علیحدہ بلاتے ہیں، آپ ہر بات سچ بتا دینا، جھوٹ بول کر آدمی پھنس جاتا ہے۔ جان چھڑانے کے لیے جو وہ کہیں کہہ دینا منظور ہے۔

تھوڑی دیر بعد ایک سپاہی آیا اور شوکت کو بھی لے گیا۔ جنگل بیابان دشمن کا ملک، میرا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا، گھبراہٹ کی وجہ سے پورے جسم میں ایک کپکپی سی پیدا ہوگئی تھی۔ میں نے اللہ سے دعا کی: یا اللہ! اپنی مہربانی سے بچا لے، آئندہ اِدھر آنے کی غلطی نہیں کروں گا۔ ابھی میں دعا مانگ ہی رہا تھا کہ ایک سپاہی کار کی طرف آتا نظر آیا۔ مجھے کہنے لگا: صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔ میں اُس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ اندر جا کر اُس نے مجھے ایک کمرے میں بٹھا دیا۔ کچھ دیر بعد ساتھ والے کمرے سے ایک سکھ نوجوان آفیسر نمودار ہوا، اُس کی پتلون کے ساتھ ایک طرف پسٹل اڑسا ہوا تھا۔ میں اُس افسر کو دیکھ کر کھڑا ہوگیا تھا۔ وہ کہنے لگا اُدھر میرے کمرے ہی میں آجائیں۔ وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گیا۔ اُس نے بیل (bell) بجائی، ایک سپاہی کمرے میں داخل ہوا۔ افسر نے میرے کہے بغیر ہی اسے کہا کہ پہلے ایک گلاس پانی لاؤ،

پھر چائے وائے لے کر آؤ۔

اس نے کہا کہ وقت مختصر ہے، مجھے معلوم نہیں شوکت صاحب نے آپ کو کیا کچھ بتایا ہے، بہر حال آپ میری بات غور سے سنیں جب سے دنیا بنی ہے ہندوستان ایک حقیقت ہے جبکہ پاکستان ۱۹۴۷ء میں عارضی طور پر ہندوستان کو کاٹ کر بنا دیا گیا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ انگریز جو کہ ایک بہت شیطان اور مکار قوم ہے مسلمانوں اور ہندوؤں کو ہمیشہ حالت جنگ میں رکھنا چاہتا تھا، تاکہ یہ آپس میں لڑتے رہیں، اور وہ سرمایہ جس سے یہاں کی غریبی دور کی جاسکتی ہے ان سے مغربی ممالک کا بنا ہوا اسلحہ خریدتے رہیں، تاکہ ان کے اسلحہ بنانے کے کارخانے چلتے رہیں۔ میرے بھائی تمہیں معلوم ہی ہوگا ۱۹۴۸ء میں کشمیر کے نام پر ہندوستان اور پاکستان میں ایک چھوٹی سی جھڑپ ہو چکی ہے، اور آئندہ جھڑپیں نہیں باقاعدہ جنگیں ہوں گی۔ اور جب تک زمین پر ہم دونوں کے مشترکہ دشمن انگریز کی کھینچی ہوئی یہ زہریلے سانپ جیسی لکیر موجود رہے گی، سرحد کے دونوں طرف ایک آگ لگی رہے گی۔

ہماری حکومت نے کافی سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان اُن تمام لوگوں کو تلاش کر کے ایک مربوط نظام کے تحت منظم کیا جائے جو ''امن کی آشا'' پر یقین رکھتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے ہر پاکستانی انڈیا آنا چاہتا ہے، لیکن راستے میں یہ ناگن سرحد موجود ہے اس لیے آ نہیں سکتا۔ آپ کو ہم اپنا مستقل دوست بنانا چاہتے ہیں، آج پورے پاکستان میں کافی لوگ ہماری 'دوستی کلب' میں شامل ہو چکے ہیں۔ آپ کو میں اس 'دوستی کلب' میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ آپ کو ہر ماہ انڈیا کی مفت سیر کرائی جائے گی۔ آپ کو کرنا بھی کچھ نہیں ہوگا۔ اگر آپ یہاں سے جا کر ہم کو دھوکہ دینے کی کوشش کریں گے تو اس کا انجام بہت

...ڑا ہوگا، دوسری بات یہ ہے کہ اگر آپ نے میری بات نہ مانی تو ابھی میں فون کروں گا اور آپ کو گرفتار کرلیا جائے گا، اور آپ کو جیل کی کال کوٹھڑی کے حوالے کردیا جائے گا کیونکہ آپ ایک دشمن ملک سے غیر قانونی طور پر ہمارے ملک میں داخل ہوئے ہیں۔ میں آپ کو پانچ منٹ سوچنے کے لیے دے رہا ہوں، آپ اپنا بھلا بُرا سوچ لیں، میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔

میری آنکھوں کے آگے تارے گھوم رہے تھے، دل پھٹتا محسوس ہورہا تھا، کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا، دو منٹ گزر چکے تھے، میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ افسر دوبارہ واپس کمرے میں داخل ہورہا تھا۔ اُس نے کہا کیا واقعی آپ گوجرانوالہ کے رہنے والے ہیں، مجھے ابھی معلوم ہوا ہے میرے اسسٹنٹ نے بتایا ہے کہ شوکت نے آپ کے بارے میں انہیں بتایا ہے کہ یہ لڑکا گوجرانوالہ کا رہنے والا ہے۔ مجھے پہلے بتایا گیا تھا کہ آپ لاہور میں رہتے ہیں۔ میں دل میں حیران ہورہا تھا کہ یہ بیچ میں گوجرانوالہ کا کیا مسئلہ کھڑا ہوگیا ہے۔ میں نے کہا ”جی ہاں! ہمارا پورا خاندان گوجرانوالہ میں رہتا ہے، میرے سارے چچا اور ماموں وہیں ہوتے ہیں۔ میرے والد صاحب بھی پہلے وہیں کاروبار کرتے تھے لیکن بچوں کی تعلیم کے خاطر لاہور میں منتقل ہوگئے، آج کل برانڈرتھ روڈ پر اُن کی دکان کامیابی سے چل رہی ہے۔

اچانک اُس افسر نے کہا ”او ظالم! پہلے بتانا تھا، ہائے گوجرانوالہ، میرا باپ کہا کرتا تھا بیٹا ہم کتنے نصیبوں والے تھے ہم نے گوجرانوالہ کی آب وہوا میں اپنا بچپن اور جوانی گزاری۔ بیٹا کسی جگہ کی آب وہوا کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ واہگورو کی قسم وہاں کے پانی میں شراب کا نشہ تھا، اور وہاں کی ہوا، ہائے اس ہوا کی کیا بات کروں، کن الفاظ میں بیان کروں، وہ ہوا تو انسان کو بیٹھے بٹھائے مدہوش کر دیتی تھی۔ میرے باپ نے مجھ سے قسم لی تھی کہ اپنی پوری زندگی میں خیال رکھنا گوجرانوالہ کے کسی 'پھول' کو بھی اپنے ہاتھ سے مجروح نہ کرنا ورنہ میری آتما کو تکلیف ہوگی۔ جاؤ میرے بھائی باہر گاڑی کھڑی ہے میرے آدمی تمہیں ابھی برکی پہنچا آتے ہیں، جلدی سے نکل جاؤ میری ڈیوٹی کا ٹائم ختم ہورہا ہے اور وہ وحشی رام لعل آرہا ہے وہ مسلمانوں کو تو چھوڑو ہم سکھوں کو بھی کچا کھانے کا اعلان کرتا رہتا ہے۔ میں نے یہاں دفتر میں ان لوگوں کو بتادیا ہے کہ اس نوجوان سے بات ہوگئی ہے، معاملہ طے ہوگیا ہے۔ اب فی الحال اسے جانے دیں۔ آپ نے بھی یہی ظاہر کرنا ہے۔

افسر نے پھر بیل بجائی، ایک سپاہی اندر آیا، افسر نے پوچھا گاڑی تیار ہے۔ سپاہی نے بتایا بالکل تیار ہے۔ افسر نے کہا کہ ابھی ہمارے دوست کو واپس برکی چھوڑ کر آؤ، راستے میں کسی قسم کی بات کرکے ان کو پریشان نہیں کرنا، اب باقی باتیں ان سے پاکستان میں ان کے گھر پر ہوں گی۔ افسر نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور کہا 'رب راکھا'۔

عبدالحمید صاحب نے مجھے مشورہ دیا کہ تم برکت سے کہنا کہ گھر فون کیا تھا، گھر والوں نے کہا کہ فوراً گھر واپس آؤ کل کے طوفان سے گھر کی پچھلی دیوار گرگئی ہے اُسے ٹھیک کروانا ہے۔ انڈیا جانے کا پروگرام کچھ دنوں بعد بنائیں گے۔

صبح کی نماز پڑھ کر خلیل وہاں سے گاڑی لے کر نکل کھڑا ہوا۔ غالباً سات آٹھ بجے کے درمیان وہ میرے پاس پہنچ گیا۔ اور میرے گلے سے چمٹ گیا۔ کانوں کو بار بار ہاتھ لگاتا تھا اور یہ داستان در داستان مجھے سناتا رہا۔

***

انگار خانہ

انسانی نفسیات کے پس منظر میں، سچی اور ناقابلِ یقین کہانی، گھریلو تشدد کے خلاف ایک آواز۔

☆ ڈاکٹر مبشر حسن ملک ---- 0345-6875404

نعمان کا جیون مہیب یادوں سے اٹا پڑا تھا۔ غمِ دوراں کے گردابوں میں اس نے تند عذابوں کے بگولے دیکھے تھے۔ گھروندا جو اس نے پایا، پیہم انتشار کا شکار رہا تھا۔ اس کے والدین میں ہم آہنگی کا شدید فقدان تھا۔ احباب میں اس کا کنبہ نفاق کی علامت جانا جاتا تھا۔ جان پہچان والے افراد اس پہلو اچنبھے کا اظہار بھی کرتے۔ جب جانتے کہ نعمان کے والدین تعلیم یافتہ تھے، خصوصاً والد محترم جو وکیل کے طور پر نام رکھتے تھے

اور عدالتی اداروں میں کامرانیاں ان کے قدم چوما کرتی تھیں، گھریلو امور میں یکسر ناکام رہے تھے۔ اب تو احباب نے بھی ان کے جھگڑوں میں پڑنے کی ریت چھوڑ دی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ دوستوں میں مہربان پہچانے جانے والے مہر صاحب اندرون خانہ کسی قہر سے کم نہیں تھے۔

گھریلو تناؤ انسانی نفسیات پر گہرا اثر مرتب کر سکتے ہیں۔ نونہال خصوصاً بھاری بوجھ تلے کچلے جاتے ہیں اور ان کی حیات فردا میں سجنے والے پھول کج رنگی کا داغ بن جاتے ہیں۔ نعمان کے ننھے ذہن پر بھی گھریلو تشدد کے اثرات بڑے گہرے تھے۔ اندرون خانہ جتنا انتشار اکثر برپا رہتا تھا اتنا ہی خلفشار اس کے دماغ میں پروان چڑھ گیا تھا۔ نتیجتاً وہ تناؤ کا شکار، بزدل اور زود رنج ہو چکا تھا۔ صحت میں بھی لاغر لگتا تھا۔ اس کے ذہن پر بوجھ بساط سے بڑھتا تو وہ تعلیمی اور دیگر امور میں دھیان سے عاری دکھنے لگتا۔ کبھی اس کا ذہن ماؤف ہو جاتا، خصوصاً جب اپنی ماں کو زندگی سے مایوس دیکھا کرتا۔

بداعتمادی اس کی شخصیت میں ناسور کی طرح پل رہی تھی۔ اسی طرح خود رحمی کے جذبے بھی اس میں پرداخت پا رہے تھے۔ کبھی انجانے خدشے اس پر راج کرنے لگتے تب اس کا ذہن بے سروپا کہانیاں بننے لگتا۔ جذبوں کی رو میں بہتا تو یاس کی گہرائیوں میں گم رہتا، کبھی کتاب زیست کے ناروا واقعات پر کڑھتا رہتا۔

نعمان کے والدین مزاجوں میں بُعد المشرقین رکھتے تھے۔ ماں سادہ لوح تھی جبکہ غصیلا باپ اس کے عمومی مشاغل میں بھی غلطیاں کھوج لیا کرتا تھا۔ اسے بات کا بتنگڑ بنانے میں ملکہ حاصل تھا۔ یہ خواہش نعمان کے دل میں نمو پاتی کہ پیاری ماں کو گھریلو تشدد سے بچا لے مگر بدنصیبی کہ اس کی کم مائیگی تمنا کے آڑے آ جاتی۔ معاملہ صرف ماں تک محدود نہیں تھا اکثر اس کی اپنی نادانستہ خطائیں بھی جرائم بن جایا کرتی تھیں اور وہ ذہنی اور جسمانی تشدد کا شکار ہوا کرتا تھا۔

وہ نعمان کی اپنے گھر میں آخری رات تھی، اگلے روز اسے میڈیکل کالج چلے جانا تھا اور ہوسٹل میں قیام پذیر ہونا تھا۔ آئندہ سے مہمان کے روپ میں گھر آنا تھا۔ وہ سر شام ہی سے گہری سوچوں میں گم رہا تھا۔ ماں کے بارے میں خصوصاً وہ تشویش میں مبتلا ہو چکا تھا۔ اس کے پردیس چلے جانے پر وہ مزید تنہا ہو جائے گی، گمان ان مٹ نقوش کی طرح اس کے ذہن پر چپک گیا تھا۔ اپنی متوقع آسودگی اب اسے بے معنی دکھنے لگی تھی۔ رات بھیگ چلی تھی مگر خوابوں کی دیوی اس سے کوسوں دور تھی۔

کمرے میں شب کی تیرگی بڑی گہری تھی۔ یک دم تلخ واقعہ نعمان کی یادوں میں ابھر آیا جو کمسنی کے دنوں سے اس کے شعور میں کھب گیا تھا۔ پرانی بات تھی اور وہ رات بڑی طوفانی تھی جب فلک دھرتی پر غیظ دکھائی دیتا تھا۔ کمرے کی مدھم لو پر کبھی رعد شعلہ بار ہونے لگتی تو گھن گرج کی صداؤں میں نعمان کے والد کی آواز دبنے لگتی۔ اس کی ماں دیر سے ستون کے پہلو میں بندھی کھڑی تھی۔ وہ نیم برہنہ تھی اور اس کے جسمانی اعضاء فقط محدود حرکت کر سکتے تھے۔ سرد شب کی ظلمت میں دلخراش چیخ خاتون کے حلق سے نکلتی تو مظلوم کا وجود لرز اٹھتا اور بدن میں ان گنت جھٹکوں کا تواتر کئی لمحے برپا رہتا، پھر جلتے ہوئے انسانی گوشت کی بو شعلوں کی متزلزل پرچھائیوں کے ہم سفر ہو جاتی۔ ساتھ ہی روح فرسا منظر کا اگلا مرحلہ شروع ہو جاتا۔ شقی القلب خاوند لمبا آہنی چاقو ایک بار پھر بھڑکی ہوئی آگ میں رکھ دیتا۔ بار بار داغے جانے کے باعث مظلوم خاتون کا جسم زخم زخم ہو چکا تھا اور اس کے بدن کی چند جگہوں پر پوست میں سے ہڈیاں بھی جھانکنے لگی تھیں۔ لہو کے کئی دھبے فرش پر پھیل گئے تھے۔

اس شب نعمان نے کمسنی میں ہمت کر کے اپنے لب کھولے تھے اور ماں کی جان بخشی چاہی تھی۔ باپ کی منت سماجت کی تھی۔ اگلے لمحے وہ ایک خونی داغ اپنے بدن پر بھی کندہ کروا چکا تھا۔ جس کا الم آج بھی وہ اپنی روح میں جاگزیں پاتا تھا۔

''تمہارے ہوسٹل جانے پر میں بھی یہ عقوبت خانہ چھوڑ دوں گی''۔ اس کی ماں نے کہا۔ جو رات گئے اسے ملنے اس کی خواب گاہ میں چلی آئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا لختِ جگر شب کے اس پہر بھی کانٹوں پر لوٹ رہا ہوگا اسی کے لئے پریشان ہوگا۔

''کہاں جاؤ گی؟'' نعمان نے پریشانی کے عالم میں بے ساختہ پوچھ لیا۔

''کہیں بھی''۔ ماں نے جواب دیا اور دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھنے لگی۔ ماں کے لئے دھرتی پر کوئی اور جائے پناہ نہیں تھی، نعمان یہ پہلو جانتا تھا۔ اس نے سسکتے ہوئے لمحوں میں اپنی ماں کا بازو تھام لیا، اس کی گرفت میں اعتماد کی گرمجوشی تھی۔

''میرے ڈاکٹر بن جانے کا انتظار کرو''۔ اس نے دھیمے لہجے میں کہے گئے لفظوں میں تشفی کی آمیزش کی۔ ماں کا یاس میں بگڑا ہوا چہرہ یک دم کھل اٹھا۔ برسوں بعد اسے فردا میں نئی دنیا کی جھلک نظر آئی تھی۔

''میری دعائیں تمہارا ساتھ دیں گی''۔ ماں کی بھرائی ہوئی صدا میں ممتا کی چہک نکھر گئی۔

''کیا چچا کی فرم میرے تعلیمی اخراجات برداشت کرتی رہے گی؟'' نعمان کے چہرے پر خدشات کے نقوش ابھر آئے۔ لمحہ بھر کے لئے ماں کا چہرہ بھی جھریوں سے اٹ گیا۔

''تمہارے چچا رحم دل شخص ہیں، ہم ان سے بہتر توقعات رکھ سکتے ہیں۔ میں نے ان سے رابطہ قائم کیا تھا۔ وہ تمہارا تعلیمی وظیفہ بڑھانا چاہتے تھے''۔ ماں نے کہا۔ بات سن کر نعمان نے اطمینان کا سانس لیا۔ اسے اپنے سامنے کھلی راہیں نظر آنے لگی تھیں۔

''بھائیوں کے بیچ ارض و سماء کا فرق دکھتا ہے''۔ نعمان نے اپنی دانست میں برحق تبصرہ کیا لیکن اس نوع کی رائے زنی پر ماں عموماً خاموش رہا کرتی تھی۔ اس نے بیٹے کو خدا حافظ کہا اور چلی گئی۔

''کچھ بھی ہو جائے، نظامِ قدرت مکمل طور پر کارفرما رہتا ہے جس کے تحت روز و شب حوادث اور واقعات سے مزین ہوتے جاتے ہیں''۔ یہ تخیل نعمان کے ذہن میں اٹک گیا تھا۔ ''انسانی پود بھی اشجار کی طرح ہوتی ہے''۔ اس نے خیال کیا، پھر اس کے دماغ میں انجانی گرہیں کھلنے لگیں۔

ہر اُگنے والے شجر کو گلستان یا سبز باغیچہ نصیب نہیں ہوتا۔ ہر نوع کے بیج ہواؤں کے دوش پر کائنات میں اڑتے پھرتے ہیں۔ کسی کے حصے زمین کی زرخیزی آتی ہے تو کوئی نونہال ریت میں جنم پا کر جھلس جاتا ہے۔ ایسے شجر کے نصیب پر کیا کہا جائے جو پہاڑی چوٹی پر جا اُگتا ہے اور تمام صلاحیت اپنا وجود اور توازن برقرار رکھنے میں صرف کر دیتا ہے۔ کوئی جز و نبات موافق آب و ہوا میں نمو پاتا ہے تو اس جیسا دوسرا اپنی زیست ابتر موسموں کے خلاف گنوا دیتا ہے۔ کسی کی تقدیر دست باغباں کی لکیروں میں ثبت ہو جاتی ہے تو کوئی دوسرا کسی لکڑہارے کا نصیب بن جاتا ہے اور تمام رُتوں میں اپنی شاخیں کٹواتا رہتا ہے''۔ نعمان اپنے نصیب کی محرومیوں پر قائل تھا اور قسمت کو کوستا تھا۔ وہ ایسا شجر تھا جسے ابتر موسموں کے سوا کچھ نہیں ملا تھا اور وہ صرف امیدوں کے سہارے قائم تھا، جو کبھی کمزور سہاروں کے باعث ٹوٹنے لگتی تھیں۔

●

نعمان نے گھر چھوڑ دیا مگر جب راہِ حیات پر آزادو نہ چلا تو اس کی شخصیت میں کئی خلا نظر آئے جن کی

جڑیں بہت گہری تھیں۔ نفسیاتی لحاظ سے متوازن وہ ہرگز نہیں کہا جاسکتا تھا۔

آشا کو ماہ لقا کہنا ذوقِ نظر سے ناانصافی تھی مگر وہ خوبرو کے طور پر ضرور سراہی جاسکتی تھی۔ ویسے بھی جیون ساتھی کا تصور ہمہ پہلو شخصیت کے طور پر ابھرتا ہے۔ عورت کسی مرد کی کائنات میں عموماً ظاہری خوبیوں کی بنا پر وارد ہوتی ہے پھر اس کی زیست میں باطنی اوصاف کی بنیاد پر سما جاتی ہے اور ہمہ پہلو خوبصورت نظر آنے لگتی ہے۔ صنفِ نازک کے روپ گزرتے جیون کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں مگر اس کی سرشت میں جذبۂ ہمدردی جزو لازم کی صورت موجود رہتا ہے بلکہ نرم جذبہ نسوانی پیار کی شبنم میں تازگی کی طرح بسا رہتا ہے اور ساتھی کو اپنی طرف مائل اور متوجہ کیے رکھتا ہے۔

آشا کا دل انسانی ہمدردی سے سرشار تھا، اس کے جذبوں کی اس افراط نے نعمان کو اپنا گرویدہ کرلیا تھا اور اس کے پیاسے وجود کو ملہار کی طرح سیراب کردیا تھا۔ دونوں جب ساتھ چلے تو چاہ کا سبزہ احمریں نہال فصلِ نہار میں لہلہانے لگا۔ جب وآشتی کی یہ دنیا نعمان نے پہلی بار دیکھی اور محسوس کی تھی، اسے زندگی بسر کرنے کا قرینہ بھی سمجھ میں آنے لگا لیکن وہ اپنے ماضی سے یکسر آزاد نہیں ہوا تھا۔ ڈراؤنے خواب اس کا تعاقب کیا کرتے تھے۔ کبھی سوچنے لگتا کہ اس کی حیات میں منفی رویوں کا جواز کیا تھا؟ وہ کانٹوں کی سیج پر کس کے کارن چلا تھا؟ قدرت نے تو اسے پھولوں کی سیج سے دھرتی پر اتارا تھا پھر رہگور اتنی سنگلاخ کیونکر ہوگئی؟ کیا تقدیر کے گردابوں میں انسان اتنا ہی لاچار ہے؟ کبھی وہ آشا کا وجود قدرت کا انعام سمجھنے لگتا۔ پھر تدبیر کرتا کہ آئندہ حیات وہ کیسے سنوار سکتا ہے؟ شکر ادا کرتا کہ اس کی محبت یکطرفہ اور بے معنی نہیں تھی۔

گھر سے نکلا تو اُس کے ذہن میں مستقبل کی تصویر سجنے لگی تھی۔ ماں کا روپ خوابوں کے کینوس پر مرکز میں چھپا ہوا پاتا تھا جس کے گرد وہ خوش رنگ دمکتا ہوا ہالہ دیکھا کرتا تھا۔ بہار کی اس فصل میں اس کی تمام تمنائیں تعبیروں سے ہمکنار دکھائی دیتی تھیں۔ اسے اپنا وجود بھی سورج کی طرح روشن نظر آتا تھا کیونکہ وہ ایک قابلِ رشک شعبے میں محنت کررہا تھا۔ آشا اس کی کائنات میں ستارے کی طرح جگمگا رہی تھی، بامِ تمنا پر ثریا کو مات دیتی تھی۔ ہر سو اسے اجالے ہی اجالے نظر آتے تھے۔ اندھیروں کا گمان اس کی خیالی دنیا میں ناپید تھا۔ غالباً یہ گزرے ہوئے کٹھن وقتوں کا شاخسانہ تھا جو نعمان تصوراتی دنیا میں قید رہنے لگا تھا۔ اس نے اپنے خوابوں میں اتنا قرینہ سجالیا تھا کہ اس کا یہ رخ فرد دوسروں کو غیر حقیقی دکھنے لگا تھا۔

''منصوبوں کو حقائق سے روشناس کرواؤ، نعمان!'' آشا اصرار کرتی تھی۔ ''تمام ہی ادوار رنج، مشاکل اور مسرت سے عبارت ہوتے ہیں۔ زندگی کی کہکشاں میں خوشیاں ستاروں کی طرح بکھری ہوتی ہیں جو چننی پڑتی ہیں''۔ وہ نعمان کو سمجھاتی۔

''آشا! میں تمام تلخیاں مٹا کر زندگی مسکراہٹوں سے مرصع کرنا چاہتا ہوں۔ راہِ تمنا دشوار ضرور ہے مگر حصولِ منزل ناممکن نہیں، تم خاطر جمع رکھو''۔ نعمان اپنا جواب دہرا دیتا پھر مسکرانے لگتا۔ مباحثہ بڑھتا تو کبھی سوچوں میں گم ہوجاتا پھر الجھاؤ اس کے چہرے پر بکھر جاتے۔ بوجھ بڑھتا تو اس کے رویوں میں گہرے نفسیاتی گھاؤ نظر آنے لگتے۔ وہ اپنی دانستہ و نادانستہ غلطیوں پر گھنٹوں کڑھا کرتا تھا۔ روزمرہ میں ناخوشگوار واقعات وہ قرطاسِ حیات پر سیاہ دھبے خیال کرتا تھا۔ خطا گو معمولی ہوتی مگر اس کی فکر و نظر کی دلدل میں وبال بن جایا کرتی تھی۔ پھر اس میں پچھتاوے بھی شامل ہوجاتے جیسے کوئی پتھر پہاڑی چوٹی پر سے لڑھکتا ہے تو رہگور میں اس کے

گرد برف جمنا شروع ہو جاتی ہے جو اس کے حجم میں اضافے کا باعث بنتی جاتی ہے۔ آخر کار وہ پتھر سطح زمین سے ہمکنار ہوتا ہے تو منوں بڑا برفانی تودہ بن چکا ہوتا ہے۔

کبھی واقعات دوسرا رخ بھی اختیار کر لیتے۔ نعمان غلطی پر ہوتا تو بھی اپنی لغزش درست ثابت کرنے کی کوشش کرتا اور اس سمت میں بے معنی دلائل دیتا رہتا۔ اس کا یہ عمل لاجواب ہونے کے باوجود جاری رہتا اور عموماً بدمزگی پر ختم ہوتا۔ ان مراحل سے گزر کر اسے سنبھلنے میں وقت لگتا۔ اس بیچ وہ زود رنج بھی دکھائی دیتا۔

اس کے ذہن میں غلط فہمیاں بھی زیادہ جنم لیا کرتی تھیں۔ آشا کو خصوصاً اس کے معاملے میں احتیاط برتنا پڑتی تھی۔ اس سے نالاں ہوتا تو باہمی ناراضی طوالت اختیار کر لیتی اور دونوں کی جان پر بنی رہتی۔

ان شخصی مسائل کے باوجود نعمان افراد سے الگ تھلگ نہیں ہوا تھا۔ اس نے اپنی محنت کی استعداد پر حلقۂ ارباب کو بہت متاثر کیا تھا۔ ذہین بھی تھا، اس لئے اس کی تعلیمی کارکردگی ہمیشہ شاندار رہی تھی۔ ہر تعلیمی کامرانی اس کا حوصلہ بڑھا دیتی تھی۔ اپنی اعلیٰ کامیابیوں کی خبر وہ فخر سے اپنی ماں کو دیا کرتا تھا۔ ماں کی خوشنودی اسے اچھی لگتی تھی، وہ اسے متبرک کہا کرتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا عروج ماں کے لئے آب حیات کا درجہ رکھتا تھا۔

روز و شب کا پہیہ چلتا رہا۔ نت نئی کہانیاں جنم پاتی رہیں، نعمان کی ناؤ منزل کی طرف بڑھتی رہی، اس نے نصف مسافت طے کر لی تھی کہ حالات نے ابتری کی طرف پلٹا کھایا۔ زندگی کا رخ روشن جو نعمان نے تراشا تھا، بُری طرح گہنا گیا۔ اس کی ماں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئی، سب کچھ اچانک رُونما ہو گیا۔

''میں تم سے ہمیشہ شرمندہ رہی، تمہیں ممتا بھرا سایہ نہ دے سکی۔ نعمان! ہے تو مشکل مگر مجھے معاف کر دینا۔

میرے دست و پا ہمیشہ بندھے رہے۔ میں تمہارے سائے میں زندگی بسر کرسکتی تھی مگر قدرت سے یہ مہلت نہ ملی"۔ ماں نے مرتے ہوئے کہا پھر اس کی آواز آخری ہچکی میں تبدیل ہوگئی۔ نعمان سکتے میں کھڑا رہ گیا، الم کی گہرائی اس کے چہرے پر کندہ ہوگئی۔ کالج واپس لوٹا تو اس کی کایا پلٹ چکی تھی۔

●

نعمان کو فردا کی سمت صرف خزاں نظر آنے لگی۔ اس کے خواب رنگ سیاہی میں ڈھل گئے۔ اسے اپنی حیات دھول کا غبار دکھنے لگی جسے ماں نے گور کی صورت اوڑھ لیا تھا۔ کس کی خاطر جئے گا؟ وہ سوچنے لگا۔

خوشگوار پہلو اس کی شخصی زندگی سے معدوم ہوگئے۔ وہ غم کی تصویر دکھائی دینے لگا، سوچوں میں غلطاں، اپنے سنگ بڑبڑاتا رہتا۔ مرجھایا ہوا چہرہ اس کی پہچان بن گیا۔ بدمزگی پر اشک بہانے لگتا پھر وقت کے ساتھ اس میں یاسیت بڑھنے لگی۔ تن کا ہوش رہا نہ لباس کا، تنہائی اس کے من کو بھانے لگی، کم گوئی اس کی سرشت بنتی گئی۔

کہیں بیٹھتا تو گھنٹوں کے حساب بیٹھا رہتا۔ چل پڑتا تو میلوں چلتا رہتا۔ روزمرہ سے اس کا انقطاع بڑھنے لگا۔ چند ہی ہفتوں میں اس کا تعلیمی انحطاط حدیں چھونے لگا۔

"اس فانی دنیا میں محنت سے جیون غارت کرنے کا فائدہ؟" ایک روز وہ آشا سے الجھ پڑا۔ "صلاحیتیں اور لیاقتیں سب ملیامیٹ ہوجاتی ہیں۔ بڑی بڑی ڈگریاں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ اُن کے لئے عمروں کا ضیاع کرنے والا خاموشی سے چلا جاتا ہے۔ کبھی تو مرجاتے ہیں، جلد یا بدیر پھر طویل جیون کی تمنا سے حاصل؟ آخر تو مٹی ہی میں جانا ہے، پھر فنا میں دیر کیسی؟" یہ خیالات سن کر آشا کے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔

"لیکن نعمان، اجر و ثواب کے معاملوں میں ہم موجودہ اور اخروی دنیا کو الگ کیسے کرسکتے ہیں؟ ہم تو فقط یہاں نامکمل کہانیاں مرتب کرتے ہیں جنہیں بعداز ممات مکمل ہونا ہوتا ہے۔ یہ دنیا محدود سہی مگر پھر بھی بھرپور جیون کا تقاضا کرتی ہے۔ ہمیں زندگیاں ضائع کرنے کا حق نہیں ملا۔ مانا کہ یہ چل چلاؤ کے ادوار سہی مگر ہماری زندگیاں احباب سے جڑی ہوتی ہیں، ہمیں دوسروں کا سہارا بننا ہوتا ہے۔ آپ زیست کو مقصدیت سے مبرا کیونکر قرار دے سکتے ہیں؟ زندگی تقاضوں کے سہارے آگے چلتی ہے اور اسے یونہی رواں رہنا ہے، نسل در نسل"۔ آشا نے زوردار لفظوں میں بات کی، نعمان کی ذہنی حالت کے بارے میں البتہ سنجیدہ سوال اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

اسے فوری طور پر دماغی صحت کے شعبے میں داخل کر لیا گیا، جہاں اس کا علاج شروع کردیا گیا۔ اس پر بھرپور محنت کی گئی۔ بہتر ہونے پر اسے والد کی نگہداشت میں گھر بھیج دیا گیا جو اپنی ذمے داریاں پوری نہ کرسکا۔ بعدازاں خاندان کا ڈاکٹروں سے رابطہ بھی منقطع ہوگیا۔ نعمان کا ذہنی بگاڑ آگے بڑھنے لگا۔

گاؤں میں ایک بیوہ عورت رہتی تھی، جو ابتر حالات کا شکار تھی۔ انتھک محنت کے باوجود اسے گھر چلانے میں دقت محسوس ہوتی تھی۔ نعمان کا آنا جانا اس عورت کے گھر شروع ہوگیا۔ اس نے بیوہ عورت کو بچوں سمیت دریا میں کود جانے کا مشورہ دیا اور اس ضمن میں اپنے تعاون کا یقین بھی دلایا۔ نصیب اچھے تھے جو یہ عورت عین وقت پر خوفزدہ ہوگئی اور اجتماعی خودکشی کے جرم سے محفوظ رہی۔

نعمان پہروں کے حساب سے ماں کی قبر پر بیٹھا کرتا تھا۔ قبر میں اسے ماں کے ہیولے نظر آتے تھے۔ وہ ماں سے تبادلۂ خیال بھی کرلیا کرتا تھا۔ بقول اس کے وہ ماں کو زخم زخم دیکھا کرتا تھا۔

''اگر میں جلد مر جاتی تو تمہارے والد سے اتنی سزا نہ پاتی''۔ اس کی ماں اکثر اُس کو کہا کرتی تھی۔

کبھی وہ ماں کو ڈھانچے کی صورت دیکھا کرتا تھا جس کے حلق کی ہڈیوں سے آوازیں ابھرا کرتی تھیں، جو چیخوں کی صورت دور دور تک پھیل جایا کرتی تھیں۔

نعمان کا والد ان دنوں بہت مصروف ہو چکا تھا۔ وہ چند گھرانوں سے اپنے رشتے کی بات کر رہا تھا۔ وہ اپنی سرشت کے زیر اثر محو کار تھا۔

ایک صبح نعمان اپنے کالج پہنچ گیا۔ اس دن کالج میں علاج کے جدید طریقوں پر سیمینار جاری تھا۔ نعمان وہاں سینئر ڈاکٹروں کے لیکچر سنتا رہا۔ پھر اچانک اس کا ذہن بگڑ گیا۔ اسے موضوع سے شدید اختلاف ہوا۔ سنجیدہ بحث مباحثے کے دوران وہ اپنی نشست پر کھڑا ہو گیا اور دخل در معقولات کر دیا پھر وہ اونچی آواز میں بولنے لگا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ علاج معالجے، سب خرافات ہیں۔ میں علاج کو ضیاع دولت کے علاوہ سعی بے کار بھی جانتا ہوں۔ موت برحق ہے، ہر زندگی اجل پر ختم ہو جاتی ہے، جلد یا بدیر۔ میں سائنسی تجربوں کے ذریعے حیات میں طوالت بالکل بے معنی دیکھتا ہوں۔ نیم مردہ بوڑھوں کو دواؤں پر زندہ رکھنا کون سی عقلمندی ہے؟ فالج زدہ افراد چارپائیوں پر سالہا سال گزار دیتے ہیں۔ جسم ہل نہیں سکتا، ان کی زبانیں چلتی رہتی ہیں۔ ان کی زندگیاں دوسروں پر بوجھ بنی رہتی ہیں۔ حادثات کے باعث معذور لوگ عمر بھر بھیک مانگتے رہتے ہیں۔

ہم ایسے لوگوں کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، زندگی خود جن پر بوجھ بن جاتی ہے۔ جو شخص جلد مر جاتا ہے وہ کم گناہ سمیٹتا ہے، جو طویل عمر پاتا ہے وہ اسی قدر زیادہ گنہگار ٹھہرتا ہے۔ ہمیں مریضوں کو بچانے پر توتیں ضائع نہیں کرنی چاہئیں بلکہ اجل کو حیات پر ترجیح دینی چاہئے۔ اس دنیا میں کچھ بھی پائیدار نہیں پھر ہم حیات طویلہ اور نفسانی خواہشوں کے پیچھے کیوں بھاگتے ہیں؟ اس بچے کو دنیا میں لانے سے کیا حاصل، جسے بالآخر فنا ہو جانا ہے؟''

شام، نعمان کو دوبارہ ذہنی امراض کے شعبے میں بلایا گیا جس کے بعد اسے وارڈ میں داخل کر لیا گیا۔ تین ماہ اس کے علاج میں صرف ہوئے تب جا کر اس کی شخصیت میں مثبت پیش رفت نظر آئی۔ اس مرحلے پر اس کے والد کو دوبارہ بلایا گیا۔

آشا نے بیماری کے دوران نعمان کی بہت مدد کی۔ اس کی تیمارداری میں ہمدردی اور چاہت کی معراج نظر آئی جس نے نعمان کو زندگی میں واپس لانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس نے نعمان کی فانی زندگی کے بارے میں سوچ بدل دی اور اسے جیون کی جنتوں سے رُوشناس کیا۔ علاج میں نسوانی جذبوں کا امتزاج ہوا تو نعمان کے شخصی گھاؤ بھر گئے اور وہ آشا پر تکیہ کرنے لگا۔

شفایاب ہو کر گھر واپس لوٹا تو اسے وہاں بھی بہتر ماحول ملا اور پھوپھی کا وجود اس کے لئے رحمت ثابت ہوا۔ نعمان کی پھوپھی سمجھدار اور زیرک خاتون تھی، اس نے نعمان کے سر پر ہاتھ رکھا اور اس کی طرف توجہ دی۔ وہ گھریلو تناؤ کم رکھنے میں بھی کامیاب رہی۔ اس نے گھر میں زندگی کا رچاؤ رکھا اور اپنی زندہ دلی کے باعث نعمان کے ساتھ گھل مل گئی۔ وہ آہستہ آہستہ اس کی رازدان بھی بن گئی۔ اس نے آشا کے اہل خانہ کو اپنے گھر مدعو کیا اور باہمی خیر سگالی کا آغاز کرنا چاہا مگر نعمان قسمت کا دھنی ثابت نہ ہوا۔

نعمان کے والد کو آشا کی بڑی ہمشیرہ پسند آ گئی۔ عاصمہ طلاق کے مراحل سے گزر چکی تھی اور زندگی کی شام پڑنے سے پہلے کسی چار دیواری میں بس جانا چاہتی تھی۔

پہلی ہی ملاقات میں وہ منہ زور مرد کو لبھا چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ بات نعمان اور آشا پر پہنچتی، نعمان کا والد اپنے لئے زمین ہموار کر چکا تھا۔ نعمان کے ہاتھ کچھ بھی نہ آیا۔

''نعمان ذہنی کیفیت کے نازک مراحل سے گزر رہا ہے''۔ نعمان کی پھوپھی نے بھائی سے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ بمشکل کچھ سنبھلا ہے اور اس میں زندگی کی رمق نظر آنے لگی ہے۔ راہِ حیات پر اسے لمبا سفر طے کرنا ہے۔ ہم بڑوں کی طرف سے اسے سہاروں کی ضرورت پڑے گی، کوئی قربانی اگر لازم آئے تو ہمیں دینا ہوگی۔ آشا نے اس کی بحالی میں اہم کردار ادا کیا۔ اسی کی شخصیت نے نعمان کے جذبوں میں توازن پیدا کیا ہے، ہمیں یہ فراموش نہیں کرنا چاہئے بلکہ ماضی سے سبق سیکھنا چاہئے اور مزید غلطیوں سے اجتناب کرنا چاہئے''۔ بُردبار خاتون نے سمجھانے کی کوشش کی۔ بہن کی توجیہات سن کر نعمان کا والد غصے میں آ گیا۔

''میں تمہیں لامحدود مدت اپنے گھر نہیں رکھ سکتا''۔ اس نے دھاڑ کر کہا۔ ''آخر تمہارا اپنا بھی گھر ہے، تمہاری ذمہ داریاں ہیں، انہیں ہم کب تک پس پشت ڈال سکتے ہیں؟ عارضی انتظام کب تک چلے گا؟ مجھے یہ گھر مستقل طور پر کھولنا ہے۔ وقت کا پہیہ آگے چلتا ہے۔ میں احمقوں کی جنت میں نہیں رہتا''۔ بپھرے ہوئے شخص نے تیز لفظوں میں الجھے پُرزور لہجے میں بات کی۔

''اب بچوں کا دور ہے، بھائی! انہیں راہِ حیات پر آگے بڑھنا ہے، ہمیں چاہئے کہ ان کے لئے پیچیدگیاں پیدا کرنے سے گریز کریں۔ نعمان کی ذہنی کیفیت دیکھ کر میں اسی نظریے پر اصرار کروں گی''۔ نعمان کی پھوپھی نے اپنا نقطۂ نظر دہرایا۔

''نعمان ابھی طالب علم ہے، کمائے گا تو شادی بھی کر لے گا''۔ نعمان کے والد نے اپنا فیصلہ صادر کیا۔

''آپ شادی نہ کریں، نعمان کو آپ کی بہت ضرورت ہے۔ بمشکل سنبھلا ہے، یا پھر اس کی راہیں بند نہ کریں۔ وہ آشا کو چاہتا ہے، آپ کسی دوسری عورت کو اپنا لیں۔ آشا کی بہن مظلوم سہی مگر آپ کے لئے لازم ہے کہ اپنے بیٹے پر رحم کریں''۔ نعمان کی پھوپھی نے معاملہ سلجھانے کا آخری جتن کیا مگر ناکام ہو گئی۔ اس کا بھائی آشا کی بہن کو دل دے چکا تھا اب وہ ارادوں میں ردوبدل کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔

''اسے کچھ نہیں ہوگا، مجھے مار کر ہی مرے گا، تم خاطر جمع رکھو''۔ نعمان کے والد نے طنزیہ لہجے میں تمسخر کیا جس کا اثر اس کی بہن نے دل پر محسوس کیا پھر وہ تاثر اذیت بن کر اس کے چہرے پر ظاہر ہو گیا۔

نعمان کی پھوپھی نے آشا کی ماں سے بھی بات کی۔ اسے تمام معاملوں سے آگاہ کیا۔ کہا کہ وہ نعمان کو اپنا لیں، آشا نے بھی کوشش کی اور اپنی ماں کو منوا لیا لیکن باپ کو قائل نہ کر سکی۔

''میں اپنی بیٹی کسی نیم پاگل کے حوالے نہیں کر سکتا''۔ آشا کے باپ کا جواب حتمی تھا۔

''پچھلے سالانہ امتحان کا جو نتیجہ آیا تھا اس میں اس پاگل شخص کے نمبر میری کاوش سے کہیں زیادہ تھے۔ نہ صرف وہ امتحان میں اوّل آیا تھا بلکہ اس نے دو مضامین میں سونے کے تمغے بھی حاصل کئے تھے۔ ماں کی ناگہانی موت کسی بھی حساس دماغ پر اثرانداز ہو سکتی ہے''۔ آشا اپنے باپ سے یہی شکوہ کر سکی۔ وہ اپنی بڑی بہن کا معاملہ خوب جانتی تھی جو شادی کے فوراً بعد اجڑ کر میکے واپس آ گئی تھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ طلاق حاصل کرنے میں اس کے گھر والوں کا قصور زیادہ تھا۔ وہ اس کے ہونے والے خاوند کے رویوں سے بھی بخوبی آگاہ تھی پھر بھی گھرانے سے اپنی بات نہ منوا سکی۔

نعمان اپنے والد کی شادی میں شریک ہوا، اس

نے تقریب میں بہتر رویہ اپنانے کی کوشش کی اور ''شغل میلے'' کے دوران ایسا بھنگڑا ڈالا کہ شرکا عش عش کر اٹھے۔

اس کی وجاہت اور شخصی طلسم پر آشا کے والدین بھی حیران رہ گئے مگر نعمان نے یہ سب دل پر پتھر رکھ کر کیا تھا۔ اس کا ذہن اس دم پھر بگڑ گیا جب رخصتی کے وقت اس کے والد کے پہلو میں اس کی نئی ماں چل رہی تھی۔

اس کا دکھ مزید بڑھ گیا جب ایک نئی خاتون اس کی اپنی ماں کے کمرے میں متمکن ہوگئی۔ نعمان ان مناظر کی تاب نہ لا سکا۔ گھر میں باراتیوں نے ہڑبونگ مچا رکھا تھا، وہ چپکے سے باہر نکل گیا۔ جاتے ہوئے اس نے اپنے والد کو دیکھا جس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ آسمان پر گھرے بادل تیزی سے چھا رہے تھے۔ ان میں مسلسل رعد کی کڑک کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ دکھتی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے رفتار میں تندی کی طرف بڑھ رہے تھے۔

نعمان قریبی پارک کی سمت چل پڑا۔ ایک پتھریلے بینچ پر بیٹھ کر اس نے آشا کو ٹیلی فون کیا اور ہمیشہ ساتھ دینے پر اس لڑکی کا شکریہ ادا کیا۔ پھر اسے کچھ اس طرح خدا حافظ کہا جیسے کبھی دوبارہ نہیں مل سکے گا۔

''کچھ غلط نہ کر لینا''۔ آشا پریشانی کے عالم میں بولی۔ اس کی چھٹی حس خطروں کی نشاندہی کر رہی تھی۔

''اسی پارک میں ٹھہرو، میں ابھی پہنچ رہی ہوں''۔ اس نے چلا کر کہا مگر اس بیچ نعمان ٹیلی فون بند کر چکا تھا جس کے بعد اس نے اپنی جیب کی تلاشی لی اور قبرستان کی طرف بڑھ گیا۔ طوفان باد و باراں عروج پر پہنچا تو نعمان کی پھوپھی کو تشویش لاحق ہوگئی۔

''لڑکے کو ڈھونڈو، وہ گھر میں نہیں ہے، نعمان چلا گیا ہے، کہیں نہیں مل رہا، جلدی کرو، اسے ڈھونڈ نکالو''۔ خاتون نے شور برپا کر دیا اور اونچی غمزدہ آواز میں رونے لگی۔ چند باہمت احباب فوراً نعمان کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ گھر میں افراتفری مچ گئی۔ شادی کی تقریب تتر بتر ہوگئی۔

آشا پارک میں پہنچی تو نعمان وہاں موجود نہیں تھا۔ وہ دیوانہ وار ادھر اُدھر بھاگتی رہی مگر اسے وہ کہیں نہ دکھائی دیا۔ اب وہ اسے پکارنے لگی تھی۔ اس کی صدائیں تیز ہوا کے دوش پر بکھرتیں تو ابر کی گھن گرج میں دب کر رہ جاتی تھیں۔ مایوس ہو کر وہ قبرستان کی طرف چل پڑی۔

دھرتی پر گھٹاٹوپ اندھیرا چھا چکا تھا۔ ایک تو شام گہری ہو چکی تھی پھر گرجتے بادل بھی کم کالے نہیں تھے۔ جلد ہی باراں میں اولے رچنے لگے۔ ہوا کے گرداب گاڑی کی سطح پر ٹکراتے تو تنہائی میں آشا کا دل دہلنے لگتا۔ وہ بصد مشکل گاڑی بھگاتی ہوئی قبرستان پہنچ گئی۔ اب وہ طوفان باراں میں اندھا دھند بھاگ رہی تھی اور تقریباً حواس باختہ ہو چکی تھی۔

نعمان اپنی ماں کی قبر پر اوندھا پڑا ہوا تھا، کیچڑ میں لت پت۔ اس کی نبض تھم چکی تھی اور منہ میں جھاگ بھرا ہوا تھا۔ وہ مر چکا تھا۔ آشا نے اس کا بازو چھوڑا تو قبر کے کیچڑ میں دھنس گیا۔ چیخ آشا کے حلق سے نکلی اور طول و عرض میں پھیل گئی۔ اسے لگا جیسے طوفان باراں قبروں سے ٹکرا کر ماتمی نغموں میں ڈھل گیا تھا اور ماتمی صداؤں سے پوری کائنات گونج اٹھی تھی۔ فلک بھی سوگوار ہو کر رو پڑا تھا۔ اگلے روز نعمان کی پوسٹ مارٹم رپورٹ مل گئی۔ اس نے پوٹاشیم سائی نائیڈ کھا کر خودکشی کر لی تھی۔

اس کی جیب سے ملنے والی اشیاء میں فون، کرنسی نوٹ اور ماں کی تصویر کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ اس نے انگلی میں وہ انگوٹھی پہن رکھی تھی جو آشا نے اسے تحفے میں دی تھی۔ دس روپے کا نوٹ اس نے پھوپھی سے مذاقاً چھین لیا تھا۔ لوبیاہتا جوڑے کو سلامی دینے کی خاطر۔ زہر اس نے کہاں سے حاصل کیا؟ یہ معمہ حل نہ ہو سکا۔

O

اگر گھر والوں کے دل میں صاحباں کے لئے محبت کی کوئی جگہ مزید باقی ہوتی تو ضرور آج بھر جاتی لیکن افسوس کہ یہ پیمانہ پہلے ہی چھلک رہا تھا۔

صاحب خاتون

☆ ---------- وقار احمد ملک

دادی شگراں کے صندوق میں جانے کون سا قارون کا خزانہ رکھا ہوا ہے کہ کسی کو اس کے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیتیں۔ بچے تو خیر بچے ہیں بڑوں کو بھی صندوق کھولنے کی اجازت نہیں۔ وہ کھول بھی کیسے سکتے

ہیں اس پر تو کنڈیاں کے فتح محمد لوہار کا بنا ہوا موٹا سا تالا لٹک رہا ہے جس کے بنے ہوئے تالوں کو دور سے دیکھ کر ہی چور بھاگ جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب انگریز خوشاب کے مقام پر دریائے جہلم کا پل بنا رہا تھا تو اس نے اس کی تعمیر کے دوران فتح محمد کی کاریگری کی شہرت سن کر اس کو اچھے خاصے پروٹوکول کے ساتھ پل کی تعمیر میں معاونت کے لئے طلب کیا تھا۔ اس دور میں ویلڈنگ کے جوڑ ایجاد نہیں ہوئے تھے اور اس کی جگہ ریپٹ وغیرہ کو استعمال کیا جاتا تھا۔ جہلم برج کی تعمیر میں یہ کام فتح محمد کی کاریگری کا ایک یادگار نمونہ ہے۔ جہلم برج کی تکمیل کو سو سال سے زیادہ ہو گئے لیکن کنڈیاں کے لوہار کی لگائی گئی ریپٹیں آج بھی اسی مضبوطی سے موجود ہیں۔

ایک دن چاچی مہراں کو کسی طرح اس صندوق کی چابی ہاتھ لگ گئی۔ اس وقت دادی شکراں باہر چھپرے کے نیچے تخت پوش پہ ظہر ادا کر رہی تھیں۔ دادی دو رکعت نماز نفل کی نیت باندھ ہی رہی تھیں کہ چھٹی حس نے ان کو سب کچھ بتا دیا۔ وہ چھپرے سے نکل کر لاٹھی ٹیکتی جب کمرے کی طرف بڑھیں تو چاچی چابی تالے میں ڈال چکی تھیں۔ لاٹھی کی آواز سن کر انہوں نے جلدی سے چابی نکالنے کی کوشش کی تو چابی تالے میں پھنس گئی۔ چاچی سے کچھ بن نہ پایا تو وہ باہر بھاگیں۔ دروازے پر ہی دادی اور چاچی کا آمنا سامنا ہو گیا۔ دادی نے اس وقت تو کچھ نہ کہا لیکن جب کمرے کے اندر آ کر چابی کو تالے میں لگا دیکھا تو بجلی کی پھرتی سے لاٹھی ٹیکتی ہوئی باہر صحن کی طرف لپکیں۔ اس دن چاچی کے ساتھ جو حشر نشر دادی شکراں نے صلواتیں سنا کر، لاٹھی لہرا کر اور غصے سے بھرپور بددعاؤں کے ساتھ تالیاں بجا کر کیا اس کے اثرات یوں دکھائی دیے کہ پھر کبھی کسی نے دادی شکراں کا صندوق کھولنے کا خواب دیکھنے کی بھی جرأت نہیں کی۔

اکثر اوقات دیکھا گیا کہ دادی چپکے چپکے صندوق کھولتیں اور مبہوت نگاہوں سے صندوق کے اندر دیر تک تکتی رہتیں۔ اکثر ان کی خشمگیں آنکھیں پرنم دیکھی گئیں۔ جب وہ صندوق کو بند کرتیں تو تالے کو اچھی طرح چیک کر لیتیں۔ صندوق کے بارے چہ میگوئیاں عرصے سے جاری تھیں۔ کوئی کہتا کہ دادی کے پاس سونے کی اینٹ پڑی ہوئی ہے جو انہوں نے قیام پاکستان کے بعد موجودہ مکان کے فرش کی کھدائی کر کے حاصل کی تھی جس کا مالک تقسیم سے پہلے ایک ادھ لکھا کراڑ منگل سنگھ ہوا کرتا تھا۔ کوئی کہتا کہ اس صندوق میں دادی کے جوانی کے زیور اور کپڑے پڑے ہوئے ہیں جن میں ان کی شادی کا لباس بھی شامل ہے۔ کوئی الہڑ دوشیزہ تو یہ تک کہہ دیتی کہ اس میں محبت کی کوئی پرانی نشانیاں موجود ہیں جو دادی کو اس کے نامعلوم محبوب نے ایام جوانی میں تحفے کے طور پر دی تھیں۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اصل مسئلہ کبھی حل نہ ہو پایا۔ کئی مرتبہ دادی سے پوچھنے کی کوشش کی گئی لیکن دادی نے کوئی جواب نہ دیا اور الٹا غصیلی نگاہوں سے سوال کرنے والے کو تکنا شروع کر دیتیں۔

دادی کو سردیوں کا موسم بہت بھلا لگتا تھا۔ وہ سردیوں میں دوپہر اور سہ پہر کے وقت دھوپ میں بیٹھ کر ہم سب سے خوب گپیں لگاتیں۔ دادی اماں کے کمرے کے ساتھ باورچی خانہ تھا جس میں گھر کے تمام افراد ایک ساتھ صبح چائے پیتے اور رات کو کھانا کھاتے۔ دن کا کھانا انفرادی طور پر کھایا جاتا تھا۔ سردیوں میں اس باورچی خانے کا اپنا ایک چارم ہوا کرتا تھا۔ یہ پورے کمرے پر مشتمل ایک کچی عمارت تھی۔ جس کو دھوئیں نے سیاہ کر دیا تھا۔ فرش بھی مٹی کا لیپ دے کر بنایا گیا تھا۔ اس کمرے کی چاروں دیواروں کے ساتھ چارپائیاں پڑی رہتی تھیں۔ جب آگ بجھ جاتی تو تمام لوگ چارپائیوں پر چڑھ جاتے اور رضائیاں اور کمبل اوڑھ لیتے۔ رات دیر

گئے تک ادھر اُدھر کی گپیں ہانکی جاتیں، کہانیاں سنائی جاتیں، رشتے بنائے اور توڑے جاتے۔ تمام کنبے کے بیچ دادی اماں بہت فخر اور خوشی محسوس کرتیں۔ گھر والوں میں سے دادی سب سے زیادہ مجھ سے انس رکھتی تھیں۔ شاید اس وجہ سے کہ میں ہمیشہ سے ان کی چھوٹی موٹی ضروریات کا خیال رکھا کرتا تھا۔ جب سے میں پڑھنے کے لیے لاہور گیا تھا دادی کی محبت مجھ سے کچھ اور بھی بڑھ گئی تھی۔

اس مرتبہ جب میں سردیوں کی چھٹی آیا تو گلابی جاڑا اپنے عروج پر تھا۔ دوپہر تک صبح کا عالم رہتا اور سہ پہر سے ہی شام کے سرد سائے پڑنا شروع ہو جاتے۔ سردیاں شاید اسی وجہ سے جلد گزر جاتی ہیں کہ زیادہ وقت تو ہم سو کر گزار دیتے ہیں اور یہ بھی سچ ہے کہ اچھے دن پلک جھپکتے گزر جاتے ہیں جبکہ برے دن موسمِ گرما کی طرح گزارے نہیں گزرتے۔ یہ 31 دسمبر کی رات تھی جب رات کے کھانے کے دوران ہی دادی اماں نے اپنے ایامِ ماضی کی بوسیدہ کتاب کی ورق گردانی شروع کر دی۔ ارے یہ کیا؟ بوسیدگی میں کیسی رنگینی پوشیدہ تھی اس کا اندازہ تو ہمیں اُس رات ہوا۔ دادی شکراں نے اپنی بہنوں فاطمہ، سیداں بی بی، امیراں بی بی اور صاحب خاتون کے ساتھ گزرے دنوں کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔ سال کی آخری رات ابر آلود اور انتہائی سرد تھی۔ برفیلی ہوائیں عجیب ہیبت ناک آوازیں پیدا کر رہی تھیں۔ کھانے کے بعد دادی اماں نے اپنی چارپائی پر لیٹتے ہی اپنی ایامِ گزشتہ کی داستاں شروع کر دی۔ تمام اہلِ خانہ اپنی جگہ پر موجود رہے۔ سبھی یہی سوچ ہوئے تھے کہ ابھی کہانی ختم ہو گی اور اپنے اپنے کمروں میں جا کر سو جائیں گے۔

صاحب خاتون ہم بہنوں میں سب سے خوبصورت اور سب سے چھوٹی بہن تھیں۔ اس وقت ہم لوگ کندیاں میں رہا کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کوئی نوجوان آٹھ جماعتیں پڑھ جاتا تو اس کو اسی دن جے ٹی استاد بھرتی کر دیا جاتا تھا۔ دسویں جماعت پاس کو ہیڈ ماسٹر مقرر کر دیا جاتا تھا۔ ناخواندگی کے ایسے زمانے میں بھی صاحباں پانچ جماعتیں پڑھی ہوئی تھی۔ یاد رہے کہ ہمارے علاقے میں صاحب خاتون نامی ہر عورت کا مختصر نام صاحباں ہوتا ہے۔ صاحباں زمیندار اخبار کی خبریں پڑھ کر ہمیں سناتی اور اسلامی کتابیں پڑھ کر ہمیں مسئلے سمجھایا کرتی تھی۔ ہمارے محلے کی عورتیں اس کو کشمیری سیب کہہ کر پکارا کرتیں۔ ایک دفعہ ہم ریل میں بھکر جا رہی تھیں جس میں ایک انگریز خاندان بھی سوار تھا۔ ان میں ایک بوڑھے انگریز نے صاحباں کو دیکھ اس سے انگریزی میں گفتگو شروع کر دی۔ میری بہن جو بہت شرمیلی اور مردوں سے دور دور رہنے والی لڑکی تھی کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ ہمیں اور اس کو اس بڈھے انگریز کی اس بدتمیزی پر بڑا غصہ آیا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد اس انگریز کی بیٹی جو اردو بھی جانتی تھی نے ہمیں یہ کہہ کر ٹھنڈا کر دیا کہ ابو آپ کی بہن کی سفید رنگت اور پرکشش چہرے کی وجہ سے اس کو انگریز سمجھ بیٹھا ہے۔ اس کی بات یاد کر کے کتنے ہی دن ہم ہنستے رہے تھے۔

صاحباں کی رنگت اتنی شفاف تھی کہ جب وہ پانی پیتی تو سچ مچ پانی اس کی گردن سے نیچے جاتا نظر آتا۔ اس کے بال سنہری اور گھنگریالے تھے۔ میں اور صاحباں ایک دوسرے کو کنگھی کیا کرتی تھیں۔ میں جب اس کے بال سنوار رہی ہوتی تو اس کی لٹوں میں سے ایک عجیب قسم کی خوشبو محسوس ہوتی۔ بہن کے بال سنوارتے ہوئے مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں صندل کے جنگلوں میں بھٹک گئی ہوں جہاں سنہری روشنی اور عجیب خوشبوئیں مجھے باہر نہیں نکلنے دے رہیں۔ کنگھی کرنے کے بعد میں مبہوت ہو کر اس کے بائیں رخسار پر ہلکے بھورے رنگ کے تل کو کتنی ہی دیر تکتے ہوئے سوچتی رہتی کہ میری بہن کے بھاگ

جانے کس بھاگ بھرے کے ہاتھ پر لکھے ہوئے ہوں گے۔ صاحباں کی نیلی آنکھوں میں کندیاں کے قریب بہتے ہوئے سندھو کے پانیوں جیسی اتھاہ گہرائیوں کا گمان ہوتا۔ صاحباں ہم تمام بہنوں کی طرح کبھی بھی کھلکھلا کر نہیں ہنستی تھی۔ اگر کوئی زیادہ خوشی یا دلجوئی کی بات ہوتی تو وہ محض ایک زیرِلب مسکراہٹ پر ہی اکتفا کرتی۔ اس کی آواز کبھی بلند نہیں ہوئی تھی اور صرف انتہائی ضرورت کے وقت ہی بولا کرتی تھی لیکن اس کے آنکھیں ہر وقت محوِ گفتگو رہتیں۔ اس کے آنکھیں، ابرو اور ہونٹ زباندانی کا کام کیا کرتے۔ وہ سلائی کڑھائی کی ماہر تھی۔ میز پوشوں اور پوشاکوں کے ایسے ایسے نمونے کشید کرتی کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے۔ صبح تڑکے یا شام ڈھلے جب ہم محلے کی لڑکیاں سندھو کے پانیوں سے گھڑے اور گاگریں بھرنے جایا کرتیں تو راہ گیر رک رک کر فطرت کے اس شاہکار کو دیکھا کرتے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بابا نے صاحباں کے باہر نکلنے پر پابندی لگا دی تھی۔ وہ چپکے سے گھر بیٹھ گئی۔

صاحباں کے سگھڑاپے کے سب معترف تھے۔ وہ صبح سے شام تک ہر قسم کے گھریلو کام میں مصروف رہ کر خوشی محسوس کیا کرتی تھی۔ ہمارا صحن کچا تھا جہاں مٹی کے لیپ کا فرش بنایا گیا تھا۔ صاحباں جب صحن میں جھاڑو لگایا کرتی تو اس کے چہرے پر ایک عجیب مسکراہٹ رقصاں رہتی۔ موسم چاہے جیسا ہی کیوں نہ ہو وہ ہر وقت اپنے جسم کو باریک دوپٹے کی بجائے ایک سبز موٹے کپڑے کی چادر سے ڈھانپے رکھتی تھی۔ کبھی کبھار انجانے میں اس کے سنہرے گھنگھریالے بالوں کی ایک لٹ جھاڑو لگاتے ہوئے روشن پیشانی پر رقص کناں ہو جاتی۔ لیکن وہ حسنِ لاپروا اپنے کام میں ایسا مگن ہوتا کہ اس کو اپنی تو درکنار اپنے اردگرد کی بھی کچھ خبر نہ ہوتی۔

تمام لوگ مبہوت ہو کر دادی جان کی داستان سن رہے تھے۔ باہر سرد جھکڑ آہستہ آہستہ تیز ہو کر پُراسرار ماحول تخلیق کر رہا تھا۔ کچھ لوگ دیواروں کے پاس بچھائی گئی چارپائیوں کے گرم لحافوں میں بیٹھے یا لیٹے تھے اور کچھ ابھی تک دہکتی ہوئی آگ کو سینکتے ہوئے دادی اماں کی داستان سن رہے تھے۔

"ریل کا پہیہ ہمارے علاقے میں نیا نیا چلا تھا۔ کندیاں میں لوکو شیڈ بنا تو دور دور سے ماہر کاریگر یہاں بھرتی ہوئے۔ ان میں واں کیلے کا ایک ادھیڑ عمر غلام محمد بھی تھا۔ وہ ایک جفاکش اور مزدور گھرانے کا انتہائی ایماندار اور محنتی فرد تھا۔ اس کے ذہن پر ایک خبط سوار تھا کہ کسی طرح اپنے جواں سال بیٹے غلام رسول کی شادی کا بندوبست ہو جائے۔ عبدالرحمان روزانہ کتنے ہی لوگوں سے اس بابت بات چیت کرتا۔ ایک روز اس کے ساتھی فتح محمد لوہار نے ہمارے والد کا تذکرہ کیا۔ اگلے دن ہی وہ دونوں ہمارے دروازے پر کھڑے تھے۔ غلام محمد کو صرف دو چکر اور لگانے پڑے۔ بابا نے اماں سے تذکرہ اور مشورہ کر کے صاحباں کے رشتے کی ہاں کر دی۔ ان کی سادگی دیکھیں کہ نہ گھر دیکھا اور نہ ہونے والا داماد۔ اللہ کے توکل پر رشتہ منظور کر لیا اور اگلے ماہ بیٹی کو سادگی کے ساتھ بیاہ دیا۔

واں کیلا ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جو کندیاں سے مشرق کی طرف کوئی تین میل کے فاصلے پر تھا۔ صاحباں کا نیا گھر بھی سادگی کا مرقع تھا لیکن انتہائی خوبصورتی سے بنایا گیا تھا۔ صاحباں کو شمالی کمروں کے اوپر بنی ماڑی بہت پسند تھی۔ برسات کے دنوں میں وہ اس ماڑی میں بیٹھ کر رم جھم رت کے مزے لیتی۔ غلام رسول کو تو شادی کے بعد چپ سی لگ گئی تھی۔ اس کو تو شادی کی بھی امید نہ تھی اور اس کو حور مل گئی تھی۔ اس کے شب و روز عجیب سرمستی کے عالم میں گزر رہے تھے۔ چند ہی دنوں میں پورے قصبے میں خبر پھیل گئی کہ غلام رسول کی بیوی پانچ

جماعتیں پڑھی ہوئی ہے اور کتابیں بھی پڑھ لیتی ہے۔ کسی نے چٹھی پڑھوانی ہوتی یا لکھوانی ہوتی ادھر ہی کا رخ کرتے تھے۔ دھاری رام سنگھ جو اس علاقے کا واحد پڑھا لکھا آدمی تھا اور اس کا گزر بسر چٹھیاں لکھنے لکھانے پر ہی تھا کا روزگار محدود ہو گیا اور بیچارے کو بڑھاپے میں بڑھئی کا کام دوبارہ شروع کرنا پڑا تھا۔

صاحباں سلائی کڑھائی میں بھی ماہر تھی۔ چند ہی دنوں میں اس کی کڑھائی کے نمونے اکثر گھروں میں پہنچ گئے۔ رنگوں کا چناؤ اور بنت کی صفائی انتہائی دیدہ زیب ہوا کرتی تھی۔ ہر پھول کاڑھتے ہوئے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس میں اس گل رخ لڑکی کی خوشبو اور خوبصورتی بھی ڈھلتی جا رہی ہو۔"

داستاں جاری تھی۔ رات کا پہلا پہر گزرنے والا تھا۔ بادلوں نے گرجنا شروع کر دیا تھا۔ کمرہ ہر طرف سے بند کر دیا گیا تھا تاکہ ہوا کا معمولی سا جھونکا بھی اندر داخل نہ ہو سکے۔ اس احتیاط کے باوجود کمرے میں خنکی بڑھتی جا رہی تھی۔ پاؤں برف کے ہو گئے تھے لیکن کہانی میں دلچسپی سے تمام لوگ سانس روکے دادی اماں کی محبتوں سے بنی مالا کی کھنک سن رہے تھے۔

"صاحباں کے چرچے تیزی سے پھیل رہے تھے۔ واں کیلے میں موضوع گفتگو ہر جا غلام رسول اور اس کی بیگم صاحباں بن چکے تھے۔ وہ غلام رسول جس کو چار آدمی اپنی محفل میں بٹھانے سے گریزاں ہوا کرتے تھے اب علاقے بھر میں ایک ہیرو بن چکا تھا۔ صاحباں پہلی عورت تھی جس سے عورتوں نے حسد کی بجائے پیار کیا۔ سسر کی وہ آنکھوں کا تارہ بن چکی تھی۔ سسر کے بھائی اور ان کے اہل خانہ بھی صاحباں کے گرویدہ تھے۔ یہ سارے لوگ چاہتے تھے کہ وہ کوئی کام نہ کرے اور وہ چاہتی تھی کہ وہ سارے، کام خود سے کرے۔ شادی کے بیسویں دن وہ اپنی نندوں کے ساتھ قصبے ... [illegible] صلے پر موجود کھو سے پانی لانے کے لئے تیار ہو گئی۔ گھر کے تمام لوگوں نے اس کو منع کیا لیکن وہ کہاں رہنے والی تھی۔ اس کو پانی نکالنے اور گھر لانے کا کام بہت پسند آیا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ کھو گھر سے کافی فاصلے پر تھا اور راستے میں اس کو بیسیوں عجیب و غریب نگاہوں کا سامنا کرنا پڑتا۔

صاحباں کو اس صورت حال نے فکر مند کر دیا۔ پانی گھر کے لئے ضروری تھا اور ہوس پرست نگاہیں ایک رکاوٹ بن چکی تھیں۔ اس نے سسر غلام محمد سے اشاروں میں گھر کھوئی یا چھوٹا کنواں کھدوانے کی بات بھی کی لیکن ایسے ہی اشاروں میں اس کو جواب بھی مل گیا۔ وہ سمجھ گئی کہ گھر کی محدود آمدن میں یہ ممکن نہیں۔ اگلے دن صاحباں نے کندیاں کا رخت سفر باندھا اور دو دنوں بعد واپس آکر چاندی کے سکوں کی چھوٹی سی گٹھڑی سسر کے قدموں میں رکھ دی۔ غلام محمد حیران ہوا کہ اتنے سارے پیسے وہ کہاں سے لے آئی۔ صاحباں نے بتایا کہ میری بڑی بہن نے بڑی محنت سے میرے لئے کندیاں میں ایک مکان بنوایا تھا۔ بہن فاطمہ کا خیال تھا کہ میں اپنے گھر سے کوسوں دور زیادہ دیر نہیں رہ سکوں گی۔ اس لئے میرا کندیاں میں ٹھکانا ہونا چاہیے لیکن میں شادی کے بعد اب واں کیلے کو ہی اپنا گھر سمجھ بیٹھی ہوں اور وہ کندیاں والا گھر میرے لئے فضول تھا۔ چنانچہ اس کو بیچ کر یہ پیسے لے آئی ہوں تاکہ آپ اپنے گھر میں کنواں کھدوا لیں۔

اگر گھر والوں کے دل میں صاحباں کے لئے محبت کی کوئی جگہ مزید باقی ہوتی تو ضرور آج بھر جاتی لیکن افسوس کہ یہ پیمانہ پہلے ہی چھلک رہا تھا۔ تین ہفتوں کی مشقت کے بعد کھوئی تیار ہو گئی۔ وہ دن نہ صرف غلام محمد کے گھرانے کے لئے بلکہ پورے محلے کے لئے خوشی سے لبریز تھا جب کنویں کی گہرائیوں میں سے پانی رسنا شروع ہو گیا اور شام تک کنویں کا پیٹ صاف شفاف اور ٹھنڈے

پانی سے بھر گیا۔ تمام عورتیں اس بات پر خوش تھیں کہ اب ان کو بہت دور ارائیوں کے کھو پر نہیں جانا پڑے گا۔ دیورانی نور بھری نے تو سرمستی کے عالم میں صاحباں کا منہ چوم لیا"۔

باہر بارش برسنا شروع ہو گئی تھی۔ تیز ہوا اور بارش کا زور گلی کے درختوں میں سائیں سائیں کی آوازیں پیدا کر رہا تھا۔ ہمارے گھر میں موجود درخت کا ایک کمزور سا ٹہنا ابھی ابھی دھڑام سے گرا تھا۔ لیکن مجال کہ کسی نے باہر کان بھی دھرا ہو۔ توجہ کا محور دادی اماں ہی تھیں۔

دو ہفتوں بعد اچانک صاحباں کی کمر میں ہلکا ہلکا درد شروع ہو گیا۔ دیسی ٹونے ٹوٹکے استعمال کیے گئے لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ غلام رسول اپنی دلہن کو حکیم کو دکھانے میانوالی لے آیا۔ دوا لینے کے بعد دونوں شام کو کندیاں آ گئے ۔رات کو صاحباں کی کمر میں شدید درد ہونے لگا۔ مقامی حکیم چاچا انصاری کو بلایا گیا جس نے اس کا علاج خراب خون کے اخراج میں سمجھا۔ صاحباں کے پاؤں کے اوپر چاقو سے کٹ لگایا گیا۔ لال لال خون کی ایک تیز دھار بہہ نکلی۔ حکیم سے مہلک غلطی سرزد ہو چکی تھی۔ اُن دنوں پڑیوں کی بیماری پھیل رہی تھی۔ جسم کو زخم لگانا جراثیم کو اپنی طرف کھینچنے کے مترادف تھا۔ شہر سے باہر ریلوے لائن سے متصل ریت کے ٹیلوں کے قریب چند کوٹھڑیاں بنائی گئی تھیں جن میں پڑیوں کے مریضوں کو آبادی سے دور رکھنے کے لئے قید کر دیا جاتا تھا۔ ان کوٹھڑی کا دروازہ باہر سے بند کر دیا جاتا تھا۔ کھڑکی کی جگہ ایک چھوٹا سا سوراخ موجود تھا جس میں اس بدقسمت مریض کا کوئی عزیز صبح شام کسی پرانے برتن میں کھانا لپیٹ کر پھینک جایا کرتا تھا۔ وہ برتن واپس نہیں لیا جاتا تھا۔ اس مریض کے لئے تادم مرگ وہ کوٹھڑی زندگی کے تمام لوازمات پورے کرنے کا واحد کمرہ ہوا کرتی تھی۔ اکثر مریض رو رو کر موت کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔

تیسرے دن صاحباں جب سویرے اٹھی تو اس کو بغل کے نیچے جلن محسوس ہوئی۔ ہاتھ لگایا تو گلٹی محسوس ہوئی۔ شام تک ایک اور کوٹھڑی ریلوے لائن کے قریب ریت کے ٹیلوں کے پاس بن چکی تھی۔ ایک حسین عورت کو مردوں والی کوٹھڑی میں قید کرنا خلاف شریعت اور خلاف معاشرت تھا۔ دوپہر کے وقت وہ دوسری مرتبہ اپنے والدین کے گھر سے رخصت ہو رہی تھی۔ پہلی رخصت کو آج پورا سال ہو چکا تھا جب وہ لال پیلے جوڑے میں دلہن بن کر پیلے ہاتھوں پیا دیس سدھاری تھی۔ آج صاحباں کے میلے کچیلے کپڑے اور ہی منظر پیش کر رہے تھے۔ ایک سیاہ رنگ کی چادر سے اس نے اپنے جسم کو ڈھانپ رکھا تھا۔ گھر سے نکلنے کے بعد وہ سرخ اینٹوں والے کھو کے قریب سے گزری جس کو بیچ کر اس نے چند دن پہلے ہی وال کیلا میں کنواں کھدوایا تھا۔ ریت کے سنسان ٹیلوں میں گھری ہوئی ویران کوٹھڑی میں صاحباں نے خاموشی سے ڈیرے لگا دیے۔ شاید اس کو پتہ تھا کہ یہ چند روزہ قیام ہے"۔

رات ڈھلنے لگی تھی۔ بارش ہنوز جاری تھی۔ گلی میں بارش کا پانی پہاڑی ندی کی سی آواز پیدا کرتا گزر رہا تھا۔ کمرہ نئے سال کی ٹھنڈک سے لبریز ہو چکا تھا۔ چولھا کب کا خشک اور ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ لیکن تمام سامعین کا خون جوش کھا رہا تھا۔ کہانی کی جذباتی شدت نے میرے ماتھے پر تو پسینے کے ننھے ننھے قطروں کی چمک پیدا کر دی تھی۔

"شام کا اندھیرا چھا دکا تھا اور صاحباں اپنی موت کی جلد آمد کی دعا مانگ رہی تھی۔ وہ خوفناک تاریکی، تنہائی اور خاموشی سے خوفزدہ ہو رہی تھی کہ اچانک کوٹھڑی کے باہر کسی کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ وہ حیران بھی تھی اور خوش بھی تھی کہ عزرائیل نے دیر نہیں کی اور مجھے تنہائی کی اذیت سے بہت جلد نجات مل گئی۔ لیکن یہ موت نہیں

تھی بلکہ غلام رسول تھا جو اس کے لئے رات کا کھانا لایا تھا۔ روشندان نما کھڑکی سے کھانا پرانے برتنوں میں اندر پھینک دیا گیا۔ دو چمکدار آنکھیں دیر تک اندر گھورتی رہیں۔ صاحباں نے برتنوں کو ہاتھ بھی نہ لگایا اور پوری رات آنکھوں میں کاٹ دی۔

تیسرے دن صبح سے ہی بادل چھائے ہوئے تھے۔ غلام رسول جب ناشتہ لے کر پہنچا تو کن من شروع ہو چکی تھی۔ یہ موسم صاحباں کو بہت پسند ہوا کرتا تھا۔ اس کو امید تھی کہ وہ ضرور سوراخ نما کھڑکی سے باہر جھانک کر بادلوں اور ہواؤں کی آنکھ مچولی دیکھ رہی ہوگی۔ بارش کی پھوار اس کے نقرئی چہرے کو غسل دے رہی ہوگی۔ چیچک کے لئے بنائی گئی دو مردانہ کوٹھڑیاں وہ جلدی سے عبور کر گیا۔ تیسری کوٹھڑی میں اس کی محبت قید تھی۔ آج غلام رسول اپنی بیوی کے لئے دودھی والا حلوہ لایا تھا جو اس کو بہت پسند ہوا کرتا تھا۔ اس کو امید تھی کہ حلوے کی خوشبو صاحباں کی بھوک ہڑتال ختم کر دے گی۔ غلام رسول کوٹھڑی کے قریب پہنچا تو حسب معمول کوٹھڑی کے اندر باہر خاموشی طاری تھی۔ لگتا تھا کہ چیچک زدہ کوٹھڑی کی سانسیں تھم گئی ہوں۔ اس نے ناشتے والے برتن اندر پھینکنے سے پہلے سوراخ میں سے جھانکا تو صاحباں ایک کونے میں مٹی میں لت پت لیٹی دکھائی دی۔ اس نے پھرتی سے تالا کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ سانسوں کا دھاگہ ٹوٹ چکا تھا۔ صاحباں اوندھی لیٹی پڑی تھی۔ اس کے چہرے کے نیچے زمین گیلی ہو چکی تھی۔ شاید مرنے سے پہلے وہ کافی دیر روتی رہی تھی۔

ماڑی انڈس نامی ٹرین نے مغرب کے وقت روانہ ہونا تھا لیکن ابھی صبح ہو رہی تھی۔ میت کو شہر کے اندر لے جانا منع تھا۔ گھر سے چارپائی منگوا کر پیدل ہی جنازہ واں کیلا روانہ کر دیا گیا۔ کہتے ہیں کہ راستے میں جہاں سے بھی جنازہ گزرتا لوگ دور تک اس کو کندھا دیتے۔ سہ پہر ڈھلے جنازہ واں کیلا پہنچا۔ چیچک زدہ میت کو شہر داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ ماتمی قافلے کو رچھیاں کے قریب ہی رکنا پڑا۔ خانہ بدوش جو امیر والہ کے باہر جھگیاں اور کھیروں میں رہائش پذیر تھے نے کفن دفن میں مدد کی۔ ایک کھیرے کے اندر میت کو غسل دیا گیا اور کفنایا گیا اور شام ہونے سے پہلے رچھیاں کے قبرستان کی خاموش سی مسجد کے باہر بوڑھے شیشم کے درختوں کے قریب جنازہ ادا کر کے بابا موسیٰ مزار کے مغرب میں دفنا دیا گیا"۔

وادی خاموش ہو گئی تھیں۔ دور کسی مسجد سے اذانِ فجر کی سحر زدہ آواز گونج رہی تھی۔ بارش تھم چکی تھی لیکن ندی نما گلی میں پانی کا شور ابھی باقی تھا۔ تمام لوگ کھلی آنکھوں چھت کی کڑیوں کو گنتے محسوس ہو رہے تھے۔ ہر فرد چپ تھا جیسے وہ اس سحر زدہ داستاں کے طلسم کو جزوِ جاں بنانے کی کوشش کر رہا ہو۔ اچانک دادی اٹھیں اور لاٹھی ٹیکتی ٹیکتی اپنے صندوق کے قریب پہنچ کر اس کا تالا کھولنے لگیں۔ اندر سے ایک پرانا تھیلا اٹھایا اور اس میں سے دھیرے دھیرے ایک سفید میز پوش باہر نکالا جس پر سبز، سرخ اور پیلے رنگوں سے انتہائی دیدہ زیب نکاشی کی گئی تھی۔ لگتا تھا کہ چند دن پہلے ہی کسی انتہائی ماہر کاریگر نے اس کو کاڑھا ہے۔ کپڑے کو ہوا میں لہراتے ہوئے دادی تمام لوگوں سے مخاطب ہوئیں

"یہ واحد نشانی ہے میری بہن صاحباں کی جو اس کی موت کے بعد میں واں کیلا میں اس کے گھر سے اٹھا کر لائی تھی۔ ذرا دیکھو تو کیسے اس کپڑے سے میری بہن کے ہاتھوں کی خوشبو آ رہی ہے۔ اس کے فن، کاریگری اور نفاست کی یہ آخری اور واحد نشانی میری زندگی کی سب سے قیمتی متاع ہے۔"

صندوق کا راز عیاں ہو چکا تھا۔

☮☮☮

ہر خواہش پہ دم نکلے

ہماری بیگم بھی خوب ہیں۔ ڈرنے والی بات سے ڈرتی نہیں
اور نہ ڈرنے والی چیز سے خوب ڈرتی ہیں۔ پچھلے ہی دنوں کی بات
ہے گاندھی گارڈن میں چھپکلی سے ڈر کر شیر کی کچھار میں جا چھپی تھیں۔

جادوئی چراغ کے اس جن کی کہانی جس کی نوازشوں سے لوگ تنگ آجاتے تھے!

ایس امتیاز احمد

روز افزوں مہنگائی کے باعث ہماری بیگم کا مسلسل اصرار تھا کہ سبزیاں اگاؤ کہ دو پیسے بچیں اور وقتِ ضرورت کام آئیں۔ گھر کی کیاریوں میں لگے ہوئے پھولوں کو دیکھ کر اب وہ خوش ہونے کے بجائے ناک بھوں چڑھانے لگی تھیں اور اکثر یہاں تک کہہ اٹھتی تھیں کہ بھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان۔

ہم یہ تو نہیں کہتے کہ زن مرید واقع ہوئے ہیں البتہ یہ درست ہے کہ ہم بہت ہی سعادت مند اور فرمانبردار قسم کے شوہر ہیں اور اس ضمن میں اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے ہوئے عموماً یہ کہا کرتے ہیں کہ کامیاب ترین ازدواجی زندگی گزارنے کا راز ہمارے زریں اصول میں پوشیدہ ہے۔

چنانچہ جب بیگم کا اصرار بہت ہی شدت اختیار کر گیا اور ہم نے یہ سمجھ لیا کہ اب فرار کی کوئی صورت نہیں ہے تو لنگوٹ کس کر اور کھرپی ہاتھ میں سنبھال کر ہم نے پھولوں کے پودوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر کیاریوں کی مٹی درست کی۔ نرسری سے حاصل کی ہوئی وہ کھاد جس میں گوبر کے علاوہ کچھ نہیں تھا ڈالی اور مختلف سبزیوں کے بیج بونا شروع کر دیے۔ ایک مقام پر ہمیں زمین کچھ سخت معلوم ہوئی۔ کھرپی ماری تو پتہ چلا

کہ پتھر ہے۔ زمین میں پتھر ہو تو سبزیوں کی نازک مزاج جڑیں پھیل نہیں پاتیں۔ ہم نے مناسب سمجھا کہ زمین کے اس حصے کو پتھر سے نجات دلا دیں تاکہ ہماری سبزیوں کو پھولنے پھلنے میں کسی قسم کی دقت اور پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

لیکن عجیب قسم کا پتھر تھا، ہم جتنا زمین کو کھودتے وہ اتنا ہی زیادہ نیچے دھنستا گیا، پسینے آ گئے۔ صبح سے دوپہر ہو گئی۔ اتنی محنت اگر ہم کنواں کھودنے پر صرف کرتے تو اب تک کامیاب ہو گئے ہوتے۔

''موئی کیاری نہ ہوئی، وادی کشمیر ہو گئی کہ فتح ہونے میں نہیں آتی''۔ بیگم نے بگڑ کر کہا۔

ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے ہم نے بے بسی سے کہا۔''یہ بات نہیں ہے بیگم ایک کمبخت پتھر بیچ میں آ گیا ہے ہم چاہتے ہیں کہ سبزیوں کو اس کی دسترس سے دور رکھنے کے لئے اس کو باہر نکال دیں۔

''توبہ ہے شاہد!'' بیگم ہمارے پاس آ گئیں اور منہ سکیڑ کر کہا۔''تم تو عورت ہوتے تو زیادہ اچھا ہوتا۔ اتنا سا پتھر زمین سے نہیں نکال سکتے۔ ذرا دینا تو کھرپی''۔

ہم نے فوراً کھرپی ان کے ہاتھ میں تھما دی۔ دیکھیں جو کام ہم مرد ہونے کے باوجود انجام نہ دے سکے وہ اسے کس طرح پایہ تکمیل تک پہنچاتی ہیں لیکن ہوا یہ کہ ادھر انہوں نے کھرپی سنبھالی ایک ہاتھ پتھر پر مارا اور دوسرے ہی لمحہ وہ پتھر اچھل کر اس طرح اوپر آ گیا جیسے وہ پتھر نہیں بلکہ آٹے کا پیڑا ہو۔

حقیقت میں وہ پتھر نہیں تھا۔ آٹے کا پیڑا بھی نہیں تھا بلکہ پیتل کی چراغ نما کوئی چیز تھی جس میں ایک جانب ہینڈل تھا اور دوسری جانب سے وہ قدرے مڑا ہوا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ مستقبل قریب ترین میں بیگم ہماری مردانگی کو آڑے ہاتھوں لے کر ہمیں یہ پرانی اطلاع بہم پہنچائیں گی کہ تم جیسے مرد سے تو ہم عورت ہی بہتر ہیں

لیکن ہوا یہ کہ پیتل کی اس چراغ نما چیز نے اس کی ساری توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔ وہ اسے لئے ہوئے سیدھی باورچی خانے میں چلی گئیں۔ اپنے کام سے فارغ ہونے کے بعد ہم ان کے پاس پہنچے تو چولہے پر رکھی ہوئی ہانڈی جل رہی تھی اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اس بے ہنگم سی شے کا مشاہدہ کر رہی تھیں۔

ہم نے جلدی ہوئی ہانڈی کی طرف ان کی توجہ مبذول کرائی تو انہوں نے جلدی سے ایک لوٹا پانی اس میں ڈال دیا۔ پھر ہم سے مخاطب ہو کر بولیں۔''آخر یہ ہے کیا چیز؟''

''ہمیں تو یہ مچھلی کی کوئی قسم معلوم ہوتی ہے''۔

''اے لو، گھاس تو نہیں چر گئے۔ بالکل صاف پیتل کی چیز ہے جس میں ہینڈل تک موجود ہے اور تمہیں یہ مچھلی نظر آ رہی ہے''۔

''آج کل جس جگہ ہم رہتے ہیں کسی زمانے میں یہاں سمندر ہوا کرتا تھا''۔ ہم نے کہا۔''اور ماہرین نباتات کا کہنا ہے کہ ایک مچھلی ایسی بھی پائی جاتی ہے جو دیکھنے میں بالکل پیتل جیسی معلوم ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ.....''

''اور اس میں ہینڈل بھی ہوتا ہے''۔ انہوں نے ہماری بات کاٹ کر کہا۔

''نہیں ماہرین نباتات نے یہ تو نہیں لکھا لیکن کیا عجب ہے کہ پیتل جیسی مچھلی میں ہینڈل لگا ہوتا ہو اور آج جو ہینڈل اس جگہ لگا نظر آتا ہے اس کا آئیڈیا اس مچھلی کو دیکھ کر لیا گیا ہو''۔

''بھاڑ میں جائیں تمہارے ماہرین نباتات''۔ بیگم نے منہ بگاڑ کر کہا اور دوپٹے کے پلو سے اس چیز کو رگڑ کر چمکایا۔''دیکھو، بالکل صاف پیتل......''

مگر ان کا جملہ منہ کے اندر ہی رہ گیا۔ ایک عجیب سی زنانے کی آواز ہوئی اور بیک وقت ہم دونوں نے

دیکھا کہا کی بہت بڑا آدمی، جس کا قد کم سے کم آٹھ اور زیادہ سے زیادہ دس فٹ ہوگا، لنگوٹ باندھے دست بستہ باورچی خانے کے باہر کھڑا ہوا ہے۔

پچی بات تو یہ ہے کہ ہم اسے دیکھ کر ڈر گئے۔ پہلی نظر میں وہ ہمیں ڈاکو نظر آیا دوسری نظر میں خوفناک قاتل اور تیسری نظر میں ایم اے راحت والا صدیوں کا اصلی بیٹا۔ شاید ہماری گھگی بندھ جاتی اور ہم مع اپنی بیگم کے جلتے ہوئے چولہے میں گر کر بھسم ہو جاتے مگر ہم نے دیکھا کہ ہماری بیگم پر کسی قسم کا کوئی خوف طاری نہیں ہوا۔ وہ خشمگیں نظروں سے اس نو وارد کو گھور رہی تھیں۔ پھر اچانک بگڑ کر بولیں۔ ''تمہیں اس حالت میں یہاں آتے ہوئے شرم نہیں آئی۔ جاؤ یہاں سے اور کپڑے پہن کر آؤ''۔

''آپ کا حکم سر آنکھوں پر''۔ اس نے سر جھکا کر کہا پھر وہ گھوما اور زناٹے کی آواز کے ساتھ ہماری نظروں سے دور ہو گیا۔ ہم بیگم سے وضاحت طلب کرنا چاہ رہے تھے کہ تمہاری اس شخص سے کب اور کہاں ملاقات ہوئی تھی اب تک تم نے اس کے بارے میں ہمیں کیوں نہیں بتایا کہ اگلے ہی لمحے دوبارہ آواز ہوئی اور وہ شخص شاہی لباس پہنے اور کمر سے خمدار شمشیر لٹکائے ہوئے ایک بار پھر ہماری نظروں کے سامنے موجود تھا۔ اس کے جانے اور آنے میں مشکل سے دس پندرہ سیکنڈ صرف ہوئے ہوں گے۔

اس کی سج دھج دیکھ کر ہم نے ادب سے پوچھا۔

''جناب والا! آپ کون ہیں؟''

''ہم چراغ کے غلام ہیں''۔

''کون سا چراغ؟''

''وہ چراغ جو آج تمہاری بیگم نے کیاری سے نکالا ہے''۔

ہم نے کہا۔ ''وہ تو مچھلی کی ایک قسم ہے ماہرین نباتات......''۔

بیگم نے ہماری بات کاٹ کر کہا۔ ''نہیں وہ مچھلی نہیں بچوں کے کھیلنے کی صراحی ہے''۔

''صراحی؟'' ہم نے حیرت سے کہا۔ ''اگر ہمیں تمہاری خفگی کا احساس نہیں ہوتا تو یہ کہے بغیر نہیں مانتے کہ اسے کوئی آنکھوں کا اندھا اور عقل سے کورا شخص ہی صراحی کہہ سکتا ہے''۔

''ٹرزمت کرو''۔ بیگم کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔

''ہوسکتا ہے یہ چراغ ہی ہو۔ پرانے زمانے میں اس قسم کے چراغ استعمال کیے جاتے تھے۔ میں نے ایسے چراغوں کی تصویریں دیکھی ہیں''۔

پھر وہ اس شخص سے مخاطب ہو کر بولیں۔ ''کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ چراغ کیسے جلتا ہے؟''

اجنبی نے اپنے بڑے سے ہاتھ میں اس چیز کو لے کر اس کے اوپر اپنا دوسرا بڑا سا ہاتھ پھیرا۔ ہم دونوں کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اچانک اس میں تیل بھر گیا۔ ایک جانب تقریباً آدھ انچ بتی باہر نکل آئی اور پھر بتی نے جلنا شروع کر دیا۔

''کمال ہے بھئی؟'' ہم نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

بیگم بولیں۔ ''جب تمہیں ایسا کرتب آتا ہے تو ادھر اُدھر بھیک کیوں مانگتے پھر رہے ہو؟''

اس شخص نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے چراغ کو ہماری بیگم کے سامنے رکھ دیا اور ایک بار پھر اپنے سینے پر دونوں ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

ہم نے چراغ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کسی نے چیز اچھی ایجاد کی ہے''۔

''لیکن اس کی روشنی بالکل بیکار ہے''۔ بیگم نے حسب عادت ہماری بات کاٹی۔ ''اتنی روشنی میں تو ایک کمرہ بھی روشن نہیں ہو سکتا''۔ پھر وہ اجنبی سے مخاطب ہو

کر بولیں۔

''میرے خیال میں تم جادوگر ہو۔ کیا تمہارا کسی سرکس سے کچھ تعلق ہے؟''

''پانچ سال سے یہاں کوئی سرکس نہیں آیا''۔ ہم نے بیگم کی معلومات میں اضافہ کیا۔ ''اور نہ آج کل کا موسم سرکس کے لئے موزوں ہے اور بھائی اجنبی انسان چراغ کا کرتب تو تم نے خوب دکھایا۔ کیا تم ایسے دوسرے شعبدے بھی جانتے ہو؟''

''آپ کے ارشاد پر ہزار شعبدے دکھائے جا سکتے ہیں آقا!''

بیگم بولیں۔ ''ہم نے سنا ہے کہ بھارت میں ایسے شعبدے باز ہیں جو رسی کو ہوا میں کھڑی کر کے اس پہ چڑھ جاتے ہیں اور نظروں سے غائب ہو جاتے ہیں۔ کیا تم یہ شعبدہ ہمیں دکھا سکتے ہو؟''

''آپ کے حکم کی دیر ہے، سرکار!''

''اگر زیادہ پریشانی نہ ہو تو دکھا دو''۔ بیگم نے کہا۔ ''ہم تمہیں کچھ زیادہ انعام تو نہیں دے سکتے البتہ رات کا کھانا کھلا دیں گے''۔

اس نے میان سے تلوار نکال کر کپڑے ٹانگنے والی رسی کاٹی اور اسے ہوا میں اچھال دیا۔ بیگم احتجاج ہی کرتی رہ گئیں رسی کا ایک سرا زمین پر ٹک گیا اور دوسرا خطِ مستقیم کی صورت میں فضا میں بلند ہو گیا۔ دونوں ہاتھوں کی مدد سے اس نے اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ پہلے اس کی پگڑی غائب ہوئی پھر شاہانہ لباس اور تلوار اور آخیر میں سلیم شاہی جوتے بھی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

بیگم کو تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے ہم نے کہا۔ ''بھئی مانتے ہیں تمہیں اس شخص سے چھٹکارا حاصل کرنے کی تم نے کیسی عجیب ترکیب نکالی ہے''۔

''مجھے تو آج تک یقین نہیں آیا تھا کہ کوئی شخص رسی پر اس طرح چڑھ سکتا ہے''۔ بیگم ابھی تک اس کے شعبدے سے متاثر تھیں۔ ''چلو آج اپنی آنکھوں سے یہ شعبدہ بھی دیکھ ہی لیا''۔

انہوں نے پھونک مار کر چراغ بجھایا اور پلو سے اسے رگڑتے ہوئے بولیں۔ ''شام ہو رہی ہے میرے خیال میں رات کا کھانا۔

زناٹے کی آواز ہوئی۔ سامنے وہی اجنبی آ کھڑا ہوا۔

''تم پھر آ گئے؟''

''تابعدار ہوں حضور!''

ہم نے کہا۔ ''تم نے اسے کھانا کھلانے کا وعدہ کیا تھا''۔

بیگم نے سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیا۔ ''اتنا بڑا شخص ہمارے کمرے میں نہیں سما سکتا۔ تم اسے باہر لے کر گھاس پر بیٹھو میں ابھی کھانا لے کر آتی ہوں''۔

ہم اسے باہر لے گئے اور اس سے کہا۔ ''بیگم تمہارے لئے کھانا لا رہی ہیں''۔ وہ فوراً آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ ''کہو یار! تم کہاں کے رہنے والے ہو؟'' ہم نے پوچھا۔

''ہم چین میں رہتے ہیں''۔

''یہاں کیسے آنا ہوا؟''

''آپ نے بلایا اور خادم حاضر ہو گیا''۔

ہم نے کہا۔ ''لکھنوی تکلف چھوڑ دو۔ ذرا قاعدے سے انسانوں کی طرح بات کرو۔ سنا ہے چین میں افیم کا قحط پڑ گیا ہے؟''

بولا۔ ''آپ حکم دیں تو منوں کے حساب سے پیش کی جا سکتی ہے''۔ اسی وقت بیگم ٹرے کو لبالب بھر کر اس کے لئے کھانا لے آئیں۔ ''لو کھاؤ''۔

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ٹرے کا سارا کھانا کھا گیا۔ اس کے بعد چاہتا تھا کہ ٹرے کو بھی کھا جائے مگر بیگم نے منع کر دیا۔ ''نہیں نہیں یہ کھانے کی چیز نہیں ہے۔ ٹھہر۔

میں تمہارے لئے کچھ اور لاتی ہوں“۔

بیگم نے بھی کچھ اسے کھلا دیا۔ یہاں تک کہ دوپہر کا جلا ہوا سالن اور بچا کر رکھے ہوئے بھوسی ٹکڑے تک وہ بغیر ڈکار لئے ہوئے کھاتا چلا گیا۔ آخر میں بیگم نے اس سے معذرت چاہی اور کہا۔ ”تم یہیں سو جاؤ۔ اس وقت رات میں کہاں جاؤ گے۔ کمرے میں تمہارے لئے گنجائش نہیں ہے ورنہ تمہیں باہر سونے کی تکلیف نہ ہوتی“۔

بیگم کی بات سنتے ہی وہ وہیں لمبا لمبا لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر کے خراٹے لینے لگا۔

ہم دونوں اندر چلے گئے۔ بیگم نے ہمیں یہ مژدہ سنایا کہ آج ہمیں بھوکا ہی سونا پڑے گا اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا کہ آدمی ہے کام کا۔ اگر اس کا پیٹ اتنا بڑا نہ ہوتا تو وہ اسے اپنے ہاں ملازم کے طور پر رکھ لیتیں۔

”تمہیں اس سے ڈر نہیں لگتا؟“ ہم نے پوچھا۔

”نہیں معصوم سا بے ضرر شخص ہے۔ ہر بات ماننے کے لئے تیار اس سے بھلا کسی کو کیا ڈر لگ سکتا ہے“۔

ہماری بیگم بھی خوب ہیں۔ ڈرنے والی بات سے ڈرتی نہیں اور نہ ڈرنے والی چیز سے خوب ڈرتی ہیں۔ پچھلے ہی دنوں کی بات ہے گاندھی گارڈن میں چھپکلی سے ڈر کر شیر کی کچھار میں جا چھپی تھیں۔

رات گزر گئی۔ صبح کو ہم نے باہر نکل کر دیکھا تو وہ شخص جا چکا تھا۔ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اندر آئے۔ بیگم ہاتھ میں چراغ لئے ہوئے کھڑی تھیں۔ ہم سے کہنے لگیں۔ ”اسے رگڑ کر صاف کر لو۔ دوپہر کو کھوپرے والا آئے گا تو اس کے بدلے میں کھوپرا لے لیں گے“۔

ہم نے قمیص کی آستین سے اسے رگڑا۔ اسی وقت آواز ہوئی دیکھا کہ سامنے وہی شخص کھڑا ہوا ہے۔

”کہو بھئی! اب کیسے آنا ہوا؟“

”آپ کا حکم بجالانے“۔

بیگم باورچی خانے سے چلائیں۔ ”اس سے کہہ ہمارے پاس اسے پلانے کے لئے چائے نہیں ہے“۔

ہم نے یہی بات اسے بتائی تو بولا۔ ”کتنی چائے لا دوں؟“

یونہی کہہ دیا۔ ”ایک ایک پونڈ والے دس پیکٹ“۔

پندرہ سیکنڈ کے اندر ہمارے قدموں میں چائے کے دس پیکٹ پڑے ہوئے تھے۔ حیرت کو دباتے ہوئے ہم نے پوچھا۔ ”کچھ محنت کا کام کر سکتے ہو؟“

بولا۔ ”حکم دیجئے آقا!“

ہمارے گھر کے عقبی حصہ میں ابھری ہوئی چٹان تھی۔ بیگم کہا کرتی تھیں کہ چٹان نہ ہوتی تو وہاں گوبھی کی کاشت کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ ہم نے کہا۔ ”تم اس چٹان کو کاٹ سکتے ہو؟“

”سوال جواب نہ کیجئے سرکار! صرف حکم دیجئے“۔

ہم نے فوراً حکم دیا۔ ”جاؤ تین ہفتے کے اندر اندر چٹان کو کاٹ کر وہاں پر زرخیز علاقہ کی مٹی بھر دو“۔

وہ فوراً ہی چلا گیا۔

دفتر سے دوپہر ہی کو چھٹی مل گئی۔ گھر آئے تو بیگم منہ میں انگلی دبائے کھڑی تھیں۔

ہم نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

بولیں۔ ”ایسا جن آدمی تو ہم نے آج تک نہیں دیکھا، ذرا چل کر دیکھو ساری چٹان غائب ہے اور وہاں پر بہترین قسم کی مٹی پھیلی ہوئی ہے“۔

پہلی بار ہمیں چراغ کی اہمیت کا اندازہ ہوا، ہم نے کہا۔ ”وہ چراغ کہاں ہے؟ ذرا دینا تو“۔

بیگم نے پوچھا۔ ”کیا کرو گے؟“

”تمہیں اس کے بدلے میں کھوپرا لا کر دیں گے“۔

وہ ہنسیں پھر کچھ سنجیدہ ہو کر بولیں۔ "میں یہ سوچ رہی ہوں کہ چراغ میں کوئی معمہ پوشیدہ ہے۔ ادھر ہم اسے رگڑتے ہیں اور ادھر وہ ہمارے سر پر آن سوار ہوتا ہے"۔

ہم نے کہا۔ "لاؤ آزمائش کئے لیتے ہیں"۔

چراغ ہمیں دینے کے بجائے انہوں نے خود اسے رگڑا جب حسب معمول وہ شخص اگلے ہی لمحہ وہاں موجود تھا۔

"ہم تم سے جو کچھ منگائیں بغیر کسی معاوضے یا لالچ کے بالکل مفت لا کر دو گے؟" بیگم نے اس سے پوچھا۔

"حکم دیجئے سرکار والا!"

"اچھا تو ہمیں ایک بوری آٹا اور سیر بھر ارہر کی دال اور آدھے درجن انڈے اور آج کا اخبار اور ایک پاؤ دہی اور آدھا سیر ٹماٹر اور ایک سنسنی خیز ناول اور تھوڑا سا ہرا دھنیا اور سیر بھر پیاز لا دو"۔

ساری چیزیں آ گئیں تو انہوں نے پوچھا۔ "دوپٹے بھی لا سکتے ہو؟"

"حکم دیجئے غلام پرور"۔

"آدھے درجن دوپٹے نئے فیشن والے اور چھ زنانے سوٹوں کے لئے چھ عدد جاپان سے سمگل کئے ہوئے نئے پرنٹ اور چھ عدد ریشمی ازار بند اور تین عدد بناری ساڑھیاں خاص بنارس کی بنی ہوئی اور حیدر آباد کے امرود اور دو شیشیاں سنو کی اور ایک شیشی کریم کی اور ایک ڈبہ پاؤڈر کا اور پڑوسن کی بچی کے لئے ایک جھنجھنا اور شاہد میاں کے لئے شیو کی مشین بجلی والی لا دو۔ باقی چیزیں بعد میں منگاؤں گی"۔

دو ذراتوں میں جن میں سے ایک زناٹا جانے کا اور ایک آنے کا تھا، بیگم کی ساری مطلوبہ اشیاء کا ڈھیر لگ گیا۔ انہوں نے جلدی جلدی ان چیزوں کو دیکھا اور سمیٹ کر کمرے میں رکھ دیا۔ پھر ہم سے بولیں۔ "اب کیا منگائیں؟"

ہم نے کہا۔ "کچھ نہیں، فی الحال بیٹھ کر فہرست بناؤ"۔

بولیں۔ "اچھا دس روپے کی ہلدی تو منگا ہی دو، سالن کے لئے ضرورت ہے"۔

لیجئے جناب ہلدی بھی آ گئی ہے۔ ہم نے سوچا بیگم اتنا کام کرا رہی ہیں تو کیوں نہ تھوڑا کام ہم بھی کرا لیں۔

چنانچہ ہم نے کہا۔ "یار! ہمارا کمرہ بہت خستہ ہو رہا ہے، پچھلی بارش میں اس کی چھت بھی ٹپکی تھی، دیواریں بھی دو ایک جگہ سے چٹخ گئی ہیں۔ اگر ناگوار نہ گزرے تو اس کی بھی لگے ہاتھوں مرمت کر دو"۔

ہماری بات سنتے ہی وہ چلا گیا ہم بیگم کی چیزیں رکھنے میں لگ گئے۔ دبی زبان سے ہم نے یہ شکایت بھی کی کہ تم نے سب ہی کچھ منگوا لیا یہ نہیں ہوا کہ ہمارے لئے ایک شیروانی اور ایک آدھے سوٹ کا کپڑا منگوا دیتیں۔ ہمیں کچھ کے نام پر وہ چونکیں بولیں۔ "ابھی منگوایا ہی کیا ہے، اب کی مرتبہ اسے بازار بھیجوں گی تو تمہاری چیزیں بھی منگوا دوں گی۔ تم نے خواہ مخواہ اسے ایک ایسے کام میں لگا دیا ہے جو مزدوروں کے کرنے کا ہوتا ہے۔ آدمی شریف ہے منہ سے کچھ نہیں بولا لیکن اس کے چہرے سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اسے تمہاری بات ناگوار گزری ہے"۔

آدمی ہم بھی شریف ہیں اس لئے ہم نے بھی بیگم کے منہ لگنا پسند نہ کیا اور نہ کہنے کو بہت کچھ ہم بھی کہہ سکتے تھے۔ مثلاً دس روپے کی ہلدی والی بات۔ خیر صاحب بیگم کا سامان منگوا کر جب باہر نکلے تو ہم دونوں ایک دوسرے کا چہرہ حیرت سے تکتے رہ گئے۔ ہمارا کمرہ اپنی جگہ سے بالکل غائب ہو چکا تھا اور اب اس کی جگہ پر انتہائی شاندار قسم کا ماڈرن کمرہ موجود تھا جس سے غسل خانہ بھی اٹیچ تھا اور جس کا فرش موزائیک کا تھا اور جس کی دیواروں پر

رو بہالیک سے رنگ وروغن کیا گیا تھا اور جس میں بہترین قسم کا غیر ملکی بجلی کا سامان استعمال کیا گیا تھا اور اگرچہ ہم نے فرنیچر کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا تاہم کمرے کی مناسبت سے اعلیٰ قسم کا فرنیچر قالین اور صوفوں اور شوکیس الماریوں کے ساتھ موجود تھا۔ دیوار پر قائداعظم، قائد ملت کی تصاویر لگی ہوئی تھیں۔

بیگم نے ہم جیسے کھٹیچر قسم کے آدمی کا اتنا عالیشان کمرہ دیکھا تو تھوڑی دیر تک تو وہ اس طرح گم صم کھڑی رہیں جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو پھر وہ بھاگیں باورچی خانے کی طرف واپس آئیں تو ان کے ہاتھ میں چراغ تھا جسے وہ پوری قوت سے رگڑ رہی تھیں۔

"فرمایئے..... فرمایئے!" وہ شخص آ گیا لیکن بیگم نے پھر بھی چراغ کو رگڑنا ختم نہیں کیا۔

"دیکھ"۔ بیگم نے بالا خراسے حکم دیا۔ "تم نے جیسا یہ کمرہ بنایا ہے بالکل ویسا ہی بلکہ اس سے بڑھ کر ہمارے اس گھر کو دو منزلہ نہیں سہ منزلہ بنا دو۔ گھر میں ریڈیو، ٹی وی، ریفریجریٹر، کار اور ضروریات زندگی کی دیگر چیزیں بھی ہوں"۔

وہ غائب ہو گیا۔

ہم دونوں رات گئے تک انتظار کرتے رہے کہ ہمارے گھر کی قسمت کب پلٹتی ہے آخر میں تھک ہار کر سو گئے۔ سو کر اٹھے تو ایسا معلوم ہوا جیسے بکنگھم پیلس میں لیٹے ہوئے ہوں۔ پہلے تو ہم دونوں کبھی کسی چیز میں محو ہو جاتے۔

ہمارے ایک دوست ہیں تاج محمد آنسو، وہ ہم سے محض اس لئے جلتے ہیں کہ اگر ہم ان سے عمر میں دس سال سے زیادہ بڑے ہیں پھر بھی ہمارے سارے دانت جوں کے توں موجود ہیں جبکہ ان کی پوری بتیسی جھڑ چکی ہے اور اب وہ نقلی دانت لگائے گھومتے ہیں۔ ہم نے ایک دو بار ان سے مصالحت کی بھی کوشش کی۔ یہ کہا کہ بھائی یہ قدرت کے کارخانے کا نظام ہے جس میں ہمارا عمل دخل نہیں۔ اب اگر ہمارے دانت موجود ہیں اور تمہارے دانت ٹوٹ چکے ہیں تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ نہ ہم نے تمہارے دانت اپنے منہ میں لگائے اور نہ ان کے ٹوٹنے پھوٹنے کی ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے۔ مگر انہوں نے ہم سے جلنا نہیں چھوڑا۔ ایک بار تو ہمارے خلاف یہاں تک شکایت کر دی کہ ہم موجودہ حکومت کے خلاف بغاوت کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ وہ تو اللہ بھلا کرے انکوائری کرنے والوں کا، جنہوں نے ہمارا چہرہ مہرہ دیکھ کر ہی یہ کہہ دیا کہ ان کی سات پشتوں تک کوئی شخص بغاوت کے متعلق نہیں سوچ سکتا۔ اگر ان میں کچھ دم خم ہوتا تو پہلے اپنی بیگم کے خلاف بغاوت کرتے جس نے اپنے پاؤں کی جوتی بنا کر رکھا ہے۔ دوسری مرتبہ ان ہی حضرت نے سی آئی ڈی والوں کو یہ خط بھیج دیا کہ ہم بھارت کے لئے جاسوسی کرتے ہیں لیکن یہ الزام بھی غلط ثابت ہوا۔ البتہ ہمارے پورے گھر کی تلاشی ضرور لی گئی اور کئی مہینے تک ہماری حرکات وسکنات کو نظروں میں رکھا گیا۔

دانتوں کی وجہ سے وہ ہم پر خار تو پہلے ہی کھائے بیٹھے تھے لیکن اب جو وہ ہماری طرف سے گزرے اور انہوں نے ہمارا تین منزلہ محل دیکھا اور محل میں پوری آواز سے بجتا ہوا ریڈیو سنا اور محل کے گیراج میں ایک لمبی سی شاہانہ کار کھڑی پائی تو ان کی مصنوعی بتیسی فوراً باہر نکل پڑی۔ جیسے تیسے وہ اپنی بتیسی درست کرتے ہوئے بھاگے مختلف دفاتر کی جانب۔

ہم مرنجاں مرنج قسم کے آدمی ہیں۔ تاج محمد آنسو کو چھوڑ کر ہم میاں بیوی نے اپنی اپنی آنکھیں خود ملیں پھر بیگم نے ہماری اور ہم نے بیگم کی آنکھیں ملیں کہ خواب ہو تو ٹوٹ جائے مگر محل جوں کا توں باقی رہا۔

باہر نکل کر دیکھا تو ہم اپنے ہی محلّہ میں تھے۔ ہمارا

محل بھی اسی جگہ تھا جہاں کبھی ہمارا غریب خانہ ہوا کرتا تھا۔ جب اس بات کا اچھی طرح یقین ہو گیا تو ہم دونوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں رہا۔ بچوں کی طرح اپنے تین منزلہ مکان میں اچھلتے پھرے کبھی کوئی چیز دیکھتے اور جگہ اور ہر محکمہ میں ہماری یاد اللہ ہے۔ عموماً ہم نے لوگوں کو اپنی تعریف کرتے ہی پایا ہے۔ چنانچہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد ہمیں کئی ٹیلی فون موصول ہوئے۔

کے ڈی اے سے شیخ مولا بخش نے کہا۔ ''یار! سنا ہے تم نے ناجائز تعمیر کی ہے۔ بڑے صاحب ٹریکٹر سمیت پانچ بجے شام کو تمہارے مکان کا معائنہ کرنے کے لئے تشریف لا رہے ہیں''۔

پولیس سٹیشن سے ہیڈ کانسٹیبل نے کہا۔ ''رات ہی رات میں تمہارے پاس کار کہاں سے آ گئی۔ اچھا بچہ گھبراؤ نہیں اے ایس آئی صاحب اغوا کی تفتیش سے واپس آ جائیں تو ہم لوگ تمہارے ہاں دھاوا بول رہے ہیں۔ ہماری آمد سے قبل ذرا عمدہ قسم کے ناشتے کا انتظام کر لینا اور کار کی رسید اور لائسنس وغیرہ تیار رکھنا۔

سی آئی ڈی کے محکمے سے عبدالستار چاچڑ نے کہا۔ ''بیٹا! بہت کہتے تھے کہ تم جاسوس نہیں ہو۔ آج تمہیں پتہ چلے گا جب ہم تمہارے ہاں سے وائرلیس اور روس اور بھارت کا اسلحہ برآمد کریں گے''۔

ایک فون بیگم کے پاس بھی آیا۔ کسی نے صرف دو ٹوک بات کی تھی۔ ''ایک ہفتے کے اندر تم دونوں میاں بیوی کو فوجی حکام کے آرڈر پر گولی سے اڑا دیا جائے گا''۔

بیگم کا ایک ہی فون میں پیٹ خراب ہو گیا۔ ایسے خطرناک وقت میں ہم نے اوسان بحال رکھے اور بیگم کو منع کیا کہ وہ چراغ کو سل پر توڑنے سے باز آ جائیں۔ اگر اس کے باعث یہ مصائب آئے ہیں تو ان کا تریاق بھی چراغ ہی کے پاس ملے گا۔

اب آپ کو کیا بتائیں کہ کیا ہوا؟ مختصراً اتنا سمجھ لیجئے کہ ایک گھنٹے کے اندر اندر ہم دونوں دوبارہ اپنے غریب خانے میں موجود تھے۔ گھر کے عقبی حصہ میں چٹان جوں کی توں موجود تھی اور بیگم نے دس روپے کی منگائی ہوئی ہلدی تک واپس کر دی تھی کہ کیا پتہ، بھارتی یا روسی ہلدی نہ ہو اور جیٹھے بٹھائے لینے کے دینے پڑ جائیں۔ چولہے پر رکھی ہوئی ہانڈی جل رہی تھی اور سامنے وہی چراغ والا آدمی ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ ''کچھ اور حکم دیجئے آقا!''

ہم نے کہا۔ ''تم فوراً یہاں سے دفع ہو جاؤ''۔

بیگم ہونٹ سکوڑ کر بولیں۔ ''کالا منہ نیلے ہاتھ پاؤں''۔

اور تب وہ لمبا تڑنگا شخص جو دیکھنے میں ہر قسم کے احساس سے عاری معلوم ہوتا تھا، ہمارا حکم ماننے کے بجائے موٹے موٹے آنسو بہانے لگا۔

پوچھا۔ ''روتے کیوں ہو؟''

کہنے لگا۔ ''افسوس، آج کوئی ہمارا روادار نہیں۔ جہاں بھی جاتے ہیں دو دن کے اندر ہی لوگ ہم سے اکتا جاتے ہیں۔ ہمارے دیئے ہوئے سارے عطیات واپس کر کے ہمیں فوراً رخصت کر دیتے ہیں۔ آہ ہماری قدر کرنے والے لوگ ختم ہو گئے۔ حق مغفرت کرے، عجب آزاد لوگ تھے۔ کاش! ہم چراغ کے جن نہ ہوتے دنیا کی سب سے عجیب مخلوق مثلاً انسان ہی ہوتے''۔

بیگم نے اچھل کر کہا۔ ''تم جن ہو؟''

اس نے آہستہ سے اپنا سر ہلایا۔ ''ہاں حضور!''

بیگم تو فوراً ہی بے ہوش ہو گئیں۔ ہم انہیں ہوش میں لانے کے لئے پڑوسیوں سے نلخہ مانگ کر لائے تو وہ شخص جا چکا تھا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ چراغ بھی غائب تھا۔

■

بھارتی حکومت کی پاکستان دشمن پالیسی

بھارت نے پاکستان کی طرف آنے والے دریاؤں کا پانی روکنے کے منصوبے ہی نہیں بنائے بلکہ دریاؤں کا رُخ موڑا جارہا ہے۔

گلزار اختر کاشمیری .... 0345-8599944, 0301-3005908 ....

بھارتی وزیراعظم نریندر مودی کی وجہ شہرت ان کا انتہا پسندانہ رویہ اور خاص طور پر مسلم دشمنی ہے۔

ان کے ایوان اقتدار تک پہنچنے سے پہلے ہی یہ خدشات ظاہر کئے جارہے تھے کہ ان کا دور بھارت میں مسلمانوں سمیت جملہ اقلیتوں کے ساتھ مقبوضہ کشمیر کے مسلمانوں کے لئے بھی پُرامن جدوجہد شروع کئے ہوئے ہیں۔ بھارت میں عام انتخابات کے دوران نریندر مودی یہ عندیہ دے رہے تھے کہ وہ بھارت میں فرقہ واریت اور تعصب پر مبنی سیاست نہیں کریں گے بلکہ وہ اقتصادی اصلاحات اور ملکی معیشت کو بہتر بنانے کے اقدامات کریں گے۔ وہ یہ تاثر بھی دے رہے تھے کہ وہ اپنے گرد جمع ہوئے انتہا پسند لوگوں کے دام میں نہیں آئیں گے اور سنجیدہ سیاست دان کی حیثیت سے امن کے استحکام اقتصادی ترقی اور عوام کی خوش حالی کے لئے کسی تعصب اور امتیاز سے بالا ہو کر اپنا کردار ادا کریں گے لیکن اپنے عہدے کا حلف اٹھانے کے فوراً بعد نریندر مودی نے ایسے فیصلے اور اقدامات کئے جن سے موصوف کے وہ عزائم بے نقاب ہوگئے۔ وہ پاکستان دشمنی اور مسلمانوں کے خلاف نفرت دیرینہ طور پر رکھتے ہیں۔

نریندر مودی نے 26 مئی 2014ء کو اپنے عہدے کا حلف اٹھایا اور وزیراعظم بنے تین ماہ ہوگئے ہیں۔ عام تاثر یہ تھا کہ 64 سالہ نریندر مودی سیاسی تدبر اور دوراندیشی کا ثبوت دیں گے لیکن موصوف کی اب تک کی کارکردگی اس سے برعکس ہے۔ وہ خود کو سیکولر لیڈر کے طور پر پیش کرتے ہیں جبکہ وہ بھارت میں آباد اقلیتوں اور خاص کر مسلمانوں کے خلاف انتقامی کارروائیوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اس کی دو تین مثالیں درج ذیل ہیں:

1۔ بھارتی پارلیمنٹ کی کینٹین میں ایک مسلمان روزہ دار کو رمضان میں بی جے پی کے کارکنوں نے زبردستی روزہ تڑوایا اور زدوکوب کیا کہ روزہ کیوں رکھا ہے اور اس کو جان سے مارنے کی دھمکیاں دیں کہ اس کا کسی کے سامنے اظہار نہیں کرنا۔ دہلی کے اکثر اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی ہے۔

2۔ بارڈر لائن پر فائرنگ شروع کروادی۔ بھارت کی طرف سے پاکستان سرحد پر عسکری دباؤ بڑھایا جارہا

ہے۔ جس کا اندازہ یوں کیا جاسکتا ہے کہ گزشتہ دو ماہ کے دوران 25 مرتبہ بھارت کی طرف سے پاکستان کے علاقے پر بلا اشتعال فائرنگ کی۔ اس فائرنگ کے نتیجے میں متعدد افراد ہلاک ہوئے۔ عمارتوں کو نقصان پہنچا علاقے کے لوگ نقل مکانی پر مجبور ہوئے۔

3۔ 25 اگست 2014ء کو پاک بھارت خارجہ سیکرٹریوں کی سطح پر مذاکرات طے تھے۔ 18 اگست کو یہ دورہ منسوخ کر دیا۔ عذر یہ پیش کیا کہ پاکستان ہائی کمشنر عبدالباسط نے جموں و کشمیر فریڈم پارٹی کے سربراہ شبیر شاہ سے ملاقات کی جو بھارت کے اندرونی معاملات میں مداخلت ہے۔

بھارتی وزیراعظم نے تین ماہ میں تین مرتبہ مقبوضہ وادی کا دورہ کیا۔ انہوں نے وہاں ہندو بستیاں آباد کرنے کا اعلان کیا۔ ان کے مطابق جو ہندو 1947ء، 1965ء، 1971ء اور 1990ء میں مقبوضہ کشمیر سے اپنی جائیدادیں بیچ کر ہندوستان چلے گئے تھے ان کو آسان شرائط پر قرضہ بھی ملے گا اور خالصہ سرکار اور جنگل سے ان کو زمینیں بھی الاٹ کی جائیں گی اور دیگر مراعات بھی دی جائیں گی۔ یہ مقبوضہ وادی میں مسلم اکثریت کو اقلیت میں بدلنے کی سازش ہے۔ جس طرح اسرائیل نے پوری دنیا سے یہودیوں کو اسرائیل میں جمع کر کے یہودی بستیاں بسائی تھیں ان ہی خطوط پر مودی حکومت کام کر رہی ہے۔ اس طرح لاکھوں ہندوؤں کو کشمیر میں بسانے کی سازش کی جا رہی ہے۔ کشمیری پنڈتوں کے تمام بینکوں کے قرضے معاف کر دیئے گئے ہیں اور وادی کے تین اضلاع میں اراضی حاصل کرنے کے لئے کٹھ پتلی حکومت کو دہلی کی حکومت کے احکامات جاری کر دیے ہیں۔

ممتاز کشمیری بزرگ سیاست دان سید علی گیلانی نے ان احوال کے تناظر میں حال ہی میں انکشاف کیا ہے کہ ہندو بستیاں کشمیر کے تین حصوں میں یعنی شمال میں جنوب میں مرکز میں بستیاں بسائی جا رہی ہیں۔ ہر شہر میں ایک لاکھ افراد کو بسایا جائے گا۔ ان بستیوں کے بسانے کے لئے پانچ ہزار چھ سو کنال رقبہ پہلے مرحلے میں حاصل کیا جائے گا۔ ان میں ایک ایک میڈیکل کالج، دو انجینئرنگ کالج، چار پولیس سٹیشن، 12 کالج اور 32 سکول قائم کیے جائیں گے۔ جب یہ نئے آباد کار اپنا اثر و رسوخ بڑھائیں گے تو اس سے فرقہ واریت کی فضا پیدا ہوگی۔

اس سارے منصوبے کا مقصد مسلمان آبادی کی اکثریت کو کم کر کے ہندو آبادی میں اضافہ کرنا ہے تاکہ اگر کبھی ریفرنڈم کرانا پڑ جائے تو بھارت کے حق میں رائے دینے والے لوگوں کی اکثریت موجود ہو۔ یہ نئی آبادیاں آئندہ انتخابات پر بھی اثر انداز ہوں گی اور ہندو غلبہ حاصل کر سکیں گے۔ یہ مودی حکومت کی نئی پالیسی اور حکمت عملی بن گئی ہے۔ بھارتی وزیراعظم نے 12 اگست 2014ء کو تیسرا دورہ کشمیر کیا جس میں انہوں نے پاکستان کے خلاف سخت زبان استعمال کی اور کہا کہ پاکستان اب روایتی جنگ لڑنے کے قابل نہیں ہے۔ موصوف کی اس تقریر کو سفارتی حلقوں میں تشویش کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

درپردہ جنگ میں پاکستان ملوث ہے؟

بھارتی وزیراعظم نریندر مودی نے پاکستان پر مقبوضہ کشمیر میں درپردہ جنگ کا الزام لگایا۔ انہوں نے ایک پرانا جملہ دہرایا کہ پاکستان کشمیر کے مقامی باشندوں کی مدد کر رہا ہے۔ مودی نے اس موقع پر نامعقول دلیل دیتے ہوئے یہ انکشاف کیا کہ پاکستان دراصل بھارت کے ساتھ روایتی جنگ کی سکت نہیں رکھتا۔

میں سمجھتا ہوں کہ بھارتی وزیراعظم کے الزامات سفید جھوٹ کے علاوہ کچھ نہیں۔ وہ جب سے وزیراعظم بنے ہیں اس طرح کے سطحی بیانات دے کر وہ اپنے آپ

کو پست ذہنیت کا سیاستدان ثابت کر رہے ہیں۔ مودی کے الزامات سے لگتا ہے کہ اس کا حافظہ کمزور ہے۔ 1947ء میں آزاد کشمیر کے نہتے لوگ ڈوگرہ حکومت کے خلاف اٹھے اور سری نگر کے قریب پہنچ گئے تھے۔ اس وقت کے وزیراعظم پنڈت جواہر لعل نہرو نے جب یہ اندازہ کیا کہ ہو سکتا ہے کشمیری مجاہدین پورے کشمیر پر قابض نہ ہو جائیں اس نے قبائلی پٹھانوں کی دہائی دے کر اقوام متحدہ کے ذریعے سیز فائر کرایا تھا۔ حالانکہ غیر منظم قسم کے قبائلی پٹھانوں کی تعداد سینکڑوں میں تھی۔ آزاد کشمیر کے ان نہتے لوگوں نے مظفر آباد، ضلع باغ، حویلی، پونچھ کا بڑا حصہ، کوٹلی، بھمبر اور میر پور کے علاقے کو آزاد کرایا جہاں آج ریاست کشمیر کی آزاد حکومت قائم ہے۔

نریندر مودی بھول گئے کہ 1965ء میں حملہ کرنے والی بھارتی فوج کو ناکوں چنے چبوائے گئے۔ بھارت کو پھر اقوام متحدہ سے جنگ بندی کی اپیل کرنا پڑی۔ بھارت نے جب یہ اندازہ کیا کہ وہ روایتی جنگ نہیں جیت سکتا تو 1971ء میں در پردہ سازشوں کے ذریعے مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں اپنا منافقانہ کردار ادا کیا۔ اسے یقین تھا کہ وہ پاکستان سے روایتی جنگ کبھی نہیں جیت سکتا لہٰذا در پردہ جنگ کی ابتدا بھی بھارت نے کی۔ آج بھی افغانستان میں بھارتی خفیہ ایجنسی را دہشت گردوں کو ٹریننگ دے کر پاکستان بھیج رہی ہے۔ یہ در پردہ جنگ نہیں تو اور کیا ہے۔ بلوچستان میں بھارتی مداخلت کے شواہد سابق وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے بھارتی وزیراعظم کو فراہم کیے تھے۔ در پردہ جنگ تو بھارت لڑ رہا ہے۔ ہم دفتر خارجہ سے التماس کرتے ہیں کہ وہ اس پر ردعمل ظاہر کرے۔

پاکستانی افواج دنیا کی بہترین افواج میں شمار ہوتی ہے۔ اس کی قابلیت اور اہلیت کو بیرونی دنیا بھی تسلیم کرتی ہے۔ بھارتی وزیراعظم کی یہ خوش فہمی دور ہو جانی چاہئے۔

مقبوضہ کشمیر میں یوم پاکستان

پاکستان کے لوگ زیادہ بہتر جانتے ہیں کہ یہاں 14 اگست کا دن کیسے منایا گیا۔ میں مقبوضہ وادی کے بارے میں ذکر کروں گا کہ وہاں یوم پاکستان کیسے منایا گیا۔ کشمیریوں پر اس ماہ بھارتی فورسز کے مظالم کے پہاڑ توڑ دیئے گئے۔ بھارتی فوج نے جھنڈے اور جھنڈیاں تقسیم کیں۔ گھروں، دکانوں اور بازاروں میں لگانے کے احکامات جاری ہوئے۔ اگست کی آمد پر پورے مقبوضہ کشمیر میں غیر اعلانیہ کرفیو نافذ کیا گیا۔ 15 اگست کو بخشی سٹیڈیم سری نگر میں بڑی تقریب رکھی گئی تھی۔ اس سٹیڈیم کے گرد و نواح میں مہاراج گنج ستھرا شاہی، بٹ مالو، رام باغ، لال منڈی، جواہر نگر، راج باغ اور دیگر بستیوں میں مسلمان بھارتی فورسز کے تشدد کی وجہ سے گھر بند کر کے دوسرے رشتہ داروں کے ہاں چلے گئے۔ رہائشی گھروں پر چوکیاں قائم کی گئیں یہاں تک کہ اقبال پارک اور بچوں کے ہسپتال کا بھی محاصرہ کیا گیا۔ بچوں کے ہسپتال میں بھی فوجیوں نے بنکر بنا رکھے تھے اور لوگوں کو ہراساں کرتے رہے۔ پوری وادی کی سڑکوں پر جگہ جگہ کریک ڈاؤن ہوتے رہے۔ لوگوں کی تلاشیاں کی گئیں، چھاپے مارے گئے، ہزاروں کی تعداد میں نوجوانوں کو گرفتار کیا گیا۔ جیلوں سے رہا ہونے والے لوگوں کو تھانے میں بند کیا گیا۔ بھارت 15 اگست کو اپنا یوم آزادی کشمیریوں کو گھروں میں بند کر کے مناتا ہے۔ یوم آزادی منانے کے لئے ہزاروں کشمیریوں کو کیمپوں میں اور تھانے میں بند کیا گیا۔

اس طرح انہیں غلامی کا تصور دیا گیا کہ تم کوئی آزاد لوگ نہیں ہو۔ کشمیری مسلمانوں نے چودہ اگست کو اچانک صبح صبح پاکستان کے پرچم لہرا دیئے۔ پاکستانی پرچم

کو جگہ جگہ سلامی دی گئی۔ رات کو بھارتی فورسز کی موجودگی میں چراغاں کیا گیا اور پاکستان کی استقامت اور پاکستان کے ساتھ الحاق کے لئے دعائیں مانگی گئیں اور یہ کہ اللہ پاکستان کی طرح کشمیر کے لوگوں کو بھی آزادی کی نعمت دے۔ 15 اگست کو بھارت کی آزادی پر صبح ہی صبح کالے جھنڈے لہرا کر یوم سیاہ منایا گیا۔ کشمیر میں یوم سیاہ کے موقع پر مکمل ہڑتال رہی۔ ٹرانسپورٹ بالکل بند تھی، بازار اور کاروباری ادارے بند رہے البتہ جموں میں ہندوؤں نے دکانیں کھولیں، عملی طور پر سول کرفیو رہا۔

بھارت کی جنگی تیاریاں

نریندر مودی کی آمد کے بعد آج ایک بار پھر بھارتی فوج جنگ کی دھمکیاں دے رہی ہے۔ آزاد کشمیر پر یلغار کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔ بھارت نے آزاد کشمیر پر ہی نہیں بلکہ ورکنگ باؤنڈری کے ساتھ ساتھ سیالکوٹ میں انٹرنیشنل سرحد پر بھی شہری علاقوں کو نشانہ بنایا ہے۔ بھارتی گولہ باری سے کئی معصوم لوگ شہید ہو چکے ہیں۔ پاکستان نے اعتماد سازی کے لئے ایک بھارتی فوجی کو جو پکڑا تھا۔ باعزت واپس کر دیا لیکن بھارت نے اس کے جواب میں ایک کشمیری جو اپنی زمین سے گھاس کاٹ رہا تھا۔ اسے اغوا کیا اور گولیاں مار کر اس کی لاش واپس کی۔ پاکستان کی حکومت اپنے داخلی مسائل میں الجھی ہوئی ہے۔ ایسے وقت میں 12 اگست کو بھارتی وزیراعظم نے کشمیر کا دورہ کیا تو کشمیری بزرگ رہنما جناب سید علی گیلانی اور میر واعظ عمر فاروق نے ہڑتال کی کال دی۔ پوری وادی میں بہت ہی موثر ہڑتال ہوئی اور جگہ جگہ پُرامن مظاہرے بھی ہوئے۔

جب نریندر مودی کشمیر کا دورہ کر رہے تھے۔ اسی دوران برطانوی پارلیمنٹ کے 40 ارکان نے اپنے دستخطوں سے ایک قرارداد اسمبلی میں جمع کروائی جس میں جموں و کشمیر کے عوام کو اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق حق خودارادیت دینے کا مطالبہ کیا گیا۔ ایوان کی بزنس کمیٹی میں قرارداد پیش کرنے والے رکن پارلیمنٹ ڈیوڈ وارڈ کا کہنا تھا۔ "مسئلہ کشمیر دراصل دو ایٹمی ممالک کے درمیان ایسا مسئلہ ہے جسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے علاقائی اور عالمی امن خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ کشمیری عوام کی حق خودارادیت کا مسئلہ گزشتہ چھ عشروں سے اقوام متحدہ کے ایجنڈے میں ہے۔ عالمی برادری اور انسانی حقوق کے ادارے کشمیر پر بھارتی غاصبانہ قبضے کی تنقید کا نشانہ بناتے رہتے ہیں۔

فلپائن میں قائم ایک ادارے اے ایف اے ڈی نے انکشاف کیا ہے بھارتی فوج نے 1988 سے آج تک 94025 افراد کو قتل کیا۔ ان میں سے 7022 افراد حراست کے دوران قتل ہوئے۔ اس وقت بھی 1,25,554 کشمیری بھارتی جیلوں میں قید ہیں۔ 106003 بھارتی فوج نے تباہ کئے۔ 22778 کشمیر خواتین بیوہ ہوئیں۔ 207409 بچے یتیم ہوئے۔ مقبوضہ کشمیر میں 10115 مسلمان بچیوں کی بے حرمتی کی گئی اور ایک لاکھ سے زائد لوگ آزاد کشمیر کی طرف ہجرت کر گئے۔ مقبوضہ کشمیر میں فوج کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے اور اسے کسی بھی کارروائی پر جوابدہی سے استثنیٰ حاصل ہے۔ نریندر مودی نے نئی دہلی میں اقوام متحدہ کے ملٹری گروپ کو اپنا دفتر بند کرنے کے لئے کہا اور اگست میں وہ دفتر بند کر دیا گیا۔ یہ گروپ جس کا کام پاکستان اور بھارت کے درمیان سرحدی خلاف ورزیوں پر نگاہ رکھنا اور فائر بندی کے حوالے سے نگرانی کرنا تھا۔ یہ ادارہ UNMOGIP کے نام سے دنیا بھر کے سفارتی حلقوں میں اپنی شناخت رکھتا ہے مگر مودی حکومت کا یہ اقدام نہ صرف اقوام متحدہ کے ادارے کی توہین ہے بلکہ اس عالمی ادارے کا مذاق اڑایا گیا تاکہ یہ ادارہ بھارت کی سرحدی

خلاف ورزیوں کی اقوام متحدہ کو رپورٹ نہ کر سکے۔ نریندر مودی کے یہ پُراسرار اقدامات تیزی کے ساتھ بے نقاب ہو رہے ہیں۔ افسوس کہ ہماری قومی قیادت آپس میں دست وگریباں ہے اوران تلخ حقائق کا ہنوز ادراک نہیں کر رہی ہے۔ میں حکومت پاکستان کی توجہ اس طرف مبذول کراتے ہوئے کہوں گا کہ اس مسئلہ کی طرف خصوصی توجہ دی جائے۔ ایسی پالیسی اختیار کی جائے جو رائے عامہ کے جذبات اور احساسات کی حقیقی معنوں میں ترجمان ہو۔ مورخہ 29 اگست 2014ء کو بھارتی وزیر داخلہ راج ناتھ سنگھ نے لکھنؤ میں پریس کانفرنس کرتے ہوئے کہا کہ ''پاکستان بھارت کے صبر کا امتحان لے رہا ہے۔ ہم نے سرحدوں پر تعینات فورسز کو احکامات جاری کر دیئے ہیں کہ پاکستان کی طرف سے گولہ باری کے دوران کسی بھی صورت میں سفید جھنڈا نہ لہرایا جائے بلکہ گولی کا جواب گولی سے دیا جائے۔ سرحدوں پر تعینات بی ایس ایف کے اہلکاروں کو ہم نے احکامات جاری کر دیئے ہیں کہ پاکستان رینجرز کی طرف سے گولہ باری کے دوران کوئی سفید جھنڈا لہرا کر مذاکرات کرنے کی کوشش نہ کرے۔ اب گولی کا جواب گولی سے دینے کا وقت آ گیا ہے۔ بھارتی وزیر داخلہ نے کہا کہ پاکستان کی طرف سے گولہ باری کے دوران پاکستانی فوج مجاہدین کشمیر کو اندر دھکیل رہی ہوتی ہے۔ گزشتہ دو ہفتے کے دوران 16 مرتبہ سفید جھنڈا لہرا کر پاکستانی حکام سے بات چیت کی۔ تاہم پاکستان بھارت کے صبر کا امتحان لے رہا ہے۔ اس نے کہا کہ مرکزی حکومت کی طرف سے کشمیری پنڈتوں کی آبادکاری کو جو منصوبہ دیا گیا ہے۔ مورخہ 5 ستمبر کو کشمیر کے دورے کے موقع پر کشمیری پنڈتوں کو خوشخبری دی جائے گی۔ وزیر داخلہ نے کہا کہ دراصل پاکستان نے در پردہ کشمیر میں جنگ شروع کی ہوئی ہے اس کا جواب دینا انتہائی ضروری ہے اور پاکستان کو پیچھے ہٹنے کا موقع بھی نہیں دیا جائے گا۔

سیکرٹری خارجہ کے درمیان ملاقات منسوخ

پاکستان اور بھارت کے سیکرٹری خارجہ کے درمیان ملاقات منسوخ۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان تعلقات کو پُرامن اور دوستانہ سطح پر استوار کرنے کی کوششوں کو اس وقت شدید دھچکا لگا جب بھارتی حکومت نے 18 اگست کو اپنی خارجہ سیکرٹری سجاتا سنگھ کا طے شدہ دورہ اسلام آباد منسوخ کر دیا۔ موصوفہ نے پاکستانی ہم منصب کے ساتھ ملاقات کے لئے 25 اگست کو پاکستان آنا تھا۔ نئی دہلی نے اس کا یہ عذر تراشا کہ 18 اگست کو بھارت میں تعینات پاکستانی ہائی کمشنر عبدالباسط نے جموں و کشمیر فریڈم پارٹی کے سربراہ شبیر احمد شاہ سے ملاقات کی جو بھارت کے اندرونی معاملات میں مداخلت کے مترادف ہے۔ لہٰذا بھارت نے اظہار ناراضگی کے طور پر اپنی سیکرٹری خارجہ کا دورہ پاکستان منسوخ کر دیا۔ اس پر پاکستانی ہائی کمشنر جن کا تعلق آزاد کشمیر کے ضلع پونچھ سے ہے۔ جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مورخہ 20 اگست کو کشمیری قائد سید علی گیلانی، میر واعظ عمر فاروق، یاسین ملک کو پاکستان ہائی کمشنر میں مدعو کر کے ان سے تفصیلی ملاقات کی۔ کون نہیں جانتا کہ ان کشمیری قائدین سے ملاقات کوئی انہونی نہیں ہے۔ بلکہ یہ معمول کا حصہ ہے۔ پاکستانی وفود بھارت جاتے ہیں تو کشمیری قیادت ان سے ملاقات کے لئے آتی ہے۔ بعد میں کشمیری قائدین نے میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ تنازعہ کشمیر کے تین فریق ہیں۔ پاکستان ہندوستان اور کشمیری۔ لہٰذا پاکستانی قیادت کے ساتھ کشمیریوں کو ملاقات کرنے کا حق ہی نہیں بلکہ ان کی ذمہ داری بھی ہے۔

22 اگست کو دہلی سے واپس آنے پر سید علی گیلانی کو سری نگر ائرپورٹ پر گرفتار کر کے ان کے گھر میں نظر بند

کر دیا گیا۔ ایک بھارتی وکیل سشیل کمار نے جوڈیشل مجسٹریٹ الہ آباد میں پاکستانی ہائی کمشنر عبدالباسط کے خلاف درخواست دائر کی جس میں کہا گیا کہ بھارتی حکومت کے منع کیے جانے کے باوجود پاکستانی ہائی کمشنر نے کشمیری لیڈروں سے ملاقات کی اور یہ بغاوت کے زمرے میں آتا ہے اور یہ ہمارے خلاف سازش ہے۔
جنوبی ایشیا کے ماہرین کا خیال ہے کہ بھارت نے سیکرٹری خارجہ کے مذاکرات منسوخ کر کے دراصل اگلے ماہ نیوی یارک میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں نواز شریف اور مودی کی ملاقات کے امکان کو تقریباً ختم کر دیا ہے۔ اس حوالے سے بی بی سی نے خارجہ سیکرٹریوں کی ملاقات کو منسوخ کرنا کشمیر کے بارے میں مودی حکومت کا پہلا اشارہ ہے۔ اس کا واضح مقصد پاکستان کو یہ بتانا ہے کہ کشمیر کے بارے میں بھارت اپنی شرائط پر ہی بات کرے گا۔

آئندہ چند مہینوں میں مقبوضہ کشمیر میں ریاستی اسمبلی کے انتخابات ہونے والے ہیں۔ نریندر مودی نے پاکستان سے بات چیت کر کے کشمیر سے متعلق اپنی پالیسی کو محدود کر لیا ہے۔ یاد رہے کہ وزیراعظم پاکستان میاں محمد نواز شریف جب مودی کی دعوت پر حلف برداری کی تقریب میں شرکت کے لئے دہلی گئے تھے تو وزیراعظم نواز شریف کے جذبہ خیر سگالی کا جواب نریندر مودی نے بڑی رعونت سے دیا تھا۔ اس کے باوجود پاکستان نے تحمل کا مظاہرہ کیا۔ دوسری جانب کشمیر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کا سلسلہ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔
سید علی گیلانی نے بجا فرمایا کہ اگر دہلی سرکار کو انسانیت کے دائرے کا ذرا بھی لحاظ ہے تو کشمیریوں کی خواہشات کے مطابق انہیں اپنے مستقبل کے فیصلے کرنے کا حق دیا جائے۔ 12 اگست کو مودی نے لداخ میں پاکستان پر پراکسی وار کے الزامات لگائے اس سے ماحول

خاصا مکدر ہوا ہے۔ 31 جولائی 2014ء کو بھارتی آرمی چیف جنرل دل بیر سنگھ سوہاگ نے اپنی پہلی تقریر میں پاکستان کے بارے میں انتہائی توہین آمیز باتیں کیں۔ 16 اگست کو بھارتی بحریہ کے بیڑے میں نئے تباہ کن جہاز آئی این ایس کولکتہ کی شمولیت کے موقع پر بھی وزیراعظم مودی نے ہمسایہ ممالک کے خلاف سخت زبان استعمال کی اور اسلحہ جمع کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ یہ تمام حالات اور واقعات بھارتی قیادت کے بدلتے ہوئے تیور کی گواہی دے رہے ہیں۔
پاک بھارت سیکرٹریوں کی ملاقات منسوخ کرنا غیر معمولی بات ہے۔ بھارت کا بات چیت کو ترک کرنا ایک پیغام ہے۔ جو ریاست کے مخالفین کے لئے بھی معاونت کی ایک صورت ہے۔ بھارت نے پاکستان کی طرف آنے والے دریاؤں کا پانی روکنے کے منصوبے ہی نہیں بنائے بلکہ دریاؤں کا رُخ موڑا جا رہا ہے۔
ان منصوبوں پر کام تیزی سے جاری ہے۔ کشن گنگا کا ڈیزائن سندھ طاس معاہدے کے تحت بھارت نے انکار اسی وجہ سے کیا کہ ڈیڈ لاک پیدا ہو۔ بھارت تمام محاذوں پر پاکستان کے خلاف اور اس کے مفاد کو نقصان پہنچانے کے لئے جنگی بنیادوں پر کام کر رہا ہے۔ بی جے پی کی سیاست کا سرچشمہ شیوسینا ہے اور شیوسینا کے سربراہ کی طرف سے آزاد کشمیر میں فوجیں داخل کرنے کی باتیں نظر انداز نہیں کرنی چاہئیں۔ ہندو انتہا پسند پاکستان پر حملہ کرنے کے لئے مودی کو تیار کر رہا ہے تاکہ مودی دنیا کو بتا سکیں کہ عوام کے دباؤ پر اس نے اپنی فوجیں آزاد کشمیر میں داخل کیں۔ آزاد کشمیر اور سیالکوٹ سے اس پار جموں، ادھم پور، اکھنور، آر ایس پورہ جیسے ہندو اکثریتی علاقے سے بھارتی فوج نے آبادی کا انخلاء شروع کر دیا ہے۔ بہانہ پاکستانی گولہ باری ہے۔ اس لئے پاکستان کو اقوام متحدہ کے مبصرین اور اسلام آباد میں دنیا کے

سفارت کاروں کو جنگ بندی لائن کا دورہ کرنا چاہئے اور دنیا کو پیشگی طور پر بھارت کی جارحیت کے منصوبوں سے آگاہ کرنا چاہئے۔

مودی حکومت کے عزائم

مودی حکومت کا پہلا دفاعی بجٹ بھی اس کے عزائم کو ظاہر کرتا ہے۔ اس میں پانچ ہزار کروڑ روپے کا اضافہ کیا گیا۔ 2.29 کھرب روپے کے کل بجٹ میں سب سے زیادہ آرمی کو پھر ائرفورس کو اور پھر بحریہ کو حصہ دیا گیا۔ ریسرچ اینڈ ڈویلپمنٹ اسلحہ فیکٹریوں کو بھی اربوں روپے ملے ہیں۔ سرحدی علاقوں میں ریلوے سسٹم ون رینک ون پنشن سکیم پالیسی کے لئے اربوں روپے مختص کئے ہیں۔ چین کا بجٹ 132 ارب ڈالر اور پاکستان کا بجٹ 700 ارب روپے ہے۔ بھارتی دفاعی بجٹ میں غیر معمولی اضافہ سے مودی حکومت کے جارحانہ اقدامات کا پتہ چلتا ہے۔ بھارتی وزیراعظم کے پہلے غیر ملکی دورے کے احوال سے بھی پتہ چلتا ہے کہ بھارت کے عزائم ٹھیک نہیں ہیں۔ یہ دورہ چین، روس، جنوبی افریقہ اور برازیل کا تھا۔ برازیل میں سربراہ سمٹ کے سلسلہ میں تھا۔ اس اجلاس میں دہشت گردی کا موضوع چھپایا رہا۔ بھارت نے پاکستان کے خلاف کھل کر ان ممالک کو مشتعل کیا۔ جنوبی افریقہ اور برازیل کو پاکستان کے ساتھ بظاہر کوئی کشیدگی یا تحفظات نہیں ہیں۔ چین دوست ملک ہے، روس قریب آ رہا ہے، انہیں دنیا میں برپا اسلامی تحریکوں سے خوفزدہ کیا جا رہا ہے۔

بھارتی صحافی ڈاکٹر وید پرتاب ویدک کی لاہور میں جماعت الدعوۃ کے سربراہ حافظ سعید کے ساتھ ملاقات پر بھارتی پارلیمنٹ میں جو ہنگامہ آرائی ہوئی وہ بھی مودی حکومت کی پاکستان دشمنی کا ایک ثبوت ہے۔

▼■▼

غزل

دستگیر شہزاد

یاد پھر آئی تیری، موسم سلونا ہو گیا
شغل سا آنکھوں کا، بس دامن بھگونا ہو گیا

اب کسی سے کیا کہیں، ہم کس لئے برباد ہیں
اب کسی کی کیوں سُنیں، جو کچھ تھا ہونا ہو گیا

گیت بابل کے سنانے تیری سکھیاں آ گئیں
میں ترے بچپن کا اِک ٹوٹا کھلونا ہو گیا

میری پلکوں پر میرے خوابوں کے ریزے رہ گئے
نیند گھائل ہو گئی، آنکھوں میں سونا ہو گیا

پھر کسی کی یاد کیوں آتی ہے یارب! خیر ہو
میں تو آنسو پونچھ کے خوش تھا کہ رونا ہو گیا

میں کہ مشتِ خاک تھا، اُس کی نگاہوں کی شہزاد
روشنی ایسی پڑی، مٹی سے سونا ہو گیا

سمجھوتہ

ہم سب لڑکیاں رنگ منش کی کٹھ پتلیاں ہیں جو پاٹے خاں کی طرح اپنا کردار ادا کرتی چلی جاتی ہیں۔

نسیم سکینہ صدف

صبح کاذب آنکھ کھلنے کا موجب حسب سابق چچا لطیف ہی ٹھہرے۔

"لا الہ الا اللہ ...... لا الہ الا اللہ ...... لا الہ الا اللہ......" صبح صبح وہ اپنا حقہ تازہ کرتے اور ساتھ زبان پر اس ورد کی گردان کرتے رہتے۔ یہ اُن کی عادت جانے کب سے تھی۔ میں نے تو ہوش سنبھالتے ہی ان کی آواز سنی تھی منہ اندھیرے ورد کرتے رہنے کی۔ وہ ہمارے ساتھ والے ہمسائے تھے چونکہ ہمارے گھروں کے درمیان صحن کی جو دیوار ہے وہ زیادہ اونچی نہیں ہے۔ تو ہمیں اُن کی ہر سرگرمی کا پتہ چلتا رہتا تھا۔ بے خبر وہ بھی نہیں ہوتے تھے۔ ادھر ہمارے گھر میں کوئی مہمان آئے۔ اُدھر ان کو خبر ہو جاتی۔

ابو نے اونچی آواز میں بات کر لی مثلاً مجھے ڈانٹ پڑ جائے تو شمع باجی (جو کہ چچا لطیف کی بیٹی تھی) چھلانگ لگا کر درمیانی دیوار پر لٹک کے ماحول کو انجوائے کر کے نیچے اترتی۔ اس مثال کے مصداق "ہر خبر پر نظر"۔ بھلے میں ماتھے پہ جتنے مرضی بل ڈال کے دیکھ لوں، اس پر اثر ناپید ہوتا۔

"گھر میں کوئی پردہ داری ہے نہیں ہے۔ ہم نے کبھی جھانکا ہے اُن کے گھر؟" میں شکوہ کر ڈالتی امی جان سے تو وہ مسکرا دیتیں اور سمجھاتیں۔

"بیٹا ہم کون سا یہاں خودکش حملوں کی سازشیں کرتے ہیں یا کسی حساس ادارے سے منسلک ہیں۔ جہاں بم تیار ہوتے ہیں۔ عام سا گھر ہے اور عام سی باتیں ہیں۔ جو ہر گھر میں ہوتی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پہ غصہ نہیں کرتے۔ بیٹا یہ اُن کا اپنا فعل ہے کہ وہ اتنی مصروفیت میں بھی ہمارے گھر پہ نظر رکھتی ہے۔

امی کوئی پکوان بھی بنا رہی ہوتیں تو خوشبو سونگھتے ہی بوتل کے جن کی طرح دیوار پر نمودار ہو جاتی۔

"آپی! بڑی خوشبوئیں آ رہی ہیں، کیا بن رہا ہے؟ لگتا ہے بے بی کی پھپھو آ رہی ہے"۔ ایک ہی سانس میں دو فٹ کی زبان باہر نکال کر پوچھا کرتی اور مجھے بہت بُری لگا کرتی۔ میں منہ ہی سیدھا نہ کرتی۔ منہ ہی منہ میں اُسے پچھل پیری کے خطاب دے ڈالتی حالانکہ وہ مجھ سے بہت پیار بھی کرتی تھی۔ جب بھی کچھ مزے کا بناتی کہتی یہ بے بی کے لیے ہے۔ مگر میں ان کے گھر سے آئی کوئی چیز نہیں کھایا کرتی تھی۔

ایک تو اس کی امی کی بیماری کی وجہ سے پورے گھر میں دوائیوں کی بو گردش کرتی رہتی اور پھر شمع باجی کا گھر بھی اتنا صاف ستھرا نہ ہوتا۔ میٹرک کے بعد کالج جوائن کیا بڑے اونچے خوابوں کے ساتھ مگر بمشکل انٹر کیا تو گھر اور کالج آتے جاتے نے اسے چکرا کے رکھ دیا۔ ناچار اُسے دل کی حسرتوں کو دبا کر کالج کو خیر باد کہنا پڑا۔ امی تو برسوں سے بیماری بھوگ رہی تھیں۔ نہ جانے کیا روگ تھا۔ یہ لوگ اُس کی تشخیص کسی اچھے ڈاکٹر سے کروانے سے قاصر تھے۔ اس لئے کبھی کسی حکیم سے اور کبھی کسی سے دوائی لاتے اور ملکہ عالیہ کو کھلا دیتے۔

(چچا لطیف اپنی بیگم کو ملکہ عالیہ کا خطاب ہی دیتے تھے)

شمع باجی کا گھر کیا تھا، مفلسی کا منہ بولتا شاہکار تھا۔ جس کمرے میں بھی دیکھو۔ غربی بال کھولے گھٹنوں میں سر دیئے سسک رہی ہوتی۔ جتنی مرضی صفائی کرتی گھر کی شکل ہی نہ نکلتی۔ فلور ٹائلز کے دور میں سیمنٹ کے فرش کس قدر دقیانوسی لگتے ہیں۔ صدیوں پرانے بستر کی چادریں رضائیوں کے کورز اتنے بوسیدہ ہو چکے تھے کہ ان کو دھونے سے بھی نکھار نہیں آتا تھا بلکہ مزید بدرنگ سے ہو جاتے تھے۔ کہیں نیلام گھر سے خریدا ہوا سیکنڈ ہینڈ فرنیچر جس کو گھن لگنے سے چھ کرسیوں کی بجائے چار رہ گئی تھیں۔ بیڈ کی ایک ٹانگ ٹوٹنے پر اُس ٹانگ کی جگہ اینٹیں رکھ کے بھرم قائم رکھنے کی کوشش کی ہوئی تھی۔ اگر بھولے بھٹکے سے کوئی مہمان آ جاتا اور اُن کا بچہ بیڈ پر خرمستیاں کرنے لگتا تو شمع باجی کا کلیجہ منہ کو آتا تھا کہ مولا عزت سلامت رکھنا دور دور تک ان کے اپنے رشتہ دار ناپید تھے۔

روز اوّل سے ہی لطیف چچا اور رابعہ چچی مصائب و مسائل چادر میں ڈالے قریہ قریہ سرگرداں تھے جو انہیں ورثے میں ملے تھے۔ جب تقسیم کے وقت لطیف چچا کے والدین بلوائیوں نے قتل کر دیئے تھے خون کی ہولی دیکھ کر سہما ہوا سا بچہ لطیف چھپا ہوا تھا۔ ساتھ والی گلی میں اس کے خالو کا گھر تھا۔ بلوائیوں نے اس کا گھر بھی لوٹ کر آگ لگا دی تھی اور اس کی خالہ کو اٹھا کر لے گئے۔ اس کے خالو اور ان کی تین سالہ بچی رابعہ گھر سے باہر ہونے

کی وجہ سے بچ گئے تھے۔

خالو اپنی بیوی کی واپسی سے ناامید ہو گئے تو ننھے بچوں کو دونوں بازوؤں میں اٹھائے اٹھائے مسافتیں طے کرتے۔ تشدد سہتے بھوکوں مرتے۔ فاقے کرتے پاکستان کی پاک دھرتی پر سب کچھ لٹا کے پہنچ گئے۔ پانچ سالہ چچا لطیف اور تین سال کی رابعہ چچی۔ خالو نے بڑے ہونے پر دونوں کی شادی کر دی اور خود ایک بار کسی کام سے نکلے تو لوٹ کر گھر نہ آئے۔ تلاش بسیار کے باوجود بھی ان کا کوئی اتا پتہ نہ ملا۔

شمع باجی کی والدہ رابعہ چچی نے باقی عمر انگاروں پر لوٹ کے گزاری۔ مرنے والے پر تو رفتہ رفتہ صبر آ جاتا ہے مگر جو انسان زندہ کھو جائے تو اُس کا انتظار عمر بھر پلکوں پر دیا جلائے رکھتا ہے۔

وقت سے پہلے رابعہ چچی نے ہزاروں بیماریاں پال لیں۔ اکیلے پن کی محرومی نے اندر ہی اندر کئی روگ لگا دیئے۔

گھر میں اتنے لوگوں کے باوجود ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ یہ خاموشی، سرد موسم اور بیماری کی وجہ سے بھی تھی اور شاید اس گھر کے لوگوں کے اندر کے موسم کی وجہ سے بھی ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے پوری دنیا ہی خاموش ہو گئی ہے۔ اس گھر پر خوب صورت رنگوں سے سجے تہوار بھی عجیب سوگوار انداز میں اترا کرتے۔ رشتہ دار تو تھے نہیں، بس ایک سویرا آپا تھی جو شمع باجی کے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی کسی ٹرک ڈرائیور سے بیاہ دی تھی۔ جو اُسے پشاور لے جا کر جا بسا تھا۔ کبھی سال ڈیڑھ سال بعد وہ بچوں کے ساتھ آتی اور مہمان نوازی کروا کے لوٹ جاتی۔ کسی نے شمع کے کنوارے ہاتھ نہیں دیکھے تھے۔ جو گھر کے کام کر کر کے کھردرے ہو رہے تھے۔ دو بھائی تھے، ایک اس سے بڑا ایک چھوٹا۔ سب نے شاید گھر کی چپ سے سمجھوتہ کیا ہوا تھا۔ خاموشی کا دور دورہ رہتا۔ گھر کی خاطر اس نے کالج چھوڑ دیا۔ انٹر کے بعد چپ بیٹھ گئی۔ کام والی کی عیاشی افورڈ نہ کر سکتے تھے کیونکہ باپ اور بھائی کے کام میں اتنی گنجائش ہی نہ تھی۔ بمشکل گھر کی دال روٹی چلتی اور پھر امی کی دوائی آتی۔ موسم کی سختیاں جب حد سے بڑھتیں تو سردیاں گرم کپڑے بنا کرتے ورنہ وہی گھسے پھٹے کپڑے چلتے رہتے، بارہ ماہ۔ سارا دن شمع باجی کولہو کے بیل کی طرح چلتی رہتی۔

گھریلو امور بھگتا کر جب بستر پر رات کی تنہائی کے کچھ لمحے ملتے تو اُس میں وہ یہ سوچ کر دل جلایا کرتی کہ ہمارے گھر کے سامنے والی زینت خالہ اور ساتھ والی صفیہ بھابی اور دیگر گھروں سے کم حیثیت ہے۔ گھنٹوں کڑھتی رہتی، وہ ہمیشہ احساس کمتری کا شکار رہتی۔ اُس نے تو خود کو کبھی آئینے میں بھی غور سے نہیں دیکھا ہوگا۔

سنہری آنکھوں اور ڈارک براؤن گھنگریالے بالوں کی مالک۔ چمپئی رنگت والی شمع باجی جب گھنی پلکوں والی جھالر اوپر نیچے کرتی تو شاید کئی دلوں کی جان نکال لیتی۔ اس کی آنکھوں میں زندگی کی سرمستی تھی مگر بدقسمتی سے اس کے خوابوں کے نگر میں کوئی مسافر ابھی آ کے ٹھہرا ہی نہیں تھا۔ اُس کا محبتوں سے بھرا دل ہنوز خالی تھا۔ کبھی فرصت ہی نہیں ملی تھی۔ خود کے بارے میں سوچنے کا اسے پتہ ہی نہیں تھا کہ جب کوئی زندگی میں آتا ہے تو پھول کس طرح سے کھل جاتے ہیں۔ دل کی دھڑکن کس تان میں دھڑکنے لگتی ہے۔ آس پاس سے کیسے بے خبری ہو جاتی ہے، اُسے پتہ نہ تھا۔

سب رومینٹک شاعر محبت میں پاگل ہوئے پھرتے ہیں۔ اُس کی عمر کی لڑکیاں بوتیک کا ہر نئے ڈیزائن کا ڈر لیس زیب تن کرتیں اور ایمو رنٹڈ شیمپو سے جب دھلے بال گھنے جنگل کا سماں پیش کرتے تو چاند بھی شرما جاتا اور ہر ایک لڑکی کی زندگی میں کوئی تھا۔ بس شمع آپا ہی بے رنگ زندگی گزار رہی تھی جسے پہننے اوڑھنے کا سلیقہ تھا نہ

قائم تھا۔ ایک کلاس فیلو تھی جو گلی میں رہتی تھی، پرائمری اسکول سے کالج تک کا ساتھ تھا، وہ اب یونیورسٹی کے آخری سال میں تھی۔ کبھی جب ملنے آجاتی تو رومینٹک ناولز کی بات آتی تو اور وہ ان کے نام سنتی تو چپ ہو جاتی۔

''مائی ڈیئر فرینڈ! کبھی ان ہانڈی روٹی اور گھر گرہستی کے چکروں سے نکلو تو تمہیں پتہ چلے دنیا کہاں پہنچ چکی ہے''۔ ثمرہ بتا رہی تھی اور وہ ہونقوں کی طرح سن رہی تھی۔ ''میرے نانا سیالکوٹ کے ایک گاؤں میں بستے ہیں جبکہ ماموں اچھی جاب کی وجہ سے اپنی فیملی کے ساتھ اسلام آباد میں سیٹل ہیں۔ کبھی وہ آ کر مل جاتے ہیں، کبھی یہ لوگ کچھ دن اپنے پوتے پوتیوں سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر آتے ہیں۔ خون منجمد کر دینے والی جنوری میں ہم نانا کے گاؤں گئے، چھٹیاں گزارنے۔ گاؤں کی سردی شہر کی سے کافی مختلف ہوتی ہے۔ یہ بات طے ہے کہ دیہات کا درجہ حرارت شہر سے کم ہوتا ہے۔ ہریالی اور کھلی آب و ہوا کی وجہ سے در و دیوار پہ کہر جم جاتا اور تالابوں و جوہڑوں کی اوپر والی سطح پہ برف کی تہہ ہر کوئی دیکھ سکتا ہے۔ چڑیاں کہیں پتوں کے جھنڈ میں چھپی ہوتی ہیں، ہڈیوں میں یخ بستہ سردی خون منجمد کر دیتی ہے اور اس کا اپنا ہی لطف ہوتا ہے۔ بالخصوص علی الصبح کی تازہ اور یخ ہوا میں جب دانت بج رہے ہوتے ہیں، گرم چادر اوڑھ کر دور تک پیدل چلنا کسی کو یاد کرتے ہوئے پھول پتوں سے قطرہ قطرہ ٹپکتی ہوئی ٹھنڈ کو دیکھنا اور حسین خوابوں میں کھو جانا۔ کوئی میرا ہے، کوئی میرا ہے۔ میرا جو دور بیٹھا میری یادوں میں جگمگا رہا ہے۔ اس کی محبت کا یہ کیسا نشہ ہے، جو میرے روم روم میں سرایت کرتا ہے''۔ ثمرہ کی آنکھوں میں ستارے جھلمل جھلمل کر رہے تھے۔ اس کی چمکتی آنکھیں دیکھ کر شمع باجی کے اندر ایک چپ سرایت کر گئی۔ اوپری دل سے اس کو چائے پلائی اور پھر وہ دروازے تک رخصت کرنے گئی تو اپنے گھر کی دہلیز پہ خود کو کہیں گم کر بیٹھی۔ پھر ڈھونڈنے سے بھی نہ مل پائی۔

ایک دن ان کے گھر کچھ چہل پہل تھی۔ بڑی حیرت انگیز بات تھی خوشبوئیں مہک رہی تھیں اچھے کھانوں کی اور صبح سے پائپ لگا کر سارے گھر کو دھویا گیا۔ شام کو کیری ڈبے میں کچھ لوگ آئے۔ ساتھ میں مٹھائی اور پھلوں کے ٹوکرے تھے۔ پورا دن شمع باجی نے دیوار سے نہ جھانکا۔ عشاء کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ جب مہمانوں کے جاتے ہی شمع باجی نے دیوار کے اوپر سے مٹھائی اور بریانی ٹرے میں ڈال کر دی۔

''یہ کیا؟'' حیرت سے میں نے پوچھا۔

''بے بی میری بات طے ہو گئی ہے۔ اگلے ماہ میرا اور بھیا کا ساوٹی کے ساتھ نکاح ہو رہا ہے''۔

''ہمارے جیجا جی کیا کرتے ہیں؟'' میں نے خوشی سے پوچھا کہ اب اس جاسوس سے ہماری جان چھوٹے گی۔

''امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار ہے اور، اور......'' وہ رک سی گئی بولتے بولتے۔

''اور کیا شمع باجی!'' میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

''یہ جو بچے ساتھ آئے تھے نا بے بی! یہ اُن کے بچے ہیں''۔ شمع باجی نے یوں کہا جیسے کوئی مجرم اقبال جرم کر رہا ہو۔ ''بیوی فوت ہو گئی ہے اور اب میں ان کی ماں کی جگہ جا رہی ہوں۔ اور وہ چپ ہو گئیں۔ غم کی شدت سے قوت گویائی سلب ہو گئی اور وہ چپ ہو گئیں۔ سنہری آنکھوں کی جوت بجھ گئی اور مجھ سے شمع باجی کے چہرے کی طرف دیکھا نہ گیا۔ ہم سب لڑکیاں رنگ منچ کی کٹھ پتلیاں ہیں جو پاٹے خاں کی طرح اپنا کردار ادا کرتی چلی جاتی ہیں۔

جب روحاں آٹھ سال کی تھی

ان بچوں کا قصہ جو چھ دن اپنی مُردہ ماں کے ساتھ سوتے رہے اور انہیں معلوم نہ ہو سکا کہ ماں مر چکی ہے۔

☆ .... فرزانہ نگہت

وہ اکثر ہمارے گھر آیا کرتی تھی۔ سیاہ رنگ کے لمبے فراک نما لبادے، کھلے پائنچوں کی شلوار اور بڑی سی سیاہ چادر میں ملبوس، پیروں میں سیاہ مردانہ کھیڑی پہنے انتہائی سرخ و سپید چہرے کو چادر سے آدھا ڈھانپے تقریباً چھ فٹ تک پہنچتے ہوئے قد والی وہ ادھیڑ عمر کشمیرن جب بھی ہمارے گھر آتی تو والدہ اس کے سامنے بچھ جاتیں۔ نہایت محبت و عزت سے اسے اندر لا کر بٹھاتیں۔ بہترین خاطر و مدارات کرتیں، پھر جب وہ جانے لگتی تو کچھ ہدیے وغیرہ بھی اس کے ساتھ کر دیتیں۔ اکثر اوقات اس کے ہمراہ ایک چھ سات سال کا لڑکا بھی ہوتا۔ اس کے بارے میں اس نے بتایا تھا کہ وہ اس کا چھوٹا بیٹا تھا۔

مجھے کبھی اس کے پاس بیٹھنے اور اس سے باتیں کرنے کا موقع نہ مل سکا تھا کیونکہ کالج سے واپسی کے بعد ٹیوشن پڑھنے والے بچوں کی آمد شروع ہو جاتی تھی اور مجھے ان کے ساتھ مصروف ہو جانا پڑتا تھا۔ والدہ نے اس کے بارے میں صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ وہ بارہ مولہ کی مہاجر تھی۔ اس کا نام روحاں تھا۔ اس کا سارا خاندان خاوند، باپ، بھائی سب شہید ہو چکے تھے۔ وہ ایک لٹے پٹے مہاجر قافلے میں شامل ہو کر اپنے تینوں بچوں کے ساتھ بڑی مشکلات اور مصائب جھیلتے ہوئے پاکستان پہنچی تھی۔ جہاں کوئٹہ میں اس کے کچھ رشتہ دار موجود تھے جنہوں نے اس کے الگ رہن سہن کا بندوبست کر دیا تھا۔ اب وہ لوگوں کے گھروں میں کام کاج کر کے اور محنت مزدوری کر کے اپنی اور اپنے بچوں کی گزر بسر کا سامان پیدا کر رہی تھی۔

والدہ کے پاس وہ گھریلو کام کاج کے سلسلے میں آئی تھی لیکن اس کے حالات سن کر والدہ کے دل میں اس کے لئے بے پناہ ہمدردی ہی نہیں بے پناہ عزت و تکریم کے جذبات بھی پیدا ہو گئے تھے۔ وہ اسے اپنے گھر میں

ایک انتہائی معزز اور واجب الاحترام مہمان کا درجہ دیئے ہوئی تھیں اور اس کا خیال رکھنے لگی تھیں۔ ہمیں بھی انہوں نے ہدایت کر رکھی تھی کہ اس کی عزت وتوقیر کیا کریں۔ وہ شہیدوں کی بیوہ، بہن اور بیٹی تھی۔

مجھے اس کے حالات معلوم کرنے کے بارے میں تجسس بھی تھا اور دلچسپی بھی لیکن باوجود کوشش کے مجھے اس کھوج کرید کا موقع نہ مل پارہا تھا۔ وہ جب آتی تھی تو والدہ کے ساتھ ہی باتیں کرتی رہتی تھی۔ پھر اس کا آنا طویل طویل وقفوں سے ہوتا تھا۔ اکثر یہ وقفے ایک دو مہینے تک دراز ہو جاتے تھے۔

پھر ایک دن مجھے یہ موقع مل ہی گیا۔ اس دن میں بوجہ کالج سے آف بریک گھر پر تھی۔ والدہ چھوٹے بھائی کے ساتھ کسی سے ملنے گئی ہوئی تھیں۔ جب روحاں ہمارے گھر آن پہنچی۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں اسے اندر لے آئی۔

''آپا کدھر ہے؟'' اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے والدہ کی بابت استفسار کیا۔

''وہ کسی سے ملنے گئی ہوئی ہیں۔ ہاں تم تو بڑے عرصہ بعد آئیں۔ کیا کہیں گئی ہوئی تھیں؟''

''ہاں چمن! وہاں برادری کے کچھ لوگ رہتے ہیں ان سے ملنے۔''

''اچھا، کیا کرتے ہیں وہ لوگ؟''

''وہ چائے خانہ اور تندور چلاتے ہیں۔ اچھے خوشحال لوگ ہیں''۔

''وہ بھی کیا تمہاری طرح بارہ مولہ کے رہنے والے ہیں؟''

''کچھ لوگ وہاں کے رہنے والے ہیں، کچھ ہانڈی پورکے۔ ان سے وہاں بھی ہمارا میل جول تھا کشمیر میں''۔

اس نے اپنی بھاری سیاہ چادر اتار دی تھی اور سر پر دوپٹہ لے لیا تھا۔ اس وقت مجھے اسے اچھی طرح سے دیکھنے کو موقع ملا۔ ہر چند کہ بیوگی اور ادھیڑ عمری نے اس کے چہرے پر اپنے نقش ثبت کر دیئے تھے مگر وہ اب بھی خاصی حسین عورت تھی۔

''روحاں! آج تم مجھے اپنے بارے میں کچھ بتاؤ۔ اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں کے بارے میں تم نے کیا یہاں آنے سے پہلے اپنی ساری زندگی بارہ مولہ میں ہی گزاری؟'' عرصۂ دراز سے ذہن میں مچلتے سوالات میرے لبوں پر آ گئے۔

''نہیں بی بی! شروع سے ہم بارہ مولہ میں نہیں رہتے تھے۔ ہمارا باپ اماں کے فوت ہونے کے بعد ہمیں وہاں لے گیا۔ وہاں اس کے سب بہن بھائی رہتے تھے۔ وہاں ہم سب بہن بھائی بڑے ہوئے، ہماری شادیاں ہوئیں''۔

''تو تمہاری ماں تمہارے بچپن میں ہی فوت ہو گئی تھی۔ کیا ہوا تھا اسے؟''

اتنے میں چھوٹی بہن نے چائے اور دیگر لوازمات لا کر میز پر سجا دیئے تھے۔ میں نے پیالیوں میں چائے بنائی اور روحاں کی طرف بڑھاوی۔

''مجھے ٹھیک طرح یاد نہیں ہے بی بی! کہ اماں کو کیا ہوا تھا۔ اس وقت میں آٹھ سال کی تھی''۔ وہ چائے کا جرعہ لیتے ہوئے بولی۔

''تمہارے کتنے بہن بھائی تھے؟''

''ہم تین بہن بھائی تھے بی بی! میں بڑی تھی دو چھوٹے بھائی تھے''۔

''تم اس وقت کہاں رہتے تھے جب تمہاری اماں زندہ تھی؟''

''وہ کوئی پہاڑی بستی تھی بی بی! بلکہ ایک چھوٹی سی آبادی جس میں تھوڑے سے گھر تھے۔ وہ سب گھر ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے سے بہت دور دور تھے۔ سب لوگ بہت کم آپس میں ملتے جلتے تھے اور

ایک دوسرے کی خبر رکھتے تھے۔ سب لوگ بے حد غریب تھے۔ وہ اپنے کچے مکانوں میں اپنے مویشیوں کے ساتھ رہتے تھے۔ ہمارا گھر بھی کچا تھا۔ لکڑی اور مٹی کا بنا ہوا جب برف پڑتی تو ہمیں بہت سردی لگتی۔ ہماری چھت برف کے بوجھ سے کبھی کبھی ٹوٹ بھی جاتی''۔

''تمہارا باپ کیا کام کرتا تھا؟''

''بابا کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ وہ گھر پر ہوتا ہی نہیں تھا۔ وہ کبھی کبھی ہی گھر آتا تھا۔ پھر دو تین دن بعد پھر کہیں چلا جاتا تھا۔ ہم اماں سے پوچھتے تو وہ کچھ نہ بتاتی۔ بس یہی کہتی کہ وہ باہر اپنا کام کرتا ہے لیکن بابا کبھی کوئی پیسے گھر نہ لاتا تھا۔ کبھی کبھی وہ زخمی ہو کر گھر آتا تو اماں اس کی خوب خدمت کرتی پھر جب وہ ٹھیک ہو جاتا تو پھر گھر سے چلا جاتا''۔

''پھر تم لوگوں کا گزارا کیسے ہوتا تھا؟''

''ہمارے پاس بھیڑ بکریاں تھیں۔ پھر گھر کے باہر خالی زمین بھی تھی جس پر ہم گرمیوں میں کچھ سبزیاں اگا لیتے تھے''۔

''بابا کے بغیر اکیلے رہتے تم لوگوں کو کیا ڈر نہیں لگتا تھا؟''

وہ مسکرائی۔ ''بی بی! اماں ایک بہت بہادر عورت تھی۔ وہ بندوق چلانا جانتی تھی، چاقو چلانا بھی اسے آتا تھا۔ وہ دور دور تک اکیلی چلی جاتی تھی۔ کسی سے نہیں ڈرتی تھی۔ اسے دیکھ کر ہم بہن بھائی بھی بہادر بن گئے تھے''۔

''تمہاری اماں بہت خوبصورت ہوگی زروجان؟''

وہ مسکرائی۔ ''ہاں بی بی! اماں بہت بہت خوبصورت تھی۔ بابا اسے ''زون'' کہا کرتا تھا''۔

''زون...... یہ کیا اس کا نام تھا؟''

وہ بے ساختہ ہنس دی۔ ''نہیں بی بی! یہ اماں کا نام نہیں تھا۔ زون ہماری کشمیری زبان میں چاند کو کہتے ہیں''۔

''اوہ...... اچھا!'' میں ہنس دی۔ ''تو وہ کس طرح فوت ہوئی؟''

اس نے خالی پیالی پرچ میں رکھتے ہوئے گہری سانس لی۔ اس کے چہرہ پر بے پناہ دکھ اور کرب کے تاثرات ہلکورے لینے لگے تھے۔

''ان سردیوں میں بہت سردی پڑی تھی بی بی! بہت دنوں تک بھاری برف باری ہوتی رہی۔ بابا گھر سے گیا ہوا تھا۔ اماں اتنی برف اور سردی میں بھی کام کرتی رہی۔ باہر سے جلانے کی لکڑیاں لانا، چھت پر سے برف صاف کرنا، مویشیوں کے لئے چارے کا انتظام کرنا۔ ایک دن کام کرتے کرتے وہ بستر پر لیٹ گئی۔ اس نے ہم بہن بھائیوں کو بھی اپنے ساتھ بستر پر لٹا لیا۔ وہ بہت گرم ہو رہی تھی، بی بی! جیسے جل رہی ہو۔ میں نے پوچھا۔ اماں! تم کو کیا ہو گیا ہے؟ تم اتنی گرم کیوں ہو رہی ہو؟ تو وہ بولی۔ 'مجھے بخار چڑھ گیا ہے، ابھی ٹھیک ہو جاؤں گی'۔ رات کو ہم بہن بھائی اس کے ساتھ اس کے بستر میں سو گئیں صبح ہم جاگے تو ہم نے دیکھا کہ اماں ابھی تک سو رہی تھی۔ اس کا جسم اب گرم نہیں تھا بلکہ بہت ٹھنڈا تھا۔ ہم اسے سویا ہوا چھوڑ کر بستر سے اتر آئے۔ دن چڑھ گیا مگر اماں سوتی ہی رہی۔ ہم بہن بھائیوں نے اسے کئی بار پکارا، اسے جھنجھوڑا لیکن وہ نہ جاگی۔ اس پر ہم نے کہا۔ ''چلو اماں کو سونے دو، وہ بہت تھک گئی ہے''۔

مجھے وحشت سی ہونے لگی۔ ''تم نے کیا یہ نہیں دیکھا تھا کہ وہ سانس لے رہی تھی، اس کی نبض چل رہی تھی؟''

''یہ باتیں مجھے کہاں معلوم تھیں بی بی! اس وقت تو میں آٹھ سال کی تھی۔ ایک چھوٹی سی لڑکی''۔

''تم نے کیا آس پاس کسی کو اپنی اماں کے بارے میں خبر نہیں کی؟''

''نہیں بی بی! ہم بہن بھائی تو یہ سمجھتے رہے کہ اماں آرام سے سو رہی ہے، اسے سونے دو''۔

''پھر...... پھر تمہیں کیسے پتا چلا کہ تمہاری اماں مر چکی ہے؟''

''ہمیں کوئی پتہ نہیں چل سکا، ہم سب بہن بھائی یہ سمجھتے رہے کہ اماں سو رہی ہے، اسے تنگ نہیں کرنا''۔

میرا دم گھٹنے لگا۔ ''تو تم بہن بھائی اس کے کمرے میں اس کے ساتھ ہی رہتے رہے؟''

''میرے دونوں چھوٹے بھائی تو اماں کے کمرے کے ساتھ بنے ہوئے بھیڑ بکریوں کے باڑے میں چلے جاتے اور سارا دن وہاں کھیلتے رہتے۔ میں باہر سے چھوٹی چھوٹی لکڑیاں چن چن کر لاتی جن سے اماں کے کمرے کا آتش دان دن رات جلتا رہتا۔ میں بکریوں، بھیڑوں کے لئے برف میں دبی گھاس پھونس جھاڑیاں ٹہنیاں بھی تلاش کر کے لاتی''۔

''اتنی عمر میں تم کیا ہانڈی پکا لیتی تھیں؟ تم کھانے پینے کا انتظام کیسے کرتی تھیں؟''

وہ مسکرائی۔ ''بی بی! ہانڈی تو اماں نے بھی کبھی نہیں پکائی۔ وہ یہ کرتی تھی کہ مکئی جوار اور باجرے کی موٹی موٹی روٹیاں پکا کر رکھ دیتی تھی۔ وہ ہم بھیڑ بکریوں کے مکھن اور دودھ کے ساتھ کئی کئی دن کھاتے تھے۔ جب بابا آتا تھا تو وہ اپنے ساتھ کچھ پھل اور خشک میوے لے آتا تھا''۔

''تمہاری اماں ہر وقت سوئی رہتی تھی۔ اس طرح تم بہن بھائیوں کو اکیلے ڈر نہیں لگتا تھا؟''

''نہیں بی بی ڈر کیوں لگتا؟ ہم تو اماں کو سویا ہوا سمجھتے رہتے تھے۔ تمام دن دونوں بھائی اپنے کھیل کود میں اور میں اپنے کاموں میں مصروف رہتی۔ پھر شام ہوتے ہی میں لالٹین جلا دیتی، اس کی روشنی میں ہم بہن بھائی اماں کے بستر کے قریب اپنے بستر بچھا کر آرام سے سو جاتے''۔

''میرے خدا! ایک مردہ عورت کے پاس...'' میں نے لرز کر سوچا۔

''پھر تمہارا بابا کب آیا؟''

''جب اماں سوئی تھی اس کے چھ دن بعد...... وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ تین اور آدمی بھی تھے۔ جو بری طرح سے زخمی تھے۔ خود بابا بھی زخمی اور کچھ لنگڑا کر چل رہا تھا۔ اس نے جب اماں کو دیکھا تو بے تحاشا دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ اس وقت ہمیں معلوم ہوا کہ اماں تو اسی رات مر گئی تھی جب وہ بستر پر جا کر لیٹ گئی تھی اور ہمیں بھی اپنے ساتھ لٹا لیا تھا''۔ روحاں کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

''پھر بابا ہم بہن بھائیوں کو لے کر بارہ مولہ چلا آیا۔ وہاں اس کے بہن بھائی، ہمارے دو چچا اور تین پھوپھیاں رہتے تھے۔ ہم ان کے ساتھ رہنے لگے۔ وہ بہت اچھے لوگ تھے۔ ہم سے بہت محبت کرتے تھے۔ بابا کی طرح دونوں چچا بھی مجاہد تھے جو ہندو سے لڑنے کئی کئی دن گھر سے غائب رہتے تھے۔ پھر ایک معرکے میں بابا شہید ہو گیا۔ ہم بہن بھائی اس وقت تک بڑے ہو چکے تھے۔ بڑی پھوپھی نے میری شادی اپنے بیٹے سیف اللہ سے کر دی۔ وہ بھی مجاہد تھا۔ اس کا اور میرا صرف چھ سال تک ساتھ رہا۔ وہ ایک گوریلا جنگ میں شہید ہو گیا تھا۔ اس کی شہادت کے کچھ عرصہ بعد بھارتی فوجی ہماری بستی پر چڑھ دوڑے۔ انہوں نے بہت تباہی و بربادی مچائی۔ قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ وہاں سے بہت کم لوگ اپنی جانیں سلامت لے کر بچتے بچاتے بڑی مشکلوں اور مصیبتوں سے پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو سکے۔ میں اور میرے بچے تو بچ گئے لیکن بابا کے بہن بھائی سب اپنے خاندانوں سمیت موت کے گھاٹ اتر گئے۔ میرے دونوں بھائیوں کا بھی آج تک کوئی پتہ نہیں چل سکا''۔

◆□◆

علم و تحقیق

آواز

بھانت بھانت کی آوازوں کی وجہ سے ہی دنیا میں رنگینی ہے۔
ذرا سوچیں!! اگر ہر طرف خاموشی چھا جائے تو دنیا کیسی لگے گی؟

شازیہ محسن

آپ صبح الارم کی آواز سن کر اٹھتے ہیں یا کوئی انسانی آواز آپ کو جگا دیتی ہے۔ اس کے بعد رات سونے تک آپ کا واسطہ بھانت بھانت کی لاتعداد آوازوں سے پڑتا ہے۔ انسانی آوازیں، مشینی آوازیں، جانوروں کی آوازیں، پرندوں کی آوازیں، گاڑیوں اور ان کے ہارن کی آوازیں، فون کی آوازیں، آوازیں ہی زندگی کا ثبوت ہیں۔ آوازیں...... آوازیں...... آوازیں!

آپ کے کان کھلے ہیں، مختلف آوازیں تو آپ کے کانوں میں پڑ رہی ہیں مگر آپ کی محویت میں کوئی فرق نہیں آ رہا ہے۔ کیا آپ کی سماعت متاثر ہے؟ نہیں ایسا نہیں ہے بلکہ جیسے ہی آپ کے نام سے کوئی آپ کو آواز دیتا ہے، آپ چونک اٹھتے ہیں۔ کیا وجہ ہے؟

آیئے، آپ کو بتائیں کہ آواز ہے کیا اور یہ کیسے سفر کرتی ہے۔

آواز Sound اشیاء کی حرکت سے پیدا ہونے والی توانائی ہے۔ ہوا کے ذرات کے ارتعاش سے پیدا ہونے والی لہر اسی سمت میں چلتی ہے جس سمت میں ارتعاش ہو رہا ہو۔ آواز کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کی خدمت بھی ہوا ہی انجام دیتی ہے۔ ٹھوس اشیاء یا سیال مادوں میں ارتعاش سے پیدا ہونے والی بڑی اور چھوٹی موجیں جب کان کے پردوں سے ٹکراتی ہیں تو ہم آواز سنتے ہیں۔ ارتعاش کی یہ امواج ہوا میں سات سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اور پانی میں تین ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کرتی ہیں۔ انسانی کان صرف اس لرزتے ہوئے جسم کی آواز سن سکتا ہے جس کی فریکوئنسی کی شدت 20 سے زیادہ اور 20 ہزار سے کم ہو۔

آواز پیدا کرنے کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں۔ ایک لرزتا ہوا جسم (Vibrating Body) اور دوسرا مادی واسطہ (Material Medium) مثلاً ہوا وغیرہ کیونکہ آواز کی لہریں خالی فضا یا خلا (Vacum) میں سے نہیں گزر سکتیں۔ جب آبی بخارات کی مقدار ہوا میں

بڑھ جاتی ہے تو ہوا کی کثافت کم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ٹمپریچر بھی آواز کی رفتار پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر ہوا کے ٹمپریچر میں ایک درجہ سینٹی گریڈ کا اضافہ کیا جائے تو اس میں آواز کی رفتار کی قیمت تقریباً 2 فٹ فی سیکنڈ بڑھ جائے گی۔ ہوا میں 15 درجے سینٹی گریڈ پر آواز کی رفتار 1120 فٹ فی سیکنڈ ہے۔ دیگر واسطوں میں آواز کی رفتار مقابلتاً زیادہ ہے۔

کبھی کبھی آپ ایک ٹک کسی خاص چیز کی جانب دیکھ رہے ہیں، اس چیز کی حرکات اور سکنات میں گم ہیں۔ ٹھیک سامنے سے آتا ہوا دوست بھی آپ کو نظر آ رہا ہے، وہ کچھ بول رہا ہے، آس پاس کے لوگ تو سن رہے ہیں مگر آپ ہی سمجھ نہیں رہے ہیں۔ یہ کیا معاملہ ہے؟ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ آواز کی شناخت کے لئے صرف آنکھ اور کان ہی نہیں، دماغ کا حاضر رہنا بھی ضروری ہے۔ یہ حاضری ہی آپ کو آواز کی پہچان کراتی ہے۔ سماعت خراب ہو تو اچھے خاصے دھماکے کی محنت بھی اکارت جاتی ہے مگر دماغ کی حاضری آنکھ کی روشنی اور کان کی موجودگی میں آواز کی رسائی اور اس کی شناخت ہوتی ہے ورنہ لوگ آپ پر آوازیں کسیں یا آواز وہ آپ ٹس سے مس نہیں ہوں گے۔

کبھی شور وغل میں آپ کے کان ایک خاص آواز کو پہچان لیتے ہیں۔ پھر اس کا چہرہ بھی دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان باتوں سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ سننے کا تعلق کانوں سے ہی نہیں دماغ سے بھی ہوتا ہے۔ یہ تجربہ بھی ہوا ہے کہ لوگ منہ کھول کر سن لیتے ہیں مگر آپ منہ کے اندر کانوں کی تلاش شروع نہ کریں۔ ایسا شاذ ہی ہوتا ہے آدمی کبھی بیٹھے بیٹھے کسی آواز کی وجہ سے خود ہی چونک اٹھتا ہے۔ یہ اس کے اندر کی آواز ہوتی ہے۔ خیال وتصور کی آوازیں ہی دماغ کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ یعنی آواز کا سرچشمہ دماغ ہی ہے جو خواب کی چیخ و پکار اور غیبی آوازیں بھی آپ تک پہنچاتا ہے۔ لاشعور کی محفوظ آوازیں ذہن میں اچانک گونجنے لگتی ہیں۔ ان آوازوں کو جو آپ نے بچپن میں استعمال کی تھیں۔ آپ جدید دور میں بھی سن سکتے ہیں۔

لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام

یوں آواز کی بازگشت باقی رہتی ہے۔ الفاظ بھی دہرائے جا سکتے ہیں کسی حد تک ہپناٹزم یا تنویمی عمل بھی دورِ گزشتہ کو واپس لے آتا ہے جو آپ کو اپنی آواز بھی سناتا ہے۔

حاتم طائی کے ایک سفر میں کوہ ندا کی خبر لانا بھی ایک معجزاتی پُراسرار آواز کا تعاقب تھا۔ اس کہانی میں وہی شخص اس پہاڑ کی جانب یا آواز کی سمت بڑھتا تھا جس کو آواز نے طلب کیا ہو لاکھ کوشش کے باوجود وہ شخص رکتا نہیں۔ شاید اس قسم کی آواز اللہ کی جانب سے نیک بندوں کے لئے جاری رہتی ہے اور ان پیغمبروں کے لئے بھی تھی جو اللہ کا پیغام ہم جیسے بے سماعت اور بے دماغ لوگوں تک پہنچاتے رہے ہیں اور جو لوگ اللہ کا پیغام سن کر بھی سمجھ نہ سکے۔ ان کے لئے قرآن میں گونگے، اندھے اور بہرے کے الفاظ ہیں۔

آج ٹرانسمیٹر، واکی ٹاکی یا خفیہ آواز کی لہر۔'' بنام کوڈ سسٹم'' کا نیا دور ہے جو ایک خاص فریکوئنسی ایک خاص آلہ تک رسائی کرتی ہے۔ یوں آج کا دور کسی حد تک روحانی آوازوں پر قابض ہو رہا ہے۔ خاص طور پر ٹیلی پیتھی پر جو تجربات ہو رہے ہیں وہ نام نہاد روحانی اور سائنسی آوازوں کی منزلیں ہیں جو سر کی جا رہی ہیں۔ اب سائنس دان خلا میں موجود تاریخ کی گمشدہ آوازوں کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ خاص طور پر اسلام کے ابتدائی دور کی آوازوں کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

آوازوں سے آلات کنٹرول کرنے کا سسٹم

کامیاب ہو چکا ہے۔ آپ کی تالی سے لیمپ جلتا ہے۔ آپ کی آواز سے دروازہ کھل سکتا ہے۔ تجوری کھل سکتی ہے۔ روحانی تجربوں میں لوگوں کے دل اور دماغ کھل جاتے ہیں۔ راستے روشن ہو جاتے ہیں۔ دنیا روشن ہو جاتی ہے۔ گھر کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ برین واشنگ یا ذہنی غسل کا تعلق بھی آواز سے ہی ہے۔ ایک مسلسل آواز سے ترغیب و تحریف کا کام لیا جاتا ہے اور سابقہ خیالات ذہن سے صاف کر دیئے جاتے ہیں۔ آوازوں کی لہروں سے جانوروں کو بلایا جا سکتا ہے۔ مچھلیوں کو کناروں کی دعوت دی جا سکتی ہے۔ چوہوں کو خودکشی پر آمادہ کیا جا سکتا ہے۔ آواز کی لہروں سے چوہے دم توڑتے دیکھے گئے ہیں۔ ہرن اپنی لیلیٰ کی تلاش میں سپیکر کے قریب بھٹکتے دیکھے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کئی نافرمان قوموں کو آواز سے ہلاک کیا ہے۔ قوم عاد و ثمود تباہ ہو چکی ہیں مگر ان کی مثال زندہ ہے۔

آواز کی قوت اور رفتار کا انحصار ہوا پر بھی ہے۔ ہوا کی لہروں پر آواز کی لہریں چلتی ہیں مگر پانی کے اندر بھی آواز کا چلنا کچھ عجیب سا محسوس ہوتا ہے بلکہ خشکی کی آواز پانی کے اندر بھی پہنچتی ہے۔ ڈولفن کو کناروں سے آواز دی جاتی ہے۔ پرانے مچھیرے چند خاص مچھلیوں کو جال سے پکڑنے کے لئے کشتی کو کسی لکڑی سے دفعے وقفے سے پیٹتے ہیں اور کچھ دیر کے بعد جال ڈال دیتے ہیں۔ مچھلیوں کی خاص نسلیں آواز کی جانب لپک کر آتی ہیں۔ روشنی کی رفتار جو ایک لاکھ تراسی ہزار میل فی سیکنڈ ہے۔ بہر حال آواز کی رفتار سے بہت تیز ہے۔ آواز کی رفتار روشنی کی رفتار کے بعد دوسرے نمبر پر ہے۔ بجلی کی کڑک دار آواز ہماری سماعت پر بہت دیر کے بعد کوکتی ہے مگر اس سے پہلے روشنی ہم تک پہنچ جاتی ہے۔

کسی ندی کے کنارے یا ندی کے پل سے دوسرے کنارے پر کسی کو کپڑے دھوتے ہوئے دیکھیں تو

آواز

* انسان تب سمجھدار نہیں ہوتا جب وہ بڑی بڑی باتیں کرنے لگے۔ انسان تب سمجھدار ہوتا ہے جب وہ چھوٹی چھوٹی باتیں سمجھنے لگے۔ (حکیم ممتاز۔ میانوالی)
* اللہ تعالیٰ سے معافی اور رحمت کا سوال کرتے رہا کرو کیونکہ ایمان کی نعمت نصیب ہو جانے کے بعد تندرستی سے بہتر کوئی نعمت نہیں۔

(محمد اعظم۔ رحیم یار خان)

آواز جو کپڑوں کے پٹخنے کی ہوتی ہے وہ کپڑے اٹھانے اور پٹخنے کے درمیان کا فرق محسوس کرائے گی۔ علامہ اقبالؒ نے جو کہا تھا۔

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا

مگر یہاں تو آواز کو بھی گرفتار کیا گیا ہے۔ ریڈیو ٹیلی وژن، ٹیلی فون، ٹیپ ریکارڈ، ڈی وی ڈی آواز کی انرجی یا قوت کا استعمال ابھی بڑے پیمانوں پر شروع نہیں ہوا ہے۔

آواز کی قوت سے کانوں کے پردے پھٹ سکتے ہیں دماغ کی رگیں ٹوٹ سکتی ہیں۔ حمل ساقط ہو سکتے ہیں۔ اشیاء اور آدمی فضا میں اڑ سکتے ہیں۔ یہ بے آواز زمین مدتوں آواز کے لئے ترستی رہی تھی مگر اب یہ آوازوں سے لرزتی رہتی ہے۔ انسان دنیا میں اپنی آمد کا اعلان رونے کی آواز سے کرتا ہے۔ ابھی دنیاوی کانوں نے بہت سی آوازوں کو سنا ہی نہیں ہے اور مگر آلات سے انہیں محفوظ کرنے کی کوشش ضرور کی ہے۔

آواز کی دنیا ایک عجیب دنیا ہے، ریت کے سانس لینے کی آواز، پودوں کے اگنے کی آواز، رگوں میں خون دوڑنے کی آواز، جنہیں آپ خود بھی تجربے سے گزر کر سن سکتے ہیں۔ ابھی روشنی کی آواز، دل ٹوٹنے کی آواز تو

شاعروں کے اشعار تک محدود ہے۔ کل یہ آوازیں بھی محفوظ کرلی جائیں گی۔ آواز کی لہروں کا ایک حیرت انگیز تجربہ ہم نے بھی دیکھا کہ ایک عورت کے گانے سے سامنے جلتا ہوا بجلی لیمپ ٹوٹ کر اس کے قدموں میں گر جاتا تھا۔ روایت ہے کہ تان سین کے دیپک راگ گانے سے بجھے ہوئے دیے جل اٹھتے تھے اور راگ ملہار سے بارش ہوجاتی تھی۔

تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ آسمانی آوازیں پیغمبروں کے علاوہ عام آدمیوں نے بھی سنی ہیں جو محفوظ کرلی گئی ہیں۔ ان آوازوں میں جنگ عظیم سے بھی پہلے کی جنگوں کی آوازیں تھیں۔ حضرت عمرؓ منبر پر خطبہ دے رہے تھے، وہیں سے فرمایا۔ ''یا ساریا الجبل'' یہ آواز اللہ کے حکم سے ہوا نے کوسوں میل دور میدان جنگ تک پہنچا دی تھی۔

ایک خواب کی آواز کی بنیاد پر نورالدین زنگی مصر سے مدینہ پہنچے تھے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضہ تک پہنچنے والے دو بدطینت چہروں کی شناخت کرلی تھی۔ ابراہیم ادہم کا خواب بھی ایک آواز تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام کی آواز ان کا بیٹا بھی نہ سن سکا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آواز خدا تک پہنچی۔ اس کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ یہ ان کی دعائیں تھیں۔ حضرت امام حسینؓ کی آواز جو حق کی آواز تھی آج بھی اسلام کے پیکر میں ہمارے خون کی آواز ہے۔ ایک بار جو خدائے بزرگ و برتر کی آواز سن لیتا ہے وہ کسی کی آواز نہیں سن سکتا۔

انتظار کیجیے!

''صور اسرافیل'' کا جو کہ آوازوں کے ایک لامتناہی سلسلے کا اختتام ہوگا اس آواز سے پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح بکھر جائیں گے اور دنیا تہہ و بالا ہو جائے گی۔ پھر کائنات خاموش ہوجائے گی، مکمل خاموش!

لکی کمیٹیاں، بیمہ، جوا اور عوام

بیمہ پالیسیوں کی جو صورت آج کل مروج ہو چکی ہے اسے جائز نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اس میں بھی لکی کمیٹیوں کی طرح غریبوں کا سرمایہ فریب کے ذریعے امیروں تک منتقل ہو جاتا ہے۔

☆ ------------------------------ کے ایچ مجاہد

منطقی:۔ یار آج کل ہر طرف جو لکی سکیموں جہیز کمیٹیوں وغیرہ کا سیلاب آیا ہوا ہے جس میں صرف گاڑیاں، موٹر سائیکل، گھر کا سامان ہی نہیں دیا جا رہا بلکہ زیارات وعمرہ کی بھی سکیمیں چل رہی ہیں، اس بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

فلسفی:۔ دیکھو مجھے کی بنیادی بات یہ ہے کہ یہ کام کرنے والے کوئی خدا ترس، انسانیت کے ہمدرد یا غریبوں کے مددگار نہیں بلکہ بڑے بڑے سرمایہ دار ہیں اور لوگوں کی سب سے بڑی کمزوری لالچ سے فائدہ اٹھا کر اپنی دولت میں بے تحاشا اضافہ کر رہے ہیں اور غریب لٹ رہے ہیں اور چونکہ یہ کام وہ اپنی خوشی اور مرضی سے کر رہے ہیں اس لئے انہیں لٹنے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ یہ جوا ہے زیارات/عمرہ کے انعامات سے بھی یہ حلال نہیں ہو سکتا، حرام پیسے سے کی جانے والا تو حج بھی قبول نہیں ہوتا۔

منطقی:۔ لیکن وہ تو ہر ماہ قرعہ اندازی کے ذریعے معمولی رقم یا ایک دو قسطوں کے بدلے موٹر سائیکل گاڑی یا کوئی اور قیمتی چیز دیتے ہیں پھر وہ لوٹ کیسے رہے ہیں جبکہ جس شخص کی کوئی چیز قرعہ اندازی میں نکل آتی ہے اسے اس کے بعد باقی قسطیں معاف ہو جاتی ہیں پھر وہ حرام کیسے ہو گیا؟

فلسفی:۔ بھائی یہ ہاتھی کے دکھانے کے دانت ہیں، اسی کی آڑ میں تو وہ لوٹتے ہیں۔ دیکھیں جس چیز کی سکیم چلائی جاتی ہے اس کی ایک مخصوص رقم کی اتنی قسطیں بنائی جاتی ہیں کہ مجموعی رقم اس چیز کی اصل قیمت سے کافی زیادہ بنتی ہے پھر اس سکیم میں ایک بڑی تعداد میں ممبر شامل کیے جاتے ہیں اور ایک طے شدہ مخصوص تعداد پوری ہونے سے قبل سکیم شروع ہی نہیں کی جاتی۔ یوں ہر ماہ ان شرکاء کی قسطوں سے ایک بڑی مقدار میں رقم اکٹھی ہوتی ہے جسے سرمایہ دار چلتے ہوئے منافع بخش کاروباروں یا حصص وغیرہ میں لگا کر فوری طور پر منافع کماتے ہیں اور ہر ماہ قرعہ اندازی سے ایک موٹر سائیکل، کار یا کوئی اور قیمتی چیز کسی ایک ممبر کو انعام میں دے دیتے ہیں اور اس کی باقی قسطیں معاف کر دیتے ہیں۔ اس سے انہیں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا کیونکہ اسی کو دکھا کر وہ بھاری رقم اکٹھی کر کے لمبا منافع کماتے ہیں اور اسے اگر ان کا نقصان بھی سمجھا جائے تو یہ ہر ماہ پہلے سے ایک قسط کم ہوتا جاتا ہے اور جمع شدہ سرمایہ ہر ماہ بڑھتا جاتا ہے اور اس کا منافع بھی۔ جب سکیم ختم ہوتی ہے تو وہ دی جانے والی چیزوں کی اصل قیمت سے کہیں زیادہ رقم کے

مشکوک چیز کے حق میں فتویٰ دے دیتے ہیں۔ کچھ اصل صورت حال سے لاعلم ہونے کی بنا پر ایسا کرتے ہیں کیونکہ بیمہ کمپنیاں ان کے سامنے بیمے کی ایک معصوم سی شکل رکھ کر ان سے اپنی مرضی کا فتویٰ لے لیتی ہیں۔ اندرونی مضمرات تک ان کی رسائی نہیں کیونکہ وہ عالم ہوتے ہیں سرمایہ دار نہیں بعض لوگ مفادات کے تحت ایسے فتوے دیتے ہیں لیکن محتاط اور مستند علماء کی اکثریت موجودہ بیمہ سسٹم کے خلاف ہے۔

منطقی:۔ بیمے میں لوگوں کو اصل رقم سے زیادہ اکٹھی رقم مل جاتی ہے جبکہ وہ تھوڑی تھوڑی ادا کرتے ہیں پھر اس کو غلط کیسے کہا جاسکتا ہے؟

فلسفی:۔ دیکھیں بیمہ کمپنیاں بہت سے لوگوں سے ماہانہ، سہ ماہی، ششماہی یا سالانہ بنیادوں پر ایک چھوٹی رقم وصول کرتی ہیں لیکن یہ رقم بہت بڑی ہو جاتی ہے جب یہ اکٹھی ہو جاتی ہے۔ وہ کمپنیاں اس رقم کو حصص، ہولڈنگ، پراپرٹی یا کسی بھی بھاری منافع دینے والے کاروبار میں لگا دیتی ہیں یا بینکوں کو دے دیتی ہیں جو آگے سود پر اسے قرض دے دیتی ہیں۔ ہر صورت میں بیمہ کمپنیاں بغیر کسی اضافی محنت کے بھاری منافع حاصل کرتی ہیں۔ اس میں سے وہ اپنے ملازمین کو بھاری تنخواہ، مراعات، کمیشن اور سہولیات اور بونس دیتی ہیں پھر بھی ایک بڑی رقم ان کو بچ جاتی ہے۔ یہ سلسلہ برسوں چلتا ہے اور معاہدے کے مطابق جب کسی کی پالیسی ختم ہو جاتی ہے تو اسے اس کی اصل رقم سے ڈیڑھ یا دو گنا رقم ادا کر دی جاتی ہے لیکن یہ ان کی رقم سے کمائے گئے منافع کا حقیر حصہ ہوتا ہے کیونکہ وہ رقم برسوں تک سودی اور مشکوک کاروباروں میں استعمال ہو ہو کر کتنے ہی گنا بڑھ چکی ہوتی ہے اور بظاہر انہیں اپنی رقم سے زائد رقم اکٹھی ملتی ہے لیکن مہنگائی اور افراط زر بڑھنے اور روپے کی قدر کم ہونے کے باعث ان کو ملنے والی رقم کی ویلیو ان کی اصل رقم سے بھی کم ہو چکی ہوتی ہے۔ خصوصاً سونے اور جائیداد کی قیمتیں تو ان تمام سالوں میں کئی گنا بڑھ جاتی ہیں، یوں پالیسی لینے والے کو فائدے کی بجائے نقصان ہوتا ہے۔

منطقی:۔ لیکن پالیسی کے دوران حادثاتی طور پر مر جانے، معذور ہو جانے یا کسی بھی قسم کا نقصان ہو جانے کی صورت میں کمپنیاں ان کو معاہدے کے مطابق پالیسی کی طے شدہ پوری رقم بھی دیتی ہیں اور باقی اقساط معاف بھی کر دیتی ہیں۔

فلسفی:۔ بالکل ایسا ہی ہے اور اسی وجہ سے تو لوگ پالیسی لینے پر مائل ہوتے ہیں یہ بھی لکی سکیموں کے قرعہ اندازی والی بات ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ایسے حادثات کی طرح بہت کم ہے، زیادہ تر پالیسیاں معاہدے کی مدت پوری کر جاتی ہیں اس لئے اگر کمپنیاں چند لوگوں کو ادا کر بھی دیں تو ان کے بھاری منافع میں کوئی خاص فرق نہیں آپڑتا، یہ جوئے کی ہی ایک شکل ہے۔ اسے جائز نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اگر تمام بیمہ داروں کو ان کی رقم کے تناسب سے منافع دیا جائے، بے شک کمپنیاں اپنا جائز حق خدمت/مناسب تنخواہ بھی لے لیں اور رقم حرام اور مشکوک کاروباروں میں نہ لگائی جائے تو اسے جائز قرار دیا جاسکتا ہے اصل میں تو کسی کے نقصان کی تلافی کی ذمہ دار تو حکومت ہے جو ٹیکس تو لیتی ہے مگر مکمل طور پر اپنی ذمہ داری پوری نہیں کرتی۔

انشورنس کے جو طریقے اس وقت تک مروج ہیں وہ سب سود اور قمار پر مشتمل ہیں اور حرام ہیں۔ "مجمع الفقیہ الاسلام" جدہ میں ساری دنیائے اسلام کے علماء نے جمع ہو کر اس مسئلے پر مفصل بحث کی اور بالآخر انشورنس کے مروجہ طریقوں کی حرمت کا فتویٰ دیا۔ اس اجتماع میں 145 ملکوں کے 150 علماء شریک ہوئے۔

(فتویٰ عثمانی جلد 3 صفحہ 328 مکتبہ معارف القرآن کراچی)

بدتہذیبی

کیا یہ عادت ناگوار بدتہذیبی نہیں؟ اگر نہیں تو آپ بھی سڑ سڑ کرتے رہیں کیونکہ زندگی میں ہر شخص سڑ سڑ کرتا ضرور ہے۔

☆ .... جاوید جماعت

"اوپا جی! سڑکا لگا کر چائے نہ پیوں تو مزا ہی نہیں آتا"۔ سڑکا لگا کر چائے پینے سے منع کرنے پر میرے چچازاد بھائی ظفر نے بذلہ سنج ہونے کا پورا پورا ثبوت دیا۔ وہ مجھ سے تقریباً ڈیڑھ سال چھوٹا ہے۔ آج کل کاشتکاری کرتا ہے، جوانی میں بس ڈرائیور اور کنڈیکٹر رہا ہے۔ ضلع ساہیوال میں کسووال کے قریبی گاؤں چک نمبر 8/14-L چیرواں کا رہائشی ہے۔ ان دنوں یعنی 1970ء میں میں میٹرک کا طالب علم تھا اور وہ آٹھویں میں میرے چھوٹے بھائی طاہر کا کلاس فیلو تھا۔ ہم لوگ راولپنڈی میں رہائش پذیر تھے۔ میرے والد مرحوم فوج میں صوبیدار تھے۔

ظفر کو گاؤں سے اس لئے لایا گیا تھا کہ شہری ماحول میں ہمارے ساتھ رہے گا تو پڑھ لکھ جائے گا کیونکہ گاؤں کا ماحول پڑھائی کا نہ تھا۔ وہاں پڑھانا کیا خاک تھا جہاں دوسرے بہت سے کاموں سے ہی فرصت نہ ملتی تھی۔ یعنی کھیتوں سے چارہ کاٹ کر لانا پھر ٹوکہ مشین سے باریک کاٹنا اور مویشیوں کو کھرلیوں میں ڈال کر کھلانا اور اس کے علاوہ بھی دوسرے بہت سے کام سرانجام دینا وغیرہ۔

مگر وہ چند ماہ ہمارے ساتھ رہ کر بھی پڑھائی میں دل نہ لگا سکا اور گاؤں واپسی کی راہ لی۔ وہ جتنا عرصہ ہمارے ساتھ رہا نت نئی شرارتوں میں مصروف رہا اور پڑھائی کی طرف دھیان نہ دیا۔ آخر چچا کے بار بار کے اصرار پر واپس بھیج دیا گیا۔ جن کے اس کے بغیر گھر کے کام نہ چلتے تھے۔ اب جب بھی ملاقات ہوتی ہے تو پچھتاتا ہے اور کہا کرتا ہے کہ کاش میں نے اس وقت کی قدر کی ہوتی تو آج میں بھی کسی مقام پر ہوتا۔

میں پاکستان ملٹری اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ میں سروس کر رہا ہوں۔ اب ریٹائرمنٹ قریب ہے تقریباً سوا سال باقی ہے اور میں آج کل جس علاقے میں ڈیوٹی سرانجام دے رہا ہوں۔ کافی دور دراز شمالی باؤنڈری لائن کے قریب پہاڑوں میں گھرا ہوا ہے (نان فیملی سٹیشن ہے بونجی کے نام سے جانا جاتا ہے غیر معروف سا ہے لیکن جلد ہی معروف ہو جائے گا کیونکہ وہاں ایک ڈیم بنانے کا سرکاری منصوبہ بن چکا ہے۔ چار پہاڑی سلسلے اس علاقے میں آپس میں ملتے ہیں یعنی یہ مرکزی مقام ہے)۔ شمالی علاقہ جات کی وجہ سے فری سرکاری میس میسر ہے جو ہمارے محکمے کو کسی بھی دوسرے سٹیشن پر میسر نہیں۔ ساتھ ہی رہائشی کمرے ہیں جن میں ہم آفیسرز نما کلیریکل سٹاف کے دس پندرہ افراد سکونت پذیر ہیں۔ کھانا کھاتے ہوئے اور اس کے علاوہ بھی تہذیب سے عاری مظاہرے ہوتے ہی رہتے ہیں جن میں سے اکثریت کی یہ عادت یعنی چائے پیتے ہوئے سڑ سڑ کی آوازوں سے پرہیز نہ کرنا شامل ہے۔ آپ قارئین کا کیا خیال ہے۔ کیا یہ عادت ناگوار بدتہذیبی نہیں؟ اگر نہیں تو آپ بھی سڑ سڑ کرتے رہیں کیونکہ زندگی میں ہر شخص سڑ سڑ کرتا ضرور ہے۔

◆◆◆

منزلِ جاناں

ہتا آخر میں کس امید پر اس پیکر فانی کو لباس فاخرہ سے آراستہ کروں
جس کے انتظار میں قبر کے پُر شور ذرات بے چین ہو رہے۔

☆.................................اشرف صبوحی دہلوی

آج سے کوئی پچاس برس ہوئے دہلی میں ایک بزرگ جاڑے گرمی پنکھا ہاتھ میں لئے پھرا کرتے تھے۔ قاضی کے حوض سے سرکی والوں، لال کنوئیں تک بازار میں اور پنڈت کے کوچے، نیاریوں، شاہ گنج اور شاہ تارا کی گلی کے اندر اندر انہیں چکر لگاتے دیکھا۔ یوں سننے کو ہزاروں باتیں سنیں۔ ایک ہی دن میں کسی نے کہا۔ ہم نے قطب کی لاٹھ کے نیچے دیکھا ہے تو کسی نے بیان کیا کہ ہم ابھی روشن چراغ دہلی میں چھوڑ کر آئے ہیں بلکہ اجمیر سے آنے والوں نے اجمیر میں اور کلکتے سے آنے والوں نے کلکتے میں بھی دیکھا مگر ہم نے تو سارے دن دوپہر شام انہی گلیوں اور انہی بازاروں میں پنکھا ہلاتے اور پھرتے دیکھا۔

لوگ انہیں مجذوب کہتے تھے ہوں گے۔ اللہ ہی جانے مگر ہم نے تو کبھی ان کی ایسی حالت نہیں دیکھی جیسی عام طور پر مجذوبوں کی ہوتی ہے۔ ہمیشہ کپڑے پہنے ہوئے، لٹھے کا انگرکھا، بغیر کرتے کے جس میں سے چھاتی کے بال نظر آتے۔ ایک برکا پاجامہ، اُجلا بے داغ۔ پاؤں میں گول پنجے کی جوتی البتہ سر سے ننگے، ٹوپی پہنے کبھی نہیں دیکھا۔ ہمارا لڑکپن تھا اور ان کا بڑھاپا۔ اس وقت وہ کم از کم ستر برس کے پیٹے میں ہوں گے، ہاڑ کے معمولی تھے۔ دُبلے پتلے، بال کھچڑی، چاول زیادہ اور دال کم۔ رنگ گندمی تھا، کسی قدر میلا۔ صورت نورانی، چھوٹی سی ڈاڑھی، لبیں کتری ہوئیں۔ چہرے کی متانت نہ بڑبڑانا نہ کسی سے کچھ بات کرنا۔ کوئی سلام کرتا تو پنکھا ہلا دیتے اور گزر جاتے۔ نہ لڑکوں کا غول ان کے پیچھے رہتا اور نہ کوئی ان سے بات چیت کرتا۔

دیوانے کو دیوانہ بنا دینے کے بھی اسباب ہوا کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ مجذوب پرست انہیں بھی چھیڑ

چھیڑ کر پاگل بنا دیتے اور یہ بھی پتھر مارتے اور گالیاں بکنے لگتے لیکن چونکہ ان کے بھتیجے محمد نذیر تھانیدار تھے، اپنے وقت کے مشہور تھانیدار اور اسی علاقے میں قاضی کے حوض کے تھانے پر ان کی تعیناتی تھی، اس لئے کس کی ماں نے دھونسا کھایا تھا جو انہیں ستاتا یا ان کے ساتھ گستاخی سے پیش آتا۔

ہم نے محمد نذیر تھانے دار کو بھی دیکھا ہے اگرچہ ہمارے ہوش میں انہوں نے پنشن لے لی تھی لیکن رُعب داب ان کا بدستور تھا۔ سرکی والوں کے بازار میں لال دروازے کے سامنے ایک کوچہ ہے جس کو نور اللہ بیگ کا کوچہ کہتے ہیں۔ اس کوچہ میں ان کا مکان تھا۔ شام کے وقت جاڑے گرمی کوچہ کے آگے پٹری پر کئی مونڈھے بچھ جاتے۔ ایک مونڈھے پر تھانے دار صاحب بیٹھے ہوئے دکھائی دیتے اور دوسرے پر مرزا وزیر بیگ بڑے ہاڑ کے آدمی تھے۔ شیر کا سا چوڑا چکلا چہرہ، مہندی سے رنگی ہوئی گول ڈاڑھی کے ساتھ آواز ایسی جیسے بادل گرجا۔ محمد نذیر بھی مہندی لگاتے تھے مگر مرزا کے مقابلے میں اُن کا جثہ بہت حقیر تھا اس لئے یاروں نے اُن پر پھبتی اڑائی تھی کہ لال مرغوں میں ایک اصیل ایک ٹینی۔ بہرحال ان دونوں کا گٹھ جوڑ تھا۔ جب تک یہ دونوں زندہ رہے کوچے کے آگے کی بیٹھک نہیں چھوٹی اور کبھی دونوں میں سے ایک کو اکیلا نہیں دیکھا۔ تھانے دار صاحب کے چچا جس وقت اپنے گشت میں اُدھر سے گزرتے تو دو چار منٹ کے لئے ایک مونڈھے پر ہو بیٹھتے اور خاموش بیٹھے رہتے۔ اتنی دیر تک یہ دونوں بھی کوئی بات نہ کرتے۔ نیچی نگاہیں کئے مؤدب انہیں دیکھا کرتے۔

محلے اور بازار کے شیر جب ان کے آگے گردنیں جھکا لیتے تو لومڑیاں کیا ان کے گرد ہوتیں۔ دوسرے ان کی نہ صورت ایسی تھی کہ لوگ ہنستے، نہ کوئی حرکت ایسی کہ لڑکے بالے چھیڑیں۔ اب رہے درویشوں کے پرستار یا مجذوبوں کے متوالے وہ اکیلے دُکیلے ضرور ان سے عرض معروض کرتے ہوں گے۔ ہم نے اس کے متعلق کچھ سنا نہیں۔ درحقیقت درویشوں کی شہرت ان کی شوریدہ مزاجی ہی سے ہوتی ہے۔ یہ خاموش تھے اس لئے علانیہ نہ ان کا پہنچے ہوئے فقیروں میں شمار تھا نہ مجذوبوں میں۔

ہم نے ان کا نام معلوم کرنا چاہا، افسوس جس سے پوچھا اس نے لاعلمی ظاہر کی اور یہی کہا کہ محمد نذیر تھانے دار کے چچا ہیں۔ پھر ہم نے بعض اپنے بڑوں سے پوچھا کہ ان کی یہ کیفیت کب سے ہے؟ اس کا جواب نفی میں ملا۔ یہی کہ ہم نے جب سے دیکھا اسی حالت میں دیکھا۔ لڑکپن کی ایک خصلت یہ بھی ہے کہ جس بات کا پتہ نہیں لگتا اس کی کرید ہو جاتی ہے۔ ایک دن میں اپنے مکان کی ڈیوڑھی پر نانا کے ساتھ کھڑا تھا کہ سامنے سے حضرت پنکھا ہلاتے گزرے، میں نے نانا سے بھی ان کے متعلق سوالات شروع کر دیئے۔ اتنے میں کریم اللہ خاں آ گئے۔ یہ شیدی گوہر کے پوتے تھے، محلے میں سب سے بڑی عمر کے آدمی۔ ہمارے مکان کے سامنے ان کا گھر تھا۔ پوچھنے لگے ”کیوں بھئی نانا سے کیا باتیں ہو رہی ہیں؟“

نانا نے کہا: ”محمد نذیر کے چچا کو پوچھتا ہے کہ کب یہ دیوانے ہوئے۔“ کہنے لگے آؤ بیٹا ہم بتائیں۔ ہم نے ان کا بچپن بھی دیکھا ہے بلکہ مسجد میں ہم دونوں کئی مہینے تک ساتھ پڑھے ہیں۔ یہ بڑے شریر تھے۔ ملا جی ان کی خوب ٹھکائی کیا کرتے تھے مگر ذہن ایسا اچھا تھا کہ چھ مہینے میں قرآن حفظ کر لیا“۔

اس دن معلوم ہوا کہ واقعی حافظ ہیں، لوگ یونہی نہیں کہتے۔ میں نے پوچھا کہ اچھا پھر ان کا دل کس طرح اُلٹا؟

انہوں نے بتایا کہ یہ سامنے جو سیّد کا تھان ہے۔ جمعرات کی جمعرات اب تو اتنے نہیں پہلے بہت چڑھاوا

چڑھا کرتا تھا۔ بیسیوں چراغ جلتے۔ کبھی کبھی کوئی قوال یا سناجاتی آبیٹھتا۔

یہاں میں چاہتا ہوں کہ سید کے تھان کی جگہ بھی آپ کو بتا دوں۔ جہاں اب پیر جی عبدالصمد مرحوم کا مکان ہے یہاں کچھ کچے مکان اور کچھ کچے کھنڈر تھے، اسی الٹگ میں شاہ گنج کی طرف چلو تو کچے ڈھابوں کے برابر سفید گھوڑنے والے میر صاحب کا اصطبل تھا۔ اصطبل کے آگے میدان، لڑکے کبڈی، گلی ڈنڈا، گیند چڈی اور گیڑیاں کھیلا کرتے تھے۔ میدان کے خاتمے پر کسی پرانی عمارت کی ایک محراب سی باقی تھی اور اس میں ایک طاق بنا ہوا تھا۔ اسی طاق پر کسی سید صاحب کا گزر سمجھنا چاہیے وہیں سہرے لٹکائے جاتے۔ کھیلیں، بتاشے، ریوڑیاں وغیرہ چڑھائی جاتیں۔ گھی کے چراغ جلتے۔ جمعرات کو یہ بہار ہم نے بھی دیکھی ہے۔ جھاڑو ملتی، چھڑکاؤ ہوتا اور شام سے رات گئے تک بیسیوں عورتیں اور مرد چڑھاوا چڑھانے آتے۔ نوچندی جمعرات کو ڈھولک بھی پٹتی۔ کسی کسی کے سر پر کبھی سید صاحب بھی آ جاتے۔ ہمیں ممانعت تھی کہ جمعرات کو اُدھر ہرگز نہ جانا۔ ہم بھی کچھ ڈرے گئے اور اس لئے کہ گھر والوں میں سے کسی نے دیکھ لیا تو خفا ہوں گے۔ اس طرف نہ جاتے۔ دور ہی دور سے تماشا دیکھا اور گانا سنا کرتے۔

اچھا تو کریم اللہ خاں نے سنایا۔ ’’مشہور تھا کہ تھان والے سید کوئی بڑے جلالی ہیں۔ جب بگڑ جاتے ہیں تو بچے بوڑھے عورت مرد کسی کو نہیں دیکھتے۔ کئی قصے بھی کہے جاتے تھے کہ جمعرات کو طاق میں فلاں شخص کو اس صورت میں نظر آئے تو فلاں کو اس روپ میں۔ کیا مقدور ان کے نام کے چڑھاوے کو کوئی ہاتھ تو لگا لے۔ تخولی پہلوان نے منع کرتے کرتے جلیبیوں کا دونا اٹھا لیا تھا۔ ایسا پٹخا دیا کہ خون تھوکتے تھوکتے آخر مر گیا۔ دھنو دھوبی کی ایک نٹی تھی بڑی شھدن خلیفہ کلن نے اس کو ڈال لیا

قابلِ غور

☆......فاصلے کبھی بھی رشتے الگ نہیں کرتے اور نزدیکیاں کبھی بھی رشتے نہیں بناتیں۔ اگر احساس سچے اور پرُخلوص ہوں تو رشتے ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

(فاطمہ۔فورٹ عباس)

☆......غصہ ہمیشہ تنہا آتا ہے لیکن جاتے ہوئے اپنے ساتھ عقل، سمجھ، اخلاق، ذہانت اور شخصیت کی خوبصورتی بھی لے جاتا ہے۔

(نسیم سکینہ صدف۔ڈسکہ)

تھا۔ کسی نے کھیر کا پیالہ چڑھایا۔ اس کی رال ٹپک پڑی۔ ہاتھ ڈالتے ہی لونڈن کبوتر بن گئی۔ غرض یہ ہے کہ ایسی ایسی کہانیاں سنا کر بچوں کو وہاں جانے سے روکتے تھے لیکن بچے کیا مانتے۔ ریوڑیوں اور میٹھی کھیلوں کے لالچ میں آس پاس لگے ہی رہتے۔ کیونکہ بعض لوگ چڑھاوا چڑھانے کے بعد تھوڑی تھوڑی مٹھائی بچا کر بچوں کو بھی بانٹ دیتے۔ مُلاّ جی نے ہم کو منع کر رکھا تھا اور چونکہ مسجد سامنے ہی تھی ان کے ڈر سے کوئی لڑکا نہ جاتا، جاتا بھی تو آنکھ بچا کر۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ملا جی دعوت میں گئے ہوئے تھے۔ نوچندی جمعرات تھی، ہم کو موقع ملا جا پہنچے، یہ حافظ جی بھی آ گئے۔ ایک عورت نے برفیوں کا دونا چڑھایا۔ حافظ جی کے منہ میں پانی بھر آیا۔ کہنے لگے۔ یار اس پر ہاتھ مارنا چاہیے۔ میں نے کہا۔ اگر تم نے یہ دونا اُچک لیا تو صبح کو اتنی ہی برفیاں اور کھلاؤں گا۔ بولے اچھا ٹھہرو۔ ذرا شام ہو جانے دو۔

چنانچہ ہم پرے ہٹ کر کھڑے ہو گئے اور شام ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ عشاء کی نماز کے بعد بھیڑ چھٹنی شروع ہوئی اور نو بجتے بجتے آنے جانے والوں کا

تانا ٹوٹ گیا۔ ان دنوں آج کل جیسا حال تو تھا نہیں کہ آدمی آدمی رات تک گلی کوچے چلتے رہیں۔ عشاء کی نماز کے بعد گلی میں کون چلتا پھرتا۔ تھان کے چراغ بھی ٹمٹمانے شروع ہو گئے۔ حافظ جی اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے آگے بڑھے اور جاتے ہی طاق پر جھپٹا مارا۔ برفیوں کے دونے پر ہاتھ پڑنا تھا کہ طاق کے اندر سے ایک پنجہ نکلتا ہوا دکھائی دیا۔ حافظ جی "شیر شیر" کہتے ہوئے طاق کی حد کے باہر آ کر گر پڑے اور ہم بھاگ کر اپنے گھروں میں گھس گئے۔ رات بھر مجھے بخار چڑھا رہا، حافظ جی پر کیا گزری، کچھ خبر نہیں۔

صبح کو جب میرا بخار اترا اور مجھے ہوش آیا تو گھر میں چرچا سنا کہ حافظ جی کا بُرا حال ہے۔ لینے کے دینے پڑے ہوئے ہیں۔ لڑکے مانتے ہی نہیں، لاکھ دفعہ منع کیا کہ سیّد صاحب کے تھان پر بچوں کا کام نہیں۔ اب مزہ آیا اور جائیں۔ معلوم ہوا کہ جب مولا بخش بڑھئی صبح کی نماز پڑھنے جا رہا تھا تو اس نے حافظ جی کو بے ہوش پڑے ہوئے دیکھا۔ بڑی مشکل سے اٹھا کر مسجد میں لے گیا۔ نماز کے بعد ملا جی نے بہتیرا پڑھ پڑھ کر پھونکا مگر حافظ جی کو ہوش نہ آیا۔ آخر ان کے گھر والوں کو خبر کی۔ بیچارے رات بھر پہلے ہی پریشان رہے تھے۔ سنتے ہی بے اوسان ہو کر بھاگتے ہوئے آئے اور ڈولی ڈنڈا کر کے اٹھا لے گئے۔

اس زمانے میں کبھی کبھی گھڑ چڑھے فقیر آیا کرتے تھے، اس اثنا میں وہ بھی آ گئے۔ گھڑ چڑھے فقیروں کی صدا جو حافظ جی کے گھر والوں کو پہنچی تو حافظ جی کو پکڑ کر ان کے سامنے لائے۔ انہوں نے دیکھتے ہی کہا۔ "مائی! یہ تو میراں کی جھپٹ میں آ گیا ہے۔ میراں کلیر والے کے ہاں لے جاؤ نہیں تو پاگل ہو جائے گا"۔

حافظ کے گھر والوں میں کوئی مرد نہیں، دُکھڑا پیٹنے والی عورتیں ہی عورتیں تھیں۔ ماں بیچاری سے جس طرح بنا ممتا کی ماری پیران کلیر لے گئی۔ طبیعت میں ایک نم کی وحشت جو چلی آتی تھی وہ تو جاتی رہی لیکن آدمی کی جون میں نہ آئے۔ پھر ایک مرتبہ سنا کہ مدار کی چھڑیوں والوں کے ساتھ اجمیر شریف کی طرف نکل گئے۔ لوگ ڈھونڈ ڈھونڈ کر بیٹھ رہے۔ عورتوں نے بھی ان کو صبر کر لیا۔ کوئی گیارہ برس کے بعد خود بخود آ گئے لیکن آنا نہ آنا یکساں تھا۔ نہ گھر کے کام کے تھے نہ باہر کے۔ چپ یہاں کھڑے ہیں وہاں بیٹھے ہیں۔ کھانا کھلا دیا کھا لیا، پانی پلا دیا پی لیا ورنہ کچھ نہیں۔ کپڑے میلے ہیں، بلا سے پھٹ گئے تو پھٹ جائیں۔ نہ نہانا نہ دھونا نہ نائی نہ دھوبی۔

اتنے میں محمد نذیر سپاہیوں میں نوکر ہو گئے تھے، ان کے آتے ہی یکا یک حولدار ہو گئے۔ ان کی کرامت سمجھی گئی۔ انہوں نے ان کا خیال رکھنا شروع کیا۔ جمعہ کے جمعہ ان کا خط بنواتے نہلواتے کپڑے پہناتے۔ چنانچہ اس وقت سے ان کی یہی کیفیت ہے دیوانے تو البتہ نہیں ہیں لیکن دن رات پنکھا ہلاتے پھرنے سے کام ہے۔ اللہ ہی جانے کس خیال میں مست رہتے ہیں اور مجذوبوں یا فقیروں میں ان کا کیا درجہ ہے۔ ہم تو بھی ایسی باتوں کے قائل نہیں"۔

کریم اللہ خاں کی زبان سے یہ سن کر کہ ہم تو ان باتوں کے قائل نہیں، مجھ کو بڑا تعجب ہوا اس لئے کہ اس زمانے میں ظاہری حکومت کے ساتھ باطنی حکومت کی بڑی دھوم تھی۔ ہر انوکھا فقیر اور مجذوب خدائی فوجدار سمجھا جاتا تھا۔ علاقے بٹے ہوئے تھے۔ فلاں صاحب دلی دروازے سے جامع مسجد تک کے قطب ہیں تو فلاں بزرگ کی عملداری کشمیری دروازے سے لاہوری دروازے تک ہے۔ حافظ جی کو بھی بعض لوگ اپنے علاقے کا حاکم سمجھے۔

مختصر یہ کہ حافظ جی کے متعلق کوئی خاص کرامت تو منسوب نہ تھی تاہم ان کی قطبیت میں بھی شبہ تھا۔ مجھے ان

سے ایک قسم کی دلچسپی ہو گئی تھی۔ اکثر ان کے ساتھ ساتھ دور تک چلا جاتا۔ شوق تھا کہ کبھی ان کی آواز سنوں۔ مہینوں گزر گئے۔ کبھی کبھی ہونٹ ہلتے ہوئے تو ضرور دیکھتا لیکن آواز سننے میں نہیں آئی۔

ایک روز ٹھیک دوپہر کا وقت تھا اور ٹھیٹھ گرمی کا موسم، خدا معلوم کیوں میں ڈیوڑھی کے باہر آیا۔ گلی بالکل سنسان تھی، دیکھتا کیا ہوں کہ حافظ جی غیر معمولی تیز قدمی کے ساتھ جا رہے ہیں۔ پنکھا بھی زور زور سے ہل رہا ہے۔ تیور بدلے ہوئے۔ آپ ہی آپ کچھ بول بھی رہے تھے۔ میں پیچھے پیچھے ہو لیا کہ سنوں کیا کہتے ہیں۔ چند قدم کے بعد صاف آواز آنے لگی۔ ایسی جیسے کوئی وعظ کہتا ہے۔ ان کے الفاظ تو کیا یاد رہتے یہ بھی ان کی کرامت سمجھو کہ مفہوم آج تک مجھ کو یاد ہے۔ اس وقت تو میں کچھ سمجھا نہیں لیکن آج جب ان کی بڑ کا خیال آتا ہے تو ان کے صاحبِ نسبت ہونے میں شک نہیں رہتا۔ واقعی خاموش اللہ والے تھے۔ ان کی بڑ کا مفہوم میں اپنے لفظوں میں آپ کو سناتا ہوں۔ سمجھ لیجیے اللہ والوں میں ان کا کیا درجہ ہوگا۔

''دُور ہو دُور، او دنیائے دلفریب دُور دُور، تو نے مکار دھوکے باز مجھے کن مصیبتوں میں پھنسا دیا ہے۔ میں مختار نہیں بندۂ مجبور ہوں۔ اپنی خوشی سے ایک لمحہ یہاں قیام نہیں کر سکتا۔ کیا مقدور اپنے ارادے سے سانس تک لے سکوں۔ میں آزاد نہیں پابند ہوں۔ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتا۔ ہر وقت چشم براہ اور ہر لحظہ گوش بر آواز ہوں۔ آقا کے حکم کا انتظار ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کس وقت میری طلبی کا فرمان آ جائے۔ آہ اس فرمان کے بعد اس کے سوا چارۂ کار نہیں کہ جس طرح بیٹھا ہوں اسی طرح اٹھ کھڑا ہوں۔ پھر تو ہی انصاف کر کہ یہ آخری لمحہ میرے لیے کس قدر دشوار ہو جائے گا۔ اگر میں ابھی سے ان کانٹوں کو نہ ہٹا لوں۔ جو خواہشوں نے بچھا رکھے ہیں

مال سے نفع یا نقصان!

☆...... کنویں سے جتنا پانی نکالا جائے اتنا ہی اس میں اضافہ ہوتا جائے گا اور مزید یہ کہ اس کا پانی شیریں اور ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اگر کنویں کا پانی یونہی جمع رہنے دیا جائے تو کنواں برباد ہو جاتا ہے، اس کا پانی پینے کے لائق نہیں رہتا۔ یہی مثال مال کی ہے، جتنا اللہ کی راہ میں خرچ کر دو یہ اتنا ہی بڑھتا ہے اور اگر روک کر یا ذخیرہ کر کے رکھو گے تو خود بھی برباد ہوگا، مالک کو بھی برباد کر دے گا۔ (محمد عبدالغفور۔ شکارپور)

اور ان پتھروں کو دور نہ کروں جن کی موجودگی میں قدم جنبش نہیں کر سکتے۔ لوگ مجھے دیوانہ کہتے ہیں۔ دیوانہ ہی سہی۔ کسی نے میرا نام مجذوب رکھا ہے۔ قربان اگر میاں اپنے اندر مجھے جذب کر لیں۔ دنیا مجھ کو گونگا بہرا اپنے حال سے بے خبر سمجھتی ہے لیکن نہ میں گونگا ہوں نہ بہرا نہ اپنے حال سے بے خبر جو اپنے آقا کی آنکھیں دیکھ چکا ہو، جس نے اپنے مالک کی پکاریں سنی ہوں کون ہے جو اسے بے خبر کہے۔

دُور ہو دُور! مجھے اپنی آرائشوں سے معاف کر، میں ان کو کیا سنواروں جن کا رنگ چند روز میں تبدیل ہو جاتا ہے اور جو سودائے اعتدال میں ذرا کمی ہونے سے موت کا پیام دینے لگتے ہیں۔ آہ! میں اس چہرے کو کیا آئینے میں دیکھوں جس کی نجانے کون سی ادا پیا کو بھاتی ہے جس کی تر و تازگی چند روز کی مہمان ہے اور جو تھوڑے دن میں ڈراؤنی شکل اختیار کرنے والا ہے۔ بتا میرا منہ کیا دیکھتی ہے، بتا آخر میں کس امید پر اس پیکرِ فانی کو لباسِ فاخرہ سے آراستہ کروں جس کے انتظار میں قبر کے پُر شور ذرات بے چین ہو رہے۔ میں تو جیسا ماں کے پیٹ سے نکلا تھا ویسا ہی پھرتا۔ تجھ کو اور تیری ذریات کو دعوت دیتا

کہ آ اور مجھ سے شرما یا مجھ کو شرما لیکن کیا کروں میرے مالک کا حکم نہیں۔

اری چڑیل بچھل پائی! تُو مجھے طعنے دیتی ہے۔ اضطراب کے طعنے آخر میں ان در و دیوار کے اندر کیوں کر چین سے بیٹھوں جن سے عنقریب جبری طور پر با بدست دگرے دست بدست دگرے مجھ کو جدا کیا جائے گا اور میں تیرے اس ساز و سامان سے کس طرح دل خوش کروں جبکہ تھوڑے ہی عرصے میں یہ میرے قبضے سے باہر ہونے والا ہے۔ تیرے میکدے کے متوالوں کی رنگین صحبتیں مجھے بھی غفلت کی ترغیب دے چکی ہیں لیکن میں ان تماشوں سے کیوں آنکھیں بند کر لیتا جو میرے سامنے ہو رہے ہیں۔ میں کس طرح واقعات کو دل سے بھلا دوں۔ جانتا ہوں کہ یہ صحبتیں عنقریب برہم ہو کر رہیں گی اور وہ زمانہ کچھ دور نہیں کہ محبت و یکجائی کا شیرازہ ٹوٹ جائے گا تُو ہنسے گی اور سب روئیں گے۔

غرض میں نے جدھر نظر اٹھائی اور اب بھی جس طرف نظر اٹھاتا ہوں تیری ہر شے میں مکار بیسوا کی دلفریبی پائی اور آج بھی پاتا ہوں لیکن ایک ایسی دل فریبی جس کے اندر زوال کا اضطراب اور فنا کی افسردگی موجیں مارتی دکھائی دیتی ہے اور اس لئے مجھ کو چین نہیں مجھے تو خوشی کی جگہ ملال امن و عیش کی جگہ بے قراری و تکلیف کا سامنا رہتا ہے۔ خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہیں، اندر ہی اندر گھٹ کر دل ہی دل میں حافظ کا یہ شعر پڑھنے لگتا ہوں۔

مرا در منزل جاناں چہ امن و عیش چوں ہر دم
جرس فریاد می دارد کہ بر بندید محمل ہا

اب میں حافظ کو کیا کہوں۔ تجھ کو جس میں فریب کے سوا کچھ نہیں منزلِ جاناں بتاتے ہیں منزل جاناں اگر یہی ہے تو ایسی منزلِ جاناں کو سلام لیکن نہیں منزلِ جاناں کو اس سے زیادہ دغابازی کا گھر ہونا چاہئے۔ عشق دھوں کا امتحان آخر کس طرح ہوتا، کیوں۔ پتہ لگی سن گھبرائی۔ حافظ جیسے خوش مذاق لوگوں نے تجھ کو منزلِ جاناں کہہ دیا تو اکڑ گئی۔ لگی ہم کو بھی اپنا ٹھنی پن دکھانے۔ اپنی آرائش و دلکشی کے لحاظ سے تُو منزلِ جاناں سہی۔ ہم بھی حافظ کی لے میں لے ملا کر کہتے ہیں کہ تُو منزلِ جاناں، منزلِ جاناں لیکن منزلِ جاناں کہنے کے بعد یہ بھی دیکھا کہ حافظ جی نے آنکھیں کس طرح نیچی کر لیں، سر کیسا جھکا لیا۔ انہیں فوراً یاد آ گیا کہ ایک بے قرار راہرو کو اس منزل میں امن و سکون اور راحت و آسودگی سے کیا معنی جہاں ہر لحظہ فریاد جرس بلند ہو رہی ہے کہ اٹھو اسباب سنبھالو، کمر باندھو، سفر کی تیاری کرو، یہ جرس کیا ہے؟ نفس کی آمد و شد جو ہر دم عمر کی کمی اور موت کے قرب کا پتہ دے رہی ہے۔

اے غافلو! دم اژدہ نمط آئے جائے ہے
سوچو کہ نخل عمر کو یہ کھائے جائے ہے

پھر؟ پھر کیا ایک "عابر سبیل اور ایک عامل کن فی الدنیا "غریبا" کو راستے کی روح افزائیوں اور دلکشائیوں سے کیا لطف حاصل ہو سکتا ہے جب تک وہ اپنے اصلی وطن کی سرزمین پر قدم نہ رکھے جہاں پھول مرجھانا نہیں جانتے اور جہاں خزاں کا نام کسی کو معلوم نہیں، نہ رُتیں بدلتی ہیں نہ اندھیرے اُجالے سے واسطہ رہتا ہے۔"

اتنا کہنے کے بعد حافظ جی نے تکیا یک پلٹ کر دیکھا اور پنکھا زور زور سے ہلانے لگے۔ اس وقت ان کے چہرے پر ایک عجیب جلال تھا۔ میں ڈر کر بھاگا اور گھر میں آ کر دم لیا۔ اس کے بعد کوئی ایک ہفتے تک وہ بالکل نظر نہ آئے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ پردہ کر گئے۔ ایک دن خلاف معمول شام کے وقت گھر میں گئے۔ وضو کیا، نماز پڑھنے کھڑے ہوئے، اللہ اکبر کہتے ہی سجدے میں گر پڑے۔ عورتیں دیکھنے کو دوڑیں تو ختم تھے۔ سدا رہے نام اللہ کا۔

❋◆❋

علم و تحقیق

ضعیف اور موضوع روایات اور ان کی حقیقت

کچھ ایسی روایات کا ذکر پیش کیا جا رہا ہے جو احادیث تو نہیں ہیں مگر احادیث کے طور پر مشہور ہو گئی ہیں۔ اصل میں یہ کسی حکیم کا قول، محاورہ، ضرب المثل یا من گھڑت باتیں ہیں۔

☆ .... مجاہد ادیب شیخ

لفظ موضوع کا مطلب ہے بات گھڑنا اور جس حدیث کو موضوع کہا جائے اس کا مطلب ہے کہ یہ بات نبی کریمؐ نے نہیں فرمائی بلکہ کسی نے اپنی طرف سے گھڑ لی اور اسے نبی پاک کی طرف منسوب کر دیا (تدریب الراوی، اسنی المطالب) یہ جانتے ہوئے کہ یہ روایت من گھڑت ہے پھر بھی اسے بیان کرنا حرام اور منع ہے اور اگر کسی وجہ سے بیان کی جائے تو ساتھ اس کا من گھڑت اور موضوع ہونا بھی بیان کیا جائے (تدریب الراوی ص: 247) یعنی صرف حدیث گھڑنا ہی حرام نہیں بلکہ اس کی حیثیت کے بیان کے بغیر اسے نقل اور بیان کرنا بھی حرام ہے۔ سمرۃ بن جندبؓ سے روایت ہے کہ نبی پاکؐ نے فرمایا۔ ''جس نے میری طرف منسوب کر کے کوئی حدیث بیان کی جبکہ وہ جانتا بھی ہے کہ یہ جھوٹ ہے تو وہ بھی جھوٹوں میں سے ایک ہے (مسلم شریف بابت تغلظ الکذب)۔

ابن جوزیؒ کہتے ہیں کہ جو روایت عقل نقل اور اصل کے خلاف ہو وہ موضوع ہے، اصل کے خلاف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ مشہور کتابوں اور مسندوں میں نہ ہو (فتاوی محمدیہ جلد: 1 ص: 74)۔ اپنی طرف سے حدیث گھڑنے والے کو محدثین نے کذاب اور دجال کہتے ہوئے سخت سزا تجویز کی ہے۔ امام ناصرالدین ابن المنیر المالکی اور امام ابو محمد الشافعی کہتے ہیں کہ یہ آدمی کافر ہے (الآثار المرفوعہ ص: 59، موضوعات کبیر ص: 8)۔ امام الجرح والتعدیل امام یحییٰ بن معین اسے واجب القتل قرار دیتے ہیں۔

ضعیف کا مطلب کمزور، ضعیف حدیث کمزور بات۔ ایسی حدیث معتبر نہیں ہوتی۔ امام ابن جوزی فرماتے ہیں کہ موضوع احادیث نقل کرنے والے لوگ مختلف قسم کے ہوئے ہیں۔ ایک قسم ان لوگوں کی ہے کہ جن پر زہد کا غلبہ تھا اور حفظ حدیث سے غافل تھے۔ دوسری قسم ان لوگوں کی ہے کہ جن کی کتب کسی وجہ سے ضائع ہو گئی تھیں اور وہ اپنی یادداشت سے احادیث نقل کرتے اور نقل کرنے میں غلطی کر جاتے۔ تیسری قسم میں وہ لوگ ہیں جو جوانی میں تو بڑے ثقہ اور قابل اعتماد تھے مگر بعد میں بڑھاپے کی وجہ سے عقلوں میں خلل آ گیا اور وہ غلط صحیح کو گڈمڈ کرنے لگے۔ چوتھی قسم ان لوگوں کی تھی

جنہوں نے غلطی سے کوئی موضوع روایت نقل کر دی ان کے بعد حقیقت حال پر مطلع ہونے کے باوجود رجوع نہیں کیا کہ کہیں لوگوں کی نظر میں میرا مقام گر نہ جائے۔ پانچویں قسم ان ملحدین کی ہے کہ جنہوں نے شریعت مطہرہ میں شک اور فساد پیدا کرنے کے لئے روایات گھڑ کے بیان کیں۔ چھٹی قسم ان گمراہ فرقوں کی ہے کہ جنہوں نے اپنے غلط مذہب کو ثابت کرنے کے لئے احادیث گھڑنے کی فیکٹری لگائی۔ ساتویں قسم صوفیوں کی ہے کہ جنہوں نے ترغیب اور فضائل کے باب میں بہت سی احادیث گھڑیں اس خیال سے کہ اس پر اجر و ثواب ملے گا۔ آٹھویں قسم کے لوگوں نے حاکمان وقت کا تقرب حاصل کرنے کے لئے ان کی مرضی کے مطابق احادیث گھڑیں۔ نویں قسم قصہ گو اور واعظین کی ہے۔ بعض لوگ ایسے ہیں کہ استاد سے کوئی بات سنی اور اسے (حدیث گمان کر کے) آگے بطور حدیث بیان کرنا شروع کر دیا۔ ایک گروہ وہ ہے جسے خواب میں آنحضورؐ کی زیارت ہوئی اور آنحضورؐ سے کوئی بات سن کر خواب کے تذکرے کے بغیر بیان کرنا شروع کر دیا جبکہ ممکن ہے کہ بات کو صحیح سمجھا یا یاد ہی نہ رکھا ہو ویسے بھی شریعت میں خواب سے کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا۔

موضوع روایت کی مختلف نشانیاں ہیں جن سے انہیں پہچانا جا سکتا ہے۔ پہلی یہ کہ روایت سنت صحیحہ کے خلاف ہو۔ دوسری یہ کہ حدیث میں مستقبل کے بارے میں تاریخ اور وقت کے تعین کے ساتھ پیشگوئی ہو جیسا کہ اگر محرم میں چاند گرہن ہو تو مہنگائی ہوگی اور قتل و غارت ہو گی۔ اگر صفر میں ہو تو ایسا ایسا ہوگا وغیرہ۔ تیسری یہ کہ حدیث کے الفاظ رکیک یعنی لچر اور عامیانہ ہوں جیسے چاول اگر مرد ہوتا تو بڑا بُردبار ہوتا۔ چوتھی یہ کہ قرآن کی صریح آیات کے خلاف ہو جیسے روایت میں سود خور کی شفاعت کا حکم ہے جو درود پڑھتا ہو جبکہ قرآن مجید اور صحیح احادیث میں سود کی شدید مذمت ممانعت اور حرمت بیان ہوئی ہے۔

مختلف ملکوں اور شہروں کی مدح و ذم کی روایات سب جھوٹ ہیں قوموں کی مذمت کی روایات بھی درست نہیں سبزیوں اور پھلوں کے فضائل کی روایات بھی غلط ہیں۔ مرغ کبوتر اور مرغیوں کے بارے میں بھی روایات اکثر صحیح نہیں کوار پنے کی تعریف میں روایات باطل ہیں۔ بعض مشہور قصے غلط ہیں جیسے نبی کریمؐ کی وفات کے بعد بلالؓ کا شام چلے جانا۔ عمر فاروقؓ کے بیٹے کا زنا کرنا اور ان کا اسے کوڑے مار کر ہلاک کر دینا۔ جابرؓ کے بچوں کا تندور میں گر کر فوت ہو جانا اور نبی کی دعا سے زندہ ہو جانا۔ ایوبؑ کے جسم میں کیڑے پڑ جانا۔ داؤدؑ کا اوریا کی بیوی پر عاشق ہونا اور اسے جنگ میں آگے بھجوا کر مروا کے اس کی بیوی سے شادی کر لینا۔ ہریسے سے آپؐ کی قوتِ جماع میں اضافہ۔ چاند دو ٹکڑے ہو کر آپؐ کے گریبان میں داخل ہو کے آستین سے نکلنا اور بدری صحابی سیدنا ثعلبہ بن اطبؓ کا واقعہ کہ انہیں حضور کی دعا سے بکریوں کی دولت ملی مگر وہ زکوٰۃ سے انکاری ہو گئے تو سورۃ توبہ میں ان کو منافق کہا گیا۔ یہ سب جھوٹے قصے ہیں۔

ایک متواتر، صحیح، مستند حدیث مبارکہ ہے کہ نبی کریمؐ نے فرمایا: "جس نے مجھ پر جھوٹ بولا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم بنا لے" (بخاری، مسلم کتاب العلم، مسند احمد ص: 41، 334)۔ اس حدیث کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کو روایت کرنے والے سو سے زائد صحابہ کرام ہیں جن میں عشرہ مبشرہ بھی شامل ہیں (الآثار المرفوعہ ص: 89)۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ اس روایت کو دو سو صحابہ کرامؓ نے روایت کیا (نووی شرح مسلم ج: 1 صفحہ: 68)۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ احادیث بیان کرنے میں بے حد محتاط تھے۔ سنن دارمی کی ایک روایت کے مطابق عبدالرحمٰن بن ابی

لیلیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے کوفہ کی جامع مسجد میں ایک سو بیس ایسے انصاری صحابہ کرامؓ دیکھے جو کہ حدیث بیان نہیں کرتے تھے اور ان میں سے ہر ایک کی یہی خواہش ہوتی تھی کہ کوئی دوسرا ہی اسے بیان کر دے۔ اسی لئے محدثین نے جھوٹی حدیثیں گھڑنے والوں کے لئے سخت ترین سزائیں تجویز کیں کیونکہ حدیثیں گھڑنے والے دجال اور کذاب کا معاملہ عام جھوٹے کی طرح نہیں بلکہ اس سے بہت بڑھ کر ہے جو کہ جھوٹ گھڑ کے رسالت مآبؐ کے ذمے لگا رہا ہے جو دین کے شارح اور معمار ہیں۔ وہ دجال دین میں بگاڑ پیدا کر کے امت کو صراط مستقیم سے ہٹانا چاہتا ہے اس لئے شدید ترین سزا کا مستحق ہے۔

یہ جھوٹی حدیثیں مختلف گروہوں نے اپنے مختلف مقاصد کے تحت گھڑیں جن میں کم علم واعظین، جاہل صوفی، قصہ گو مقررین اور روافض شامل تھے۔ انہوں نے اپنے فقہی مسلک کی تائید، بادشاہوں اور امراء کی خوشنودی، شہرت و مقبولیت، حصول جاہ اور سیاسی مقاصد کے لئے حدیثیں گھڑیں۔ امام حماد بن سلمہؒ فرماتے ہیں کہ مجھے روافض کے ایک شیخ نے خود کہا تھا کہ جب ہمیں کوئی بات اچھی لگتی تو ہم اسے حدیث بنا دیتے تھے (اللالی المصنوعہ ج:2، ص:248)۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ عراق حدیثیں ڈھالنے کی فیکٹری ہے جہاں سکوں کی طرح احادیث ڈھالی جاتی ہیں مثلاً یہ روایت کہ جب معاویہؓ کو میرے منبر پر دیکھو تو قتل کر دو (اللالی المصنوعہ ج:1 ص:220)۔

واعظوں نے موضوع حدیثوں کے ذریعے مخلوق کو اس قدر خراب کیا ہے کہ کتنے چہرے بھوک کی وجہ سے زرد ہو گئے، کتنے لوگ سفر میں بھٹکے، کتنوں نے ان مباح چیزوں سے اپنے نفس کو محروم کر لیا جو ان کے لئے بالکل جائز تھیں۔ کتنوں نے علم کی روایت محض اس لئے چھوڑ دی کہ اس میں خواہشات نفس کی مخالفت نظر آئی کتنوں نے مصنوعی زہد اختیار کر کے زندگی میں ہی اپنی اولاد کو یتیم بنا دیا اور اپنی بیویوں کے حقوق نظر انداز کر کے ان کو ایسی حالت میں چھوڑ دیا کہ نہ ان کا کوئی شوہر ہے نہ وہ بے شوہر ہیں لہٰذا محدثین نے ان کذاب لوگوں کے لئے جو سزائیں تجویز کی ہیں وہ درست اور برمحل ہیں۔

(الموضوعات: ابن جوزی)

ایک مرتبہ امام احمد بن حنبلؒ، امام یحییٰ بن معین ایک مسجد میں نماز کے لئے گئے تو وہاں ایک واعظ کھڑا ہوا اور انہی دو بزرگوں کی سند سے حدیث بیان کرنا شروع کی کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جس نے کلمہ طیبہ پڑھا تو اللہ تعالیٰ اس کے ہر لفظ سے ایک پرندہ پیدا کرتا ہے جس کی چونچ سونے کی اور پر مرجان کے ہوتے ہیں اور وہ جنت میں اللہ کی تسبیح کرتا ہے اور تسبیح کے ہر دانے کے بدلے کلمہ طیبہ پڑھنے والے کو نیکیاں ملتی ہیں۔ واعظ نے اور بھی بہت کچھ بیان کیا اور یہ دونوں بزرگ ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھنے لگے کہ انہوں نے کب یہ حدیث بیان کی۔ جب واعظ اپنا بیان ختم کر چکا تو انہوں نے اپنا تعارف کرا کے انکار کیا کہ ہم نے تو کبھی یہ حدیث سنی ہی نہیں تو بیان کیوں کریں گے تو وہ واعظ بولا۔ احمقو! کیا دنیا میں تم دونوں کے علاوہ کوئی اور احمد اور یحییٰ نہیں ہے میں نے تو ستر احمدوں اور یحییوں سے روایت لی ہے۔

(موضوعات کبیر ص:13)

محدث امام شعبیؒ ایک مسجد میں نماز پڑھنے گئے تو دیکھا کہ وہاں ایک لمبی داڑھی والا شیخ جس کے چاروں طرف لوگوں کا ہجوم تھا، حدیث بیان کر رہا تھا کہ رسولؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تین صور پیدا کئے ہیں اور ہر صور میں ایک ایک نفخ (پھونک) ہوگا۔ شعبی کہتے ہیں مجھ سے برداشت نہ ہوا اور میں نے اپنی نماز میں تخفیف کر کے اس سے کہا۔ یا شیخ! اللہ سے ڈرو اور غلط حدیث مت بیان کرو، اللہ تعالیٰ نے فقط ایک ہی صور پیدا کیا ہے، جس میں

دو دفعہ پھونکا جائے گا۔ ایک مارنے کے لئے اور دوسرا زندہ کرنے کے لئے تو اس نے جوتا اٹھا کے دے مارا اور سب لوگ مجھے مارنے لگے۔ حتیٰ کہ مجھے اقرار کرنا پڑا کہ اللہ نے تین ہی صور پیدا کیے ہیں۔ (موضوعات کبیر ص:13)۔

اب ہم کچھ ایسی روایات کا ذکر کرتے ہیں جو کہ احادیث تو نہیں ہیں مگر احادیث کے طور پر مشہور ہوگئی ہیں لیکن دراصل وہ کسی حکیم کا قول، محاورہ، ضرب المثل یا من گھڑت باتیں ہیں۔ مثلاً سوید الانبار نامی راوی نے یہ روایت بیان کی۔ ''جس نے عشق کیا اور پاک دامن رہا اور اپنے عشق کو چھپائے رکھا اور اسی حالت میں مر گیا تو شہادت کی موت مرا''۔ جب امام یحییٰ بن معین کو اس کی یہ روایت معلوم ہوگئی تو فرمایا اگر میرے پاس گھوڑا اور نیزہ ہوتا تو میں سوید کے خلاف جہاد کرتا۔ ابو العباس کہتے ہیں کہ میں امام بخاری کے پاس حاضر ہوا اور انہیں ابن کرام کا خط دیا جس میں چند احادیث کے بارے میں سوال کیا گیا تھا اس میں زہری عن سالم عن ابیہ کی سند سے یہ روایت درج تھی کہ ایمان بڑھتا گھٹتا نہیں تو امام بخاری نے خط کی پشت پر لکھا۔ ''جس نے بھی یہ روایت بیان کی وہ سخت سزا اور طویل قید کا مستحق ہے'' (الاباطیل والمناکیر بحوالہ فتنہ وضع حدیث ص:56)۔ سیدنا ابراہیمؑ کے بارے میں قرآن مجید میں ہے وہ یقیناً صدیق نبی تھے۔ صدیق مبالغہ کا صیغہ ہے جس کا معنی ہے وہ شخص کہ سچ بولنا جس کی ذاتی اور طبعی صفت بن چکی ہے لیکن صحیحین کی روایات میں سیدنا خلیل کی طرف تین جھوٹ کی نسبت کی گئی ہے۔ چنانچہ فخر المفسرین امام فخر الدین رازی نے اس قرآنی آیت اور عقیدہ عصمت انبیاء کو سامنے رکھتے ہوئے جرأت مندانہ فیصلہ دیتے ہوئے کہا کہ ان راویوں کو جھوٹا کہہ دینا زیادہ بہتر ہے اس سے کہ جھوٹ کی نسبت انبیاء علیہم السلام کی طرف کی جائے ورنہ تو پوری شریعت سے اعتماد اٹھ جائے گا اور کہنے والا کہہ سکے گا کہ ممکن ہے کہ نبی نے اس خبر میں کسی مصلحت کے تحت جھوٹ بولا ہو (تفسیر کبیر الرازی ص:22، 185)۔ انہی روایات کے بارے میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی فرماتے ہیں کہ اگرچہ یہ روایات صحیحین کی ہیں اور اس لئے یہ مشہور کی حد تک پہنچ گئی ہیں مگر راوی کو ان روایات میں سخت مغالطہ ہوا ہے لہٰذا ہرگز قابل قبول نہیں اس لئے کہ ایک نبی کی طرف جھوٹ کی نسبت کے مقابلے میں راویوں کی غلطی کا اعتراف بدرجہا بہتر اور صحیح طریق کار ہے۔
(قصص القرآن ج:1، ص:203)

مشہور ہے کہ ''آدمؑ جب حج پر گئے اور پیچھے قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا تو اس کی وجہ سے سمندر کھاری ہو گئے اور پھلوں کے ذائقے بدل گئے''۔ یہ ایک من گھڑت روایت ہے۔ مشہور روایت ہے کہ نبی کریمؐ نے سیدنا علیؓ سے فرمایا کہ اے علی روزانہ پانچ کام کر کے سویا کرو (1) چار ہزار دینار صدقہ کر کے (2) جنت کی قیمت ادا کر کے (3) ایک قرآن ختم کر کے (4) دو لڑنے والوں میں صلح کرا کے (5) حج کر کے۔ اس پر سیدنا علیؓ نے عرض کی کہ یہ تو میرے لئے مشکل ہے تو فرمایا۔ چار بار سورۃ فاتحہ پڑھنے سے چار ہزار دینار صدقہ کرنے کا ثواب ملتا ہے۔ تین مرتبہ درود شریف پڑھنے سے جنت کی قیمت ادا ہو جاتی ہے۔ تین مرتبہ سورۃ الاخلاص پڑھنے سے ایک ختم قرآن کا ثواب ملتا ہے۔ یہ روایت سراسر من گھڑت اور بے بنیاد ہے۔

اسی طرح ایک اور بڑی مشہور روایت ہے کہ جو شخص نماز کا اہتمام کرتا ہے حق تعالیٰ شانہٗ اسے پانچ انعام عطا کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس پر سے رزق کی تنگی ہٹا دی جاتی ہے۔ دوسرا یہ کہ اس سے عذاب قبر ہٹا دیا جاتا ہے۔ تیسرا یہ کہ قیامت کے دن اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں ملے گا۔ چوتھا یہ کہ پل صراط سے بجلی کی طرح گزر

جائے گا۔ پانچواں یہ کہ حساب سے محفوظ رہے گا اور جو شخص نماز میں سستی کرتا ہے اس کو پندرہ طریقوں سے عذاب ہوتا: پانچ طرح دنیا میں، چار طرح موت کے وقت، تین طرح قبر میں اور تین طرح قبر سے نکلنے کے بعد۔ یہ روایت بھی مکمل طور پر من گھڑت ہے (میزان الاعتدال ج:2 ص:120)۔ جب قرآن وحدیث میں نماز قائم کرنے کے لئے بے شمار آیات اور صحیح روایات موجود ہیں تو اس کی ترغیب کے لئے ایسی من گھڑت باتوں کی کیا ضرورت۔ تمام قرآنی سورتوں کی فضیلت میں 114۔ احادیث جنہیں مختلف علماء اور مفسرین نقل کرتے رہتے ہیں اور واعظین بیان کرتے ہیں۔ وہ رسول اللہؐ پر جھوٹ اور افتراء ہیں۔ محدثین کرام نے احادیث کو گھڑنے کا ذمہ دار نوح بن ابی مریم کو قرار دیا ہے۔ نوح نے لوگوں کو قرآن کی طرف مائل کرنے کے لئے یہ حدیثیں گھڑیں (اللالی المصنوعہ ج: 1 ص:117)۔ روایت ہے کہ ''حضرت خضرؑ اور الیاسؑ ہر حج کے موقع پر جمع ہوتے ہیں''۔ ابن حجر کہتے ہیں کہ یہ روایت قابل رد ہے۔

نہایت مشہور روایت ہے کہ میری امت کا اختلاف رحمت ہے مگر یہ جتنی مشہور ہے اتنی ہی غلط ہے کیونکہ اس اختلاف کی رحمتیں تو آج ہم اپنی آنکھوں سے ہر طرف دیکھ رہے ہیں کہ نہ کوئی مسجد محفوظ ہے نہ نمازی اور نہ عالم۔

قیامت کے دن ایک منادی پردے کے پیچھے سے آواز دے گا کہ اے اہل محشر اپنی نگاہیں پست کرلو تا کہ فاطمہ بنت محمد گزر جائیں۔ موضوع ہے کیونکہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ دیگر بنات اور ازواج کو بے شک لوگ دیکھتے رہیں کوئی حرج نہیں اس روایت کا ایک راوی عباد بن ولید کذاب ہے۔ یہ روایت کہ عورتوں سے مشورہ کرو مگر عمل اس کے برعکس کرو۔ موضوع ہے کیونکہ آنحضورؐ نے بارہا ازواج سے نہ صرف مشورہ کیا بلکہ عمل بھی کیا۔

کچھ لوگوں نے عوام میں قرآنی تلاوت کا ذوق و شوق پیدا کرنے کے لئے اپنی طرف سے مختلف سورتوں اور آیات کی فضیلت کی حدیثیں گھڑیں اور بہت سے مفسرین نے انہیں بغیر کسی تحقیق کے اپنی تفسیروں میں درج کر دیا اور وہ اسلامی لٹریچر کا حصہ بن گئیں۔ چنانچہ تفسیر بیضاوی، کشاف اور واحدی میں ہر ہر سورت کی جو طویل فضیلت والی حدیث بیان کی گئی ہے وہ موضوع اور من گھڑت ہے (اللالی المصنوعہ ج:1 ص:117)۔ قرآن کے فہم، وتدبر اور تفکر کا حکم خود قرآن میں ہے اس کے ہوتے ہوئے موضوع فضائل کی ضرورت نہیں۔ کم علم زاہدوں اور جاہل صوفیوں نے بغیر کسی تمیز کے سچی جھوٹی روایات کو بیان کیا اور عوام نے ان کے ظاہری جبہ و دستار اور پرہیزگاری کو دیکھتے ہوئے ان پر اعتماد کرتے ہوئے ان کی روایات پر بھی اعتبار کرلیا ان میں سے اکثر نے ثواب کی نیت سے حدیثیں گھڑیں اور بیان کردیں تا کہ لوگوں میں عبادت گزاری پیدا ہو مگر انہوں نے دین کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا (تدریب الراوی ج:1 ص:281)۔ اہل بیت کے فضائل میں لاکھوں احادیث گھڑی گئیں اور صحابہ کے فضائل میں بھی اس کے ردعمل میں احادیث گھڑی گئیں جبکہ حق یہ ہے کہ بے شمار قرآنی آیات و احادیث فضائل صحابہ و اہل بیت میں وارد ہیں ان کے ہوتے ہوئے ان وضعی اور من گھڑت روایات کا سہارا لینے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔

روایت ہے کہ سفید مرغا گھر میں پالا کرو کیونکہ جس گھر میں سفید مرغ ہو تو کوئی شیطان اور جادوگر اس گھر کے قریب نہیں آتا اور آس پاس کے چالیس گھر بھی محفوظ رہتے ہیں۔ یہ روایت جھوٹ ہے اس سلسلے میں درست روایت وہ ہے کہ جس میں ہے کہ جب تم مرغ کی آواز سنو تو اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کا سوال کیا کرو کیونکہ اس

وقت اس نے رحمت کا فرشتہ دیکھا ہوتا ہے۔ مزید سفید مرغ والی تمام روایتیں جھوٹ ہیں۔ یہ روایت کہ نبی کریمؐ نے شلوار پہنی یا خریدی ہے اور پہننے کی نوبت نہیں آئی ان میں سے کوئی بھی بات درست نہیں اور یہ روایت کہ اپنے مُردوں کو نیک لوگوں کے درمیان دفن کیا کرو اس کی بھی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہ روایت کہ جب جمعہ صحیح سالم گزر گیا تو ہفتے کے باقی دن بھی صحیح گزر جائیں گے اور جب ماہ رمضان صحیح گزر گیا تو پورا سال صحیح گزر جائے گا۔ امام ابن جوزی اسے من گھڑت کہتے ہیں۔ یہ روایت کہ جب اپنے آئمہ کے پیچھے نماز پڑھو تو اچھی طرح وضو کیا کرو اگر وضو درست نہ ہو تو امام کی آواز کپکپا جاتی ہے۔ جھوٹ ہے۔ روایت ہے کہ آخر زمانے میں جب خواہشات کی پیروی ہونے لگے تو دیہاتیوں اور عورتوں کا دین لازم پکڑ لینا۔ یہ من گھڑت ہے۔ روایت جب اللہ تعالیٰ کسی قوم سے محبت کرتے ہیں تو اسے کسی امتحان اور مصیبت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ موضوع ہے۔ روایت جب تمہارے پاس کسی قوم کا سردار آئے تو اس کا اکرام کیا کرو۔ حدیث نہیں ممکن ہے کسی بزرگ کا قول ہو۔ روایت قربانی کا جانور تسلی کر کے لیا کرو کیونکہ یہ پل صراط پر تمہاری سواری ہوں گے۔ ابن اصلاح فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ثابت نہیں۔ روایت جب تیرا بیٹا بڑا ہو جائے تو اسے بھائی سمجھو ضعیف ہے ممکن ہے کسی حکیم کا قول ہو۔

روایت ہے کہ چار چیزیں کبھی سیر نہیں ہوتیں۔ زمین بارش سے، مادہ نر سے، آنکھ دیکھنے سے اور عالم علم سے۔ ابن جوزی نے اسے موضوعات میں ذکر کیا ہے۔ ویسے بھی عام مشاہدہ ہے کہ ایک خاص وقت کے بعد مادہ کو نر کی حاجت نہیں رہتی۔ روایت کہ حسین چہروں سے خیر طلب کرو۔ امام ابن جوزی، امام احمد بن حنبل، علامہ ابن تیمیہ اور ابن قیم اسے موضوع قرار دیتے ہیں۔

روایت کہ لوگوں میں سب سے زیادہ جھوٹ بولنے والے رنگ ریز اور سنار ہیں۔ امام ابن جوزی فرماتے ہیں کہ یہ روایت درست نہیں۔ روایت اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کو یوم عاشورہ میں پیدا کیا۔ یہ روایت موضوع ہے۔ روایت کہ اللہ تعالیٰ نے جنت میں میرا نکاح آسیہ و مریم سے کر دیا ہے۔ انتہائی ضعیف ہے۔ روایت کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن لوگوں کو ان کی ماؤں کے نام سے بلائیں گے تاکہ پردہ رہے۔ امام ابن جوزی اسے موضوع قرار دیتے ہیں۔ قیامت والے دن تو سب پردے اٹھ جائیں گے اور بخاری کی ایک روایت اس کے خلاف ہے کہ قیامت کے دن تمہیں تمہارے اور تمہارے آباء کے نام سے پکارا جائے گا البتہ عیسیٰؑ کو ان کی والدہ کے نام سے پکارا جائے گا۔

روایت کہ مرض الموت میں آنحضورؐ نے فرمایا کہ کاغذ قلم لے آؤ میں تمہیں کچھ لکھ کر دوں تاکہ تم گمراہ نہ ہو تو سیدنا عمرؓ نے فرمایا ہمارے لئے کتاب اللہ کافی ہے۔ منکر روایت ہے اور یہ خلاف عقل ہے کہ آنحضورؐ کوئی حکم دیں اور عمرؓ منع کر دیں۔ آخر وہاں دیگر صحابہ بھی تو تھے۔ روایت کہ بازار میں کھانا پینا مکروہ ہے۔ ضعیف ہے کیونکہ صحابہ کرامؓ سے بازار میں اور سفر میں چلتے پھرتے کھانا پینا ثابت ہے۔ روایت کہ اللہ تعالیٰ پندرہ شعبان کو آسمان دنیا پر نزول فرماتے ہیں اور قبیلہ بنو کلب کی بکریوں کے بالوں سے زیادہ لوگوں کی مغفرت فرماتے ہیں۔ امام بخاری فرماتے ہیں کہ یہ روایت ضعیف ہے۔ امام دار قطنی فرماتے ہیں کہ ثابت نہیں۔ امام ابن وحید فرماتے ہیں کہ شب برأت کے بارے میں کوئی روایت بھی صحیح نہیں اس رات کی مخصوص نماز کو بھی کسی صادق راوی نے بیان نہیں کیا۔ اس دن کو عید سمجھنا بے بنیاد ہے۔ روایت کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ فرشتے مُردے منتقل کرنے پر مامور ہیں۔ امام بخاری فرماتے ہیں کہ میں اس روایت

کو نہیں پہنچا تھا۔ روایت کہ بازار میں کھانا کمینگی ہے اس کی سند کمزور ہے اور اس سے مخالف حدیث ابن عمر ہے کہ ہم نبی کریمؐ کے عہد مبارک میں چلتے پھرتے اور کھڑے ہو کر کھالیا کرتے تھے۔ (ترمذی شریف)

روایت کہ صوف کا لباس اور فقراء کے ساتھ بیٹھنا تکبر سے بری ہونے کی علامت ہے اس میں ایک راوی قاسم العری ہے، امام احمد ابن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ یہ جھوٹ بولتا تھا اور حدیثیں گھڑا کرتا تھا۔ روایت بینگن ہر مرض کی دوا ہے۔ اس کی کوئی اصل نہیں۔ روایت کہ خربوزہ کھانے سے پہلے دل کو دھو دیتا ہے اور بیماری کو جڑ سے اکھیڑ دیتا ہے۔ موضوع ہے امام بیہقی فرماتے ہیں کہ خربوزہ کے فضائل میں بہت سی روایات ہیں مگر سب باطل اور جھوٹ۔ عقیق، زمرد اور یاقوت کی انگوٹھی والی روایات درست نہیں۔ روایت کہ تین چیزیں نظر کو تیز کرتی ہیں سبزہ پانی اور خوبصورت چہرہ دیکھنا۔ موضوع ہے۔ روایت دنیا کی محبت ہر خطا کی جڑ ہے یہ حدیث نہیں کسی بزرگ کا قول ہے۔ روایت وطن کی محبت ایمان کا حصہ ہے۔ موضوع ہے۔

روایت ایک دن کا بخار سال کا کفارہ ہے۔ محدث مناوی کہتے ہیں یہ صحیح نہیں۔ روایت رجب اللہ کا مہینہ ہے اور شعبان میرا مہینہ جبکہ رمضان میری امت کا مہینہ ہے۔ امام ابن رجب اسے ضعیف کہتے ہیں۔ ''مومن کا تھوک شفا ہے'' یہ حدیث نہیں۔ مومن کا جھوٹا شفا ہے، یہ بھی حدیث نہیں۔ روایت کہ ابوبکر و عمر جنت میں ادھیڑ عمر جنتیوں کے سردار ہوں گے۔ ''درست نہیں کیونکہ جنت میں سبھی جوان ہو کر جائیں گے۔ عورتوں میں مردوں سے ڈبل شہوت ہوتی ہے۔ منکر روایت ہے۔ میں نے اپنے رب کو ایک بے ریش لڑکے کی صورت دیکھا جس کے کانوں تک بال تھے۔ موضوع روایت ہے۔ انگوٹھی پہن کر نماز پڑھنے کا ثواب ستر گنا زائد ہے

باعمامہ نماز پچیس گنا زیادہ اور باعمامہ جمعہ ستر جمعہ کا ثواب ہوگا۔ ان میں سے کوئی ثابت نہیں۔ مسواک کے ساتھ نماز کا ثواب مسواک کے بغیر نماز سے ستر گنا زیادہ ہے۔ امام یحییٰ بن معین اسے باطل کہتے ہیں۔ روایت لمبی داڑھی کم عقلی کی دلیل ہے۔ یہ روایت تورات کی طرف منسوب ہے۔ میری امت کے علماء بنی اسرائیل کی طرح ہیں۔ اکثر محدثین اور حفاظ نے اسے بے بنیاد اور موضوع قرار دیا ہے۔ روایت علیؓ میرے لئے سر کی مانند ہے۔ منکر ہے۔

گائے کا دودھ پیا کرو کہ وہ علاج اور اس کا گھی کھایا کرو کیونکہ اس میں شفا ہے اور گائے کے گوشت سے بچو کہ وہ بیماری ہے۔ یہ روایت اس لئے درست نہیں کہ اگر گائے کا گوشت بیماری ہوتا تو آپ کبھی بھی حجتہ الوداع کے موقع پر اپنی ازواج کی طرف سے گائے کی قربانی کر کے گوشت ان کے پاس نہ بھیجتے اور نہ ہی اس بیماری کو آپ قربانی جیسی اہم عبادت کے لئے منتخب کرتے۔ مسور کی دال استعمال کیا کرو کیونکہ وہ مبارک ہے۔ یہ روایت موضوع ہے۔ نمک استعمال کیا کرو کیونکہ اس میں ستر بیماریوں سے شفا ہے۔ یہ روایت باطل ہے۔ جس نے میری قبر کے نزدیک مجھ پر درود پڑھا تو میں خود سنتا ہوں اور جس نے دور سے پڑھا وہ مجھ تک پہنچایا جاتا ہے۔ من گھڑت ہے کیونکہ زندگی میں تو اس طرح کا کلام محال ہے ایسی بات تو وفات کے بعد ہی ہو سکتی ہے اس لئے اس کی کوئی اصل نہیں۔

روایت کہ خریداری کرتے وقت اتنا جھگڑو کہ پسینے پسینے ہو جاؤ غلط ہے صرف اتنا حکم ہے کہ دیکھ بھال کے اور بازار چیک کر کے مول تول کرو۔ بوڑھی عورتوں کا دین اختیار کرو۔ بے اصل بات ہے۔ مریض کی عیادت تین دن کے بعد کرو۔ شدید ضعیف ہے۔ غرباء انبیاء کے وارث ہیں۔ یہ باطل ہے۔ ولد الزنا جنت میں نہیں جائے

گا۔ یہ روایت موضوع ہے کیونکہ جرم تو اس کے ماں باپ کا ہے، ان کی سزا اسے کیونکر ملے گی۔ دل اللہ کا گھر ہے، حدیث نہیں بلکہ کسی صوفی کا قول ہے۔ یہ قصہ کہ شیطان نے نبی پاک کی زبان سے بتوں کی تعریف کرادی بالکل جھوٹ ہے کیونکہ انبیاء محفوظ ہوتے ہیں۔ نبی پاکؐ سے سفر و حضر پانچ چیزیں علیحدہ نہیں ہوتی تھیں شیشہ، سرمہ، چھوٹی کنگھی، مسواک، لکڑی کا بڑا کنگھا۔ موضوع روایت ہے۔ جو کام بھی بدھ کو کیا جائے وہ ضرور پورا ہوگا۔ امام سخاوی اسے بے اصل کہتے ہیں۔ جو کسی مغفور کے ساتھ بیٹھ کر کھاتا ہے اس کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔ حافظ ابن حجر اسے جھوٹ کہتے ہیں۔ جو آدمی پیشاب پاخانہ کی جگہ سے روٹی کا ٹکڑا اٹھا کر دھو کے کھالیتا ہے اس کی بخشش ہو جاتی ہے۔ موضوع ہے۔ جس نے عیدالفطر کی صبح کو روزہ رکھا گویا اس نے سارا سال روزہ رکھا۔ یہ باطل روایت ہے۔

جس نے دسویں محرم کا روزہ رکھا اللہ تعالیٰ اس کے لئے ساٹھ سال کی عبادت لکھ دیتے ہیں۔ یہ روایت باطل ہے۔ جس نے یکم رجب بعد از نماز مغرب بیس رکعت نوافل پڑھے تو پل صراط سے بلا حساب گزر جائے گا۔ باطل روایت ہے۔ جو مغرب کے بعد چھ رکعات اس طرح پڑھتا ہے کہ درمیان میں کوئی بری بات نہیں کرتا تو اسے بارہ سال کی عبادت کا ثواب ملتا ہے۔ یہ روایت باطل ہے امام بخاری اسے منکر کہتے ہیں۔ ایک خاص طریقے سے چاشت کی نماز پڑھنے پر ستر نبیوں کے ثواب والی روایت بھی باطل ہے۔ جس نے رمضان کے آخری جمعہ کو ایک نماز کی قضا دی تو ستر سال کی نمازوں کی قضا ہو جائے گی۔ بے اصل ہے۔

عورت کی برکت یہ ہے کہ پہلے لڑکی جنے ابن جوزی نے اسے موضوع قرار دیا ہے۔ آدمی کی سعادت داڑھی کے ہلکا ہونے میں ہے۔ امام ذہبی اسے جھوٹ شمار کرتے ہیں۔ مریض کی آہ و زاری تسبیح اور چیخنا چلانا تکبیر ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ثابت نہیں۔ روایت عالم کے چہرے کی زیارت ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے کی سند درست نہیں۔ دنوں کی نحوست کے بارے میں سب روایات باطل ہیں کہ کوئی دن منحوس نہیں ہوتا۔ جمعہ کا دن نکاح کا دن ہے اور پیغام نکاح کا انبیاء جمعے کو ہی یہ دونوں کام کرتے تھے۔ موضوع ہے۔ روایت کہ درود ریا کاری سے بھی پڑھا جائے تو باطل نہیں ہوتا غلط ہے کیونکہ ریا کاری ہر عمل کو گندا اور باطل کر دیتی ہے جس کا ہدیہ غلط ہے۔ جسے راضی کیا جائے اور وہ راضی نہ ہو تو وہ شیطان ہے۔ یہ حدیث نہیں ہے۔ عاشورہ کے دن آدمؑ کی توبہ قبول ہونا نوحؑ کو نجات ملنا ابراہیمؑ کا آگ سے باہر آنا ایوبؑ کا صحتمند ہونا یونسؑ کا مچھلی کے پیٹ سے باہر آنا یعقوبؑ اور یوسفؑ کی ملاقات ہونا سب کچھ جھوٹ ہے اس کی کچھ اصل نہیں۔

رمضان کے دس دنوں کے اعتکاف کا ثواب دو حج اور دو عمروں کے برابر ہے۔ یہ روایت موضوع ہے۔ جب تک لپائی نہ کی جائے اس وقت تک مردہ قبر کے اندر سے اذان سنتا ہے۔ ابن جوزی کہتے ہیں کہ موضوع ہے۔ جب کوئی بیوی سے مباشرت کرے تو اس کی شرمگاہ کو نہ دیکھے ایسا کرنے سے بینائی چلی جاتی ہے ذہبی اسے موضوع کہتے ہیں۔ سیدنا علیؓ کے چہرے کو دیکھنا عبادت ہے۔ ذہبی اسے موضوع کہتے ہیں۔ آنحضورؐ نے مجلس سماع میں شرکت کی اور وجد میں آ کر اپنی قمیص پھاڑ دی۔ ملا علی قراری کہتے ہیں کہ اس کے گھڑنے والے پر خدا کی لعنت ہے۔

سائل کا حق ہے چاہے گھوڑے پر سوار ہو کر آئے۔ من گھڑت ہے گھوڑے والے کو سوال کی کیا ضرورت وہ تو غیر مستحق ہے۔ منہ پر شکریہ ادا کرنا مذمت ہے۔ یہ حدیث نہیں ہے کیونکہ جو محسن کا شکریہ ادا کرتا ہے اس سے اس کی

مزید حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ روایت کہ ہفتہ کا دن مکر و فریب کا دن ہے کیونکہ اس دن قریش نے مکر و فریب کا ارادہ کیا۔ درست نہیں۔ روایت کہ سوموار کا دن سفر اور تجارت کا دن ہے۔ من گھڑت ہے۔ روایت کہ منگل کا دن خون کا دن ہے کیونکہ اس دن قابیل نے ہابیل کا خون کیا۔ موضوع ہے۔ روایت کہ بدھ کا دن منحوس دن ہے کیونکہ اس دن قوم عاد پر آندھی آئی تھی اور فرعون ہلاک ہوا تھا۔ باطل ہے۔ روایت کہ جمعرات کا دن بادشاہ کے پاس جانے اور ضرورتیں پوری کرنے کا دن ہے کیونکہ اس دن ابراہیم بادشاہ مصر کے پاس گئے تھے اور اس نے آپ کو تحفے میں ہاجرہ دی تھی۔ جھوٹ ہے۔ کچھ فرشتے قبروں کے مردے ادھر اُدھر منتقل کرتے ہیں۔ علامہ سخاوی فرماتے ہیں مجھے یہ حدیث نہیں مل سکی۔ سیدنا سلیمانؑ کی انگوٹھی کا نقش تھا ''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ''۔ موضوع ہے۔ روایت کہ نبی کریمؐ کے بچپن میں تین کنواری لڑکیوں نے آپ کو اٹھایا تو ان کا قدرتی دودھ نکل آیا اور انہوں نے حضور اقدس کو پلایا بالکل بے اصل اور بے سند ہے۔ روایت کہ جب بچہ کو معلم ''بسم اللہ'' پڑھنے کو کہتا ہے اور وہ پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس بچے اس کے والدین اور استاد کے لئے جہنم سے برأت لکھ دیتے ہیں۔ یہ روایت ہروی کی گھڑی ہوئی ہے۔ روایت رسول اللہ کا سایہ نہ تھا۔ درست نہیں کیونکہ سیدہ زینب فرماتی ہیں اچانک دیکھتی ہوں کہ دوپہر کے وقت رسول اللہ کا سایہ مبارک میری طرف آرہا ہے۔

(مسند احمد ج:6 ص:132)

روایت خبردار میرے اہل بیت کی مثال کشتی نوح کی طرح ہے جو اس میں سوار ہو گیا اسے نجات مل گئی اور جو اس میں سوار نہ ہوا تو وہ ڈوب گیا۔ موضوع ہے (لسان المیزان ج: 3 ص: 282، تقریب التہذیب ص: 257)۔ سیدہ عائشہؓ فرماتی ہیں معراج کی رات میں نے رسول اللہ کو مفقود نہیں پایا یہ روایت موضوع ہے... اس لئے کہ معراج کی رات سیدہ عائشہ حضورؐ کے گھر نہیں تھیں کیونکہ معراج کا واقعہ ہجرت سے ایک سال قبل پیش آیا (تفسیر ابن کثیر ج:3 ص:26) جبکہ سیدہ عائشہ کی رخصتی ہجرت کے بعد ہوئی۔ روایت کہ جس نے خلوص کے ساتھ لا الہ الا اللہ پڑھا اور تعظیم کی وجہ سے لمبا کر کے پڑھا تو اس کے چار ہزار گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ موضوع ہے۔ عالم کا سونا عبادت ہے۔ یہ روایت بے اصل ہے۔ روایت کہ گدھے نے خود کو آنحضورؐ کی سواری کے لئے پیش کیا تھا اور حضورؐ سے باتیں کرتا تھا۔ آپ کی وفات کے بعد اس نے خود کو ایک کنویں میں گرا دیا۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں اس روایت کی کوئی اصل نہیں (فتح الباری ج:2 ص:59)۔ سیدنا علیؓ نے ایک دفعہ نبی کریمؐ سے وحشت کی شکایت کی تو آپؐ نے کبوتر کا جوڑا پالنے کا حکم دیا اور اس کے غٹر غوں کرتے وقت ذکر اللہ کا حکم دیا یہ من گھڑت روایت ہے۔

روایت کہ عقیق کی انگوٹھی ڈالا کرو اس سے غربت دور ہوتی ہے۔ امام عقیلی فرماتے ہیں کہ اس سلسلہ میں حضورؐ سے کوئی بات ثابت نہیں۔ اگر بولنا چاندی ہے تو خاموشی سونا ہے۔ یہ حدیث نہیں کیونکہ علم گفتگو کے بغیر نہیں حاصل ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ موٹے عالم کو ناپسند کرتے ہیں۔ حدیث نہیں کیونکہ کسی کا موٹا یا پتلا ہونا تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ روایت کہ جسے کوئی چیز ملے اور وہ اسے واپس کر دے تو گویا اس نے یہ چیز اللہ پر رد کی ہے۔ حدیث نہیں ہے۔

(ماخوذ از افری الکاذب تصنیف الشیخ محمد بن السید درویش الحوت البیرونی تخلیص اسنی المطالب المعروف بہ من گھڑت کہانیاں از عبدالروف مفتی دیانوی)

بچہ کس کا؟

ڈاکٹر محو حیرت تھا کہ اتنی پرانی کتاب اتنا جدید فیصلہ اور ایسا فیصلہ جس میں غلطی کا امکان نہ ہو

☆ .... یعقوب حفیظ

ہسپتال کے میٹرنٹی وارڈ میں دو عورتوں کا کیس ہوا۔ ایک کے ہاں بچہ ہوا اور دوسری کے ہاں بچی۔ نرسنگ سسٹر بچوں کے بازوؤں پر نمبر پلیٹ لگانا بھول گئی۔ اب مسئلہ پیدا ہو گیا کہ بچہ کس کا ہے اور بچی کس کی ہے۔ ڈاکٹر کافی پریشان نظر آنے لگے۔ کچھ نرسنگ سسٹر کو برا بھلا کہنے لگے۔ نرسنگ سسٹر کو بس ڈانٹ پلائی مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔

امریکہ کے اس ہسپتال میں ایک مسلمان بھی اس فن میں سپیشلائزیشن کرنے گیا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے بلایا اور از راہ تفنن پوچھا کہ تم کہتے ہو کہ ہماری کتاب قرآن میں ہر مشکل کا حل موجود ہے، اس مسئلہ کا حل قرآن سے نکالئے۔ مسلمان ڈاکٹر نے اس سے وقت لیا اور بذریعہ ہوائی جہاز مصر پہنچا۔ وہاں علماء سے مشورہ کیا، انہوں نے بتایا کہ اس مشکل کا حل تو پہلے سے موجود ہے۔ اس مسئلہ کا واقعہ حضرت علیؓ کے دور خلافت میں بھی پیش آیا تھا۔ تو فیصلہ یہ ہوا تھا کہ بچوں کی ماؤں کا دودھ نکالا جائے جس ماں کا دودھ زیادہ اور گاڑھا ہوگا اس کا لڑکا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں واضح فرما دیا ہے کہ دو حصے مرد کے اور ایک حصہ عورت کا۔

وہ مسلمان ڈاکٹر واپس پہنچا، اس نے ڈاکٹر کو قرآن کا فیصلہ سنایا۔ ڈاکٹر نے ان عورتوں کا دودھ نکالنے کو کہا۔ واقعی ایک عورت کا دودھ زیادہ تھا اور گاڑھا جبکہ دوسری کا تھوڑا اور پتلا۔ یہ عمل بار بار دہرایا گیا مگر اسی عورت کا دودھ زیادہ نکلتا تھا۔ تو اس کو لڑکا دے دیا گیا اور دوسری کو لڑکی۔

اب ڈاکٹر کو تسلی نہ ہوئی۔ کہتا ہے میں لیبارٹری میں جراثیم ٹسٹ کرواؤں گا تاکہ معلوم ہو سکے کہ قرآن کے اس قانون میں کہاں تک صداقت ہے۔ اس کے بعد ماؤں اور بچوں کا خون بھیجا گیا تو نتیجہ عین اس طرح نکلا جس طرح قرآن نے فیصلہ دیا تھا۔ وہ ماہر ڈاکٹر محو حیرت تھا کہ اتنی پرانی کتاب اتنا جدید فیصلہ اور ایسا فیصلہ جس میں غلطی کا امکان نہ ہو، اس کے ساتھ ساتھ اتنے سادہ الفاظ۔ وہ بہت متاثر ہوا فوراً کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔

یہ چند سال پرانی بات ہے۔ اب وہ ڈاکٹر باعمل مسلمان ہے۔ کہتا ہے دنیا میں سب سے بڑا معجزہ قرآن ہے، تمام علوم کا منبع قرآن ہے۔

کال گرل

پورے علاقے میں خوف و ہراس چھا گیا تھا۔ سفاک قاتلوں نے بڑی بے رحمی سے پورے کنبے کا صفایا کر دیا تھا...... ان میں ایک لاش مشہور کال گرل کی تھی۔

☆ .... 0300-9667909 .... دستگیر شہزاد

شاہ زیب کال گرل سپلائر تھا۔ اپنے تحفظ اور گاہکوں کی حفاظت کے لئے وہ سیل فون پر کال گرل کا سودا کرتا۔ طے شدہ جگہ پر کال گرل لے کر جاتا اور کسٹمر سے پیسے وصول کر کے کال گرل کو اُس کے سپرد کر دیتا۔ اس کالے کاروبار کے لئے اُس نے الگ سے سم کارڈ لے رکھا تھا۔ یہ موبائل نمبر وہ صرف جسم فروشی کے کاروبار کے لئے استعمال کرتا تھا۔ اس کے مقررہ گاہک ہی شاہ زیب کا وہ خاص نمبر جانتے تھے۔ اسی موبائل نمبر پر ایک دوپہر شاہ زیب کو کال آئی کہ میں عادل صاحب کا دوست بول رہا ہوں اور میرا نام عاطف رسول ہے، ہاؤسنگ کالونی سے کاروبار کے سلسلے میں آیا ہوں، سوچا تھوڑا انجوائے کر لوں اسی لئے آپ کو فون کیا ہے۔ آواز سن کر شاہ زیب چونکا۔

''آپ عاطف رسول ہی بول رہے ناں؟''

''آپ کو کوئی شک ہے؟''

''شک کی بات نہیں آواز جانی پہچانی سی لگی''۔ شاہ زیب نے محتاط لہجے میں کہا۔ ''اس آواز کو پہلے بھی کئی بار سن چکا ہوں۔ اگر آپ نے اپنا تعارف نہ کرایا ہوتا تو میں یہی سمجھتا کہ میں اپنے سال کے علی حسن سے بات کر رہا ہوں''۔

دوسری طرف سے عاطف رسول ہنسنے لگا۔ ''کبھی کبھی ایسا وہم ہو جاتا ہے''۔

''خیر خدمت بتائیں عاطف رسول صاحب!'' شاہ زیب نے کاروباری لہجے میں کہا۔

''بتا تو چکا ہوں، باتیں بہت کر لیں اب ریٹ بتایئے''۔

''آپ سے زیادہ پیسے تھوڑی لوں گا''۔ شاہ زیب نے کہا۔ ''جتنا عادل صاحب دیتے ہیں، اُتنا ہی دے دینا''۔

''منظور ہے''۔ عاطف رسول نے اسے ایک عمدہ ہوٹل کا نام بتایا۔ ''میں اسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوں، آ جائیں۔ میں پارکنگ میں انتظار کروں گا''۔ یہ کہہ کر سلسلہ منقطع ہو گیا۔

شاہ زیب آٹو سے ایک کال گرل مدیحہ کو لے کر آدھے گھنٹے میں ہی ہوٹل کی پارکنگ میں پہنچ گیا۔ وہاں جو شخص شاہ زیب کو نظر آیا اُسے دیکھ کر تھوڑی دیر کے لئے اُس کے ہوش اڑ گئے، وہ عاطف رسول نہیں علی حسن تھا۔ شاہ زیب کا سالا۔ علی حسن کی آنکھوں میں حقارت تھی۔

''تم کہتے تھے ناں کسی نے میرے کان بھر دیئے ہیں''۔ علی حسن نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تم عورتوں کی دلالی جیسا غلیظ کام کرنے کی بابت سوچ تک نہیں سکتے۔ آج عاطف رسول کے نام سے میں نے تم سے بات کی اور رنگے ہاتھوں پکڑ لیا''۔ شاہ زیب سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔

''تم دونوں پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہو؟'' مدیحہ نے پوچھا۔

''ہاں!'' شاہ زیب نے مردہ سی آواز میں کہا۔ ''یہ میرے سالے صاحب ہیں اور میں ان کا بہنوئی''۔ پھر اُس نے مدیحہ کو جانے کا اشارہ کر دیا۔

''شرم ہو تو چلو بھر پانی میں ڈوب مرو''۔ مدیحہ چلی گئی تو علی حسن نے شاہ زیب کو دھتکارا۔ ''عزت کا اچھا بھلا کام چھوڑ کر کال گرل کی دلالی کرنے لگے۔ ایک بار کال گرل کے ساتھ پکڑے بھی گئے اور جیل بھی جا چکے ہو۔ سماج کو تمہارے اس دھندے کے بارے میں پتہ چلے گا تو تمہارے ساتھ ہم کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہیں گے۔ برادری میں حقہ پانی بند ہو جائے گا''۔

''دیکھو علی حسن!'' شاہ زیب نے ڈھٹائی سے کہا۔ ''شان سے جینے کے لئے پیسہ چاہئے اور کم وقت میں زیادہ پیسہ ایسے کاروبار سے ہی کمایا جا سکتا ہے''۔

''دھندے کی طرح تمہاری سوچ بھی گندی ہو گئی ہے''۔ علی حسن نے زمین پر تھوک دیا۔ ''لعنت ہے تمہارے دھندے اور سوچ پر''۔

''یہ کاروبار بغیر پونجی کا دھندہ ہے''۔ شاہ زیب نے شرمندہ ہونے کی بجائے کہا۔ ''اور اس میں پیسہ بھی بہت ہے۔ غیرت، شرم، عزت کی پروا چھوڑ دو اور میرے پارٹنر بن جاؤ۔ ہم سالا بہنوئی مل کر پورے شہر کے شوقینوں کو لوٹ لیں گے''۔

''شاہ زیب! تم اپنی سوچ بدلو''۔ علی حسن نے اسے سمجھانا چاہا۔ ''پیسہ کمانے کے دوسرے اور بھی راستے ہیں''۔

> کتے کے منہ میں ڈنڈا دو تو وہ مشتعل ہو جاتا ہے۔ ہمارے ساتھ تو اس سے بھی زیادہ ہو رہا ہے پھر نہ معلوم ہم بولتے کیوں نہیں؟

"میں اس دھندے میں اس قدر رچ چکا ہوں کہ چاہ کر بھی نہیں چھوڑ سکتا"۔ شاہ زیب نے عذرِ لنگ پیش کیا۔

"چونکہ میری بہن تم سے بیاہی ہے اس لئے میں تمہیں یہ ذلالت نہیں کرنے دوں گا"۔ علی حسن نے غصے سے کہا۔ "بُرے کام کا بُرا انجام ہوتا ہے۔ یہ دھندہ چھوڑ دو ورنہ کسی دن تم بہت پچھتاؤ گے"۔ یہ کہہ کر علی حسن غصے سے پاؤں پٹختا وہاں سے چلا گیا۔

23 جون 2013ء کو محلے کی ایک چار سالہ بچی شائلہ نے گھر آ کر بتایا کہ شاہ زیب انکل کے گھر میں کوئی کراہ رہا ہے۔ محلے کے متعدد لوگ فوراً شاہ زیب کے گھر کے پاس پہنچ گئے۔ انہوں نے اندر کی طرف کان لگائے تو حقیقت میں کراہنے کی آواز سنائی دی۔ آواز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ درد سے تڑپتی ہوئی کوئی بچی ہے۔ محلے والوں کے دل میں اندیشے سر اٹھانے لگے۔ کہیں کوئی انہونی تو نہیں ہوگئی۔ اندر سے بچی کے کراہنے کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔ ایک شخص نے لوہے کے گیٹ کو دھکا دیا تو اندر سے بند نہ ہونے کے سبب وہ کھل گیا۔ محلے کے کچھ لوگ اندر پہنچے اور صدر دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر شاہ زیب کو پکارنے لگے۔ جواب نہ ملنے پر ایک شخص نے دروازہ کو دھکیلا تو وہ کھل گیا۔ سامنے والا کمرہ ڈرائنگ روم تھا، وہیں فرش پر شاہ زیب کی تعفن زدہ لاش اوندھی پڑی تھی اور ایک کمرے میں جما ہوا خون ہی خون پھیلا ہوا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی کراہیں اور تیز سنائی دینے لگی تھیں البتہ لاش دیکھ کر بوکھلائے محلے والوں نے اندر جانا مناسب نہیں سمجھا، وہ سب چار دیواری سے باہر آ گئے اور ایک شخص کو پولیس کو خبر دینے کے لئے تھانہ گلبرگ روانہ کر دیا۔

اطلاع پاتے ہی تھانہ انچارج حمزہ خان فورس سمیت موقع پر آ پہنچے۔ حمزہ خان نے شاہ زیب کی لاش کو سرسری طور پر دیکھنے کے بعد اُس جانب رُخ کیا جس طرف سے کراہنے کی آواز آ رہی تھی۔ آواز کی سمت میں جا کر حمزہ خان نے کراہنے والی کو ڈھونڈ لیا۔ وہ ایک بارہ تیرہ سال کی بچی تھی۔ اس کے پیٹ، چھاتی اور گردن پر چاقو یا خنجر کے مہلک زخم تھے۔ وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی اور اس کی حالت نازک تھی۔ حمزہ خان نے فوراً فون کر کے ایمبولینس بلائی اور جانکنی کے عالم میں مبتلا بچی کو پولیس کی حفاظت میں النور ہسپتال بھیج دیا۔

اس کے بعد حمزہ خان نے جائے واردات کا معائنہ کیا، بدبو صرف شاہ زیب کی لاش سے نہیں مکان کے دوسرے حصے سے بھی آ رہی تھی۔ پڑوسیوں کو گواہ کے طور پر ساتھ لے کر حمزہ خان اندر داخل ہوا تو چار لاشیں اور انہیں دیکھنے کو ملیں۔ چونکہ محلے والے ساتھ تھے اس لئے پانچوں لاشوں کی موقع پر ہی شناخت ہوگئی۔ شاہ زیب کی لاش ڈرائنگ روم کے فرش پر پڑی تھی۔ جبکہ اس کی بیوی فاطمہ کی لاش لابی میں فرش پر پڑی ملی۔ شاہ زیب کے دو سالہ بیٹے فراز اور 65 سالہ بوڑھی ساس مبشرہ بیگم کی لاش لابی میں بچھے پلنگ پر پڑی ملی۔ اندرونی کمرے میں ایک لاش اور تھی۔ پڑوسیوں نے اس کی شناخت مدیحہ کے نام سے کی۔ شاہ زیب اور مدیحہ کا کیا رشتہ تھا۔ یہ کوئی نہیں بتا سکتا۔ اتنا ضرور بتایا کہ مدیحہ کا شاہ زیب کے گھر اکثر آنا جانا تھا۔ پانچوں لاشوں پر گہرے زخم تھے اور ان کے گلے کٹے ہوئے تھے۔ چونکہ گرمی کا موسم تھا اور لاشیں سڑاند مارنے لگی تھیں اس سے اندازہ لگایا گیا کہ یہ قتل دو تین دن پہلے ہوئے تھے۔ عورتوں کی لاشوں پر زیور نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور گھر کی الماریاں بھی کھنگالی گئی تھیں۔ اس سے لوٹ مار کے امکان سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔

رحمت پورہ شہر کا اپنی طرح کا یہ لرزہ خیز حادثہ تھا۔ پہلی بار کسی نے پورے کنبے کا صفایا کیا تھا۔ مقتولوں میں

دو سال کے بچے سے پینسٹھ سال کی بوڑھی عورت تک شامل تھے۔ اس لئے حمزہ خان نے حادثہ کی اطلاع اعلیٰ افسران کو دے دی۔ پورے علاقے میں خوف و ہراس پھیل گیا تھا اور لوگوں نے رات کو باہر نکلنا چھوڑ دیا تھا۔

اسی دوران اطلاع پا کر شاہ زیب اور فاطمہ کے گھر والے بھی موقعۂ واردات پر پہنچ گئے۔ ان سے معلوم ہوا کہ علاج کے لئے انور ہسپتال بھیجی گئی بچی کا نام عشاء ہے اور 21 جون کو وہ اپنی دادی بشرہ بیگم کے ساتھ پھوپھی فاطمہ سے ملنے آئی تھی۔ عشاء شاہ زیب کے سالے علی حسن کی بیٹی تھی۔ پولیس کی ٹیم نے موقع سے سراغ اور ثبوت تلاش کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ اس لئے چاروں لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لئے سول ہسپتال بھیج دیا گیا۔ اسی درمیان تھانہ گلبرگ میں قتل کا مقدمہ درج کرلیا گیا اور پولیس کے افسران نے معاملے کی تفتیش کے لئے چار ٹیمیں بنا کر انہیں سرگرم کر دیا۔ پولیس کی تمام امیدیں عشاء پر ہی ٹکی ہوئی تھیں۔ وہ اس اجتماعی قتل کیس کی چشم

> جنگ سے، نفرت سے، دھونس دھاندلی سے کسی کو اپنے جیسا تو بنایا جاسکتا ہے، اپنا نہیں بنایا جاسکتا۔

دید گواہ تھی اس لئے اس کے بیان سے واقعہ کا خلاصہ ہو سکتا تھا۔ 25 اگست کو ہی عشاء کا میجر آپریشن کیا جانا تھا۔

چھان بین سے پولیس کو معلوم ہوا کہ مقتولہ مدیحہ کال گرل تھی اور پچھلے کچھ سالوں سے وہ جسم فروشی میں ملوث تھی۔ مدیحہ کی زندگی کا سیاہ رخ سامنے آیا تو شاہ زیب کا کچا چٹھا بھی اجاگر ہو گیا۔ محلے میں شرافت کا نقاب لگا کر رہنے والا شاہ زیب حقیقت میں شہر کا ایک بڑا کال گرل سپلائر تھا۔ بتانے والوں نے بتایا کہ وہ اپنے گھر میں بھی جسم فروشی کراتا تھا۔ پولیس کی چاروں ٹیمیں چھان بین میں مصروف تھیں کہ خبر آئی کہ عشاء کا آپریشن کامیاب رہا ہے اور اسے ہوش آ گیا ہے اور وہ بیان دینے کی حالت میں ہے۔ اس لئے اس کے بیان کے لئے ایک مجسٹریٹ کو ہسپتال بھیجا گیا۔ جہاں عشاء نے رک رک کر جو بیان دیا وہ حیوانیت کی ایک لرزہ خیز داستان تھی۔

21 جون 2013ء بعد از دوپہر تین بجے عشاء اپنی دادی بشرہ بیگم کے ساتھ پھوپھی فاطمہ کے گھر گھومنے آئی تھی۔ وہ سب بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ شاہ زیب کے موبائل پر کسی کا فون آ گیا۔ شاہ زیب نے اس سے بات کی اور اسے آنے کو کہا۔ پھر مدیحہ کو فون کر کے جلد سے جلد گھر پہنچنے کو کہا۔ تھوڑی دیر میں ہی مدیحہ آ گئی۔ تو شاہ زیب نے عشاء اور بشرہ بیگم کو اندر والے کمرے میں جانے کے لئے کہہ دیا۔ بشرہ بیگم اندر جا کر بیٹی سے باتیں کرنے لگیں اور عشاء نے دوسرے کمرے میں جا کر ٹی وی کھول لیا۔ اس کے باوجود وہ کنکھیوں سے شاہ زیب اور مدیحہ کو دیکھ رہی تھی۔ جو دھیمی آواز میں باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ کچھ دیر بعد چھ نوجوان آئے وہ شاہ زیب کے پاس بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ اس کے بعد مدیحہ ایک نوجوان کے ساتھ کمرے میں چلی گئی۔ دروازہ بھی اندر سے بند ہو گیا۔ باقی پانچوں لوگ شاہ زیب کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔ باتیں کرتے ہوئے وہ لوگ مشتعل ہو گئے۔ گالی گلوچ ہونے لگی جس کے نتیجے میں چار نوجوانوں نے شاہ زیب کو دبوچ لیا اور پانچویں نوجوان نے اس کا گلا کاٹ دیا۔

اپنے پھوپھا شاہ زیب کا قتل ہوتے عشاء نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ مگر وہ چیخ تک نہ سکی۔ خوف کی زیادتی سے جیسے وہ گونگی ہو گئی تھی۔ شاہ زیب کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد پانچوں نوجوان اس کمرے کے دروازے پر پہنچے جس میں مدیحہ ان کے ایک ساتھی کے ساتھ گئی تھی۔ ایک نوجوان نے اپنے ساتھی کو آواز دی تو اس نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ اس دوران باقی کے چار

نوجوانوں نے بھی اپنے اپنے چاقو نکال لئے اور پھر ان پانچوں نے چاقوؤں سے مدیحہ کو گود ڈالا۔ اس سے بھی انہیں سکون نہیں ملا تو ایک نوجوان نے اس کا گلا کاٹ دیا۔ اس کے بعد ان چھ لوگوں نے مبشرہ بیگم۔ فاطمہ اور معصوم فراز کو بھی چاقوؤں سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ پانچ قتل کرنے کے بعد بے رحم قاتلوں کی نظر عشاء پر پڑی

شک وہ مردہ چوہا ہے کہ جب تک یقین کے بو کے نہ کھینچے جائیں اس کے نکل جانے پر بھی زندگی کا کنواں پاک نہیں ہوتا۔

اور وہ موت بن کر عشاء کے سر پر پہنچ گئے اور اسے بھی چاقوؤں سے زخمی کر دیا۔ وہ بے ہوش ہو کر وہیں گر پڑی اور بدمعاشوں نے اسے مردہ سمجھ لیا۔

عشاء یہ نہیں بتا سکی کہ شاہ زیب کے گھر آنے والے نوجوان کون تھے۔ عشاء یہ بھی نہیں بتا سکی کہ شاہ زیب سے ان کی کس بات پر بحث ہوئی تھی اور جھگڑا کیوں ہوا تھا۔ عشاء کے بیان پر چاروں ٹیموں کے سربراہ اصلاح مشورہ کرنے بیٹھے تو نتیجہ نکلا کہ محلے میں کوئی تو ایسا ہوگا جس نے قاتلوں کو شاہ زیب کے گھر میں آتے یا واپس جاتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ ٹیم نے دوسرا کام یہ کیا کہ شاہ زیب اور مدیحہ کے موبائل فون کی کال ڈیٹیل نکلوا کر چھان بین شروع کر دی۔ اس کے ساتھ ہی سرولانس کے ذریعے یہ بھی پتا لگانے کی کوشش کی جانے لگی کہ حادثے کے وقت شاہ زیب و مدیحہ کے ساتھ کس کس کی لوکیشن ساتھ تھی۔

پولیس کی ایک ٹیم نے موقع پر جا کر تفتیش شروع کی کہ واقعے کے وقت کیا کسی نے قاتلوں کو شاہ زیب کے گھر آتے یا واپس جاتے دیکھا تھا۔ محلے میں جو لوگ ملے انہوں نے کسی مشتبہ کو دیکھنے سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اس درمیان پولیس ٹیم کی نظر شاہ زیب کے مکان سے چار پانچ مکان دور ایک گھر پر لگے سی سی ٹی وی کیمرے پر پڑ گئی۔ پولیس نے مکان مالک سے درخواست کر کے واقع کے اندازاً وقت کی فوٹیج چیک کی تو مطلوبہ قاتلوں کے چہرے نظر آ گئے۔ پولیس نے وہ فوٹیج اپنے قبضے میں لے لی۔ سی سی ٹی وی فوٹیج اور سرولانس سے ملی معلومات کی بنیاد پر حادثہ کے پتہ چلنے کے محض چوبیس گھنٹے بعد قانون کے ہاتھ گنہگاروں کی گردن تک پہنچ گئے۔ سب سے پہلے گرفتار کیا گیا حسنین عرف بنٹی ولد شاہد علی کو اس کی نشاندہی پر علی گڑھ کے باشندے بتیس سالہ علی رضا، ستائیس سالہ اشفاق احمد، اٹھائیس سالہ اظہر علی، اکیس سالہ عاصم اور انیس سالہ فواد چوہدری بھی گرفتار ہو گئے۔

پینتیس سالہ بنٹی اسلام پورہ میں رہتا تھا اور گلبرگ میں واقع کے سی ریسٹورنٹ چلاتا تھا۔ اس کے ریسٹورنٹ میں ایک ہال تھا اور دو تین کمرے بھی اس نے بنوا رکھے تھے۔ ایک بار شاہ زیب مدیحہ کو لے کر بنٹی کے پاس پہنچا تو ریسٹورنٹ اس کی آنکھوں میں سما گیا۔ جسم فروشی کے دھندے کے لئے وہ بے حد محفوظ جگہ تھی۔ اس نے مدیحہ کو چپکے سے سمجھا دیا کہ بنٹی کو دیوانہ بنالو۔ گاہکوں کی خدمت کے لئے یہ بہترین جگہ ہے۔ مدیحہ مردوں کو دیوانہ بنانے میں استاد تھی۔ اپنی اداؤں، نخروں اور ناز و انداز سے اس نے پہلی ملاقات میں ہی بنٹی کو دیوانہ بنا لیا اور وہ بار بار مدیحہ کو بلانے لگا تو شاہ زیب نے اس سے دوستی کر لی اور پھر چالاکی سے اس کے ریسٹورنٹ کا استعمال کال گرل و گاہکوں کے لئے کرنے لگا۔

چونکہ گھنٹے دو گھنٹے کے بنٹی کو پانچ سو روپے مل جاتے تھے اور مدیحہ کے ریٹ میں بھی ڈسکاؤنٹ ملنے لگا تھا۔ تو بنٹی نے اعتراض نہیں کیا۔ کال گرل و گاہکوں کو خوشی سے کمرہ مہیا کرا دیتا تھا۔

مدیحہ ایک چالاک اور مطلب پرست لڑکی تھی۔ پیسہ اس کا دین ایمان تھا۔ اس نے دیکھا کہ بنٹی پوری

طرح مٹھی میں ہے تو مکان خریدنے کے بہانے اس نے اس سے چار لاکھ ادھار لے لئے اور ایک مہینے بعد لوٹا دینے کا وعدہ کرلیا لیکن روپیہ لوٹانا تو دور اس نے بنٹی سے مزید ایک لاکھ روپے کا مطالبہ کر دیا۔ بنٹی نے کہا۔ پہلے میرے چار لاکھ روپے لوٹا دو، اس کے بعد اور مطالبہ کرنا۔

جب اقتدار کا سورج ڈھلنے لگتا ہے تو سائے سایہ داروں سے لمبے ہو جاتے ہیں

"کیسے روپے؟" مدیحہ فوراً مکر گئی اور بنٹی کو دھمکی دیتے ہوئے کہا۔ "میں نے اپنی اور تمہاری بلیو فلم بنا رکھی ہے۔ دوبارہ روپوں کا تقاضا کیا تو وہ فلم لے کر پولیس کے پاس پہنچ جاؤں گی۔ سوچو اس کے بعد تمہارا کیا حشر ہو گا؟"

عزت کے ڈر سے بنٹی خاموش رہ گیا۔ البتہ اس نے سوچ لیا کہ مدیحہ کو اس کے فریب کا سبق ضرور سکھائے گا۔ بنٹی نے مدیحہ کی دیدہ دلیری پر سنجیدگی سے غور کیا تو یہ نتیجہ نکلا کہ مدیحہ کو شاہ زیب کی شہہ ہے۔ دونوں نے مل کر اسے چار لاکھ کا داؤ لگایا ہے اور دونوں نے آپس میں آدھی آدھی رقم بانٹ لی ہو گی۔ چار لاکھ روپے ڈوبنے سے بنٹی زخمی سانپ کی طرح پھنکار رہا تھا۔ اس غصے میں اس نے مدیحہ سمیت شاہ زیب کے پورے کنبے کا صفایا کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

اجتماعی قتل کرنا اکیلے بنٹی کے بس کی بات نہیں تھی اس لئے اُس نے اپنے ریسٹورنٹ کے تین ملازمین علی رضا، اشفاق احمد، اظہر علی سمیت دو دوستوں کو پچاس پچاس ہزار روپے کا لالچ دے کر منصوبے میں شامل کر لیا۔ انہیں یہ بھی کہا گیا کہ قتل کے بعد گھر کی لوٹ پاٹ میں بھی جو مال ملے گا وہ ان کا ہو گا۔ لالچ میں آ کر پانچوں اجتماعی قتل میں بنٹی کا ساتھ دینے کو راضی ہو گئے۔

منصوبے کے تحت 21 جون کو بنٹی نے شاہ زیب کو فون کر کے بتایا کہ باہر سے اس کے تین دوست آئے ہیں ان کی خدمت کے لئے اس نے مدیحہ کا مطالبہ کیا۔ یہ بھی بتایا کہ ایک پروگرام کے تحت اس کا ریسٹورنٹ تو بک ہے اس لئے شاہ زیب کو ہی گھر میں اپنا کمرہ مہیا کرانا ہو گا۔

شاہ زیب نے اس سے 15 ہزار روپے کا مطالبہ کیا جو مول تول کے بعد سوا بارہ ہزار روپے میں طے ہو گیا۔ بنٹی نے اپنے پانچوں ساتھیوں کو بلایا۔ وہ سب چاقو، ریوالوروں سے لیس ہو کر شاہ زیب کے گھر پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر بنٹی تو اپنے چاروں ساتھیوں کے ساتھ شاہ زیب کے پاس بیٹھا رہا اور اظہر علی مدیحہ کو لے کر کمرے

کوئی عام سا آدمی بھی ایسی بات کر جاتا ہے جس سے صدیوں کی رکی ہوئی دانش خشک پتھریلی زمین میں چشمے کی طرح جاری ہو جاتی ہے۔

میں چلا گیا۔ شاہ زیب نے بنٹی سے سودے کے بارہ ہزار روپے مانگے تو بنٹی نے ٹھینگا دکھا دیا۔ اس بارے میں دونوں میں بحث ہونے لگی۔ تکرار بڑھی تو عاصم، فواد چوہدری، اشفاق احمد اور علی رضا نے شاہ زیب کو دبوچ لیا۔ بنٹی نے چاقو سے اس کا گلا کاٹ ڈالا اور اس کے بعد اجتماعی قتل شروع کر دیے۔ عشاء کو مردہ جان کر چھوڑ گئے تھے مگر وہ بچ گئی تھی۔

اجتماعی قتل کے بعد اشفاق احمد اور علی رضا نے گھر کی تلاشی لی اور جو ملا اپنے قبضے میں کر لیا۔ ملزموں کی نشاندہی پر پولیس نے سونے کا ایک کڑا، کان کی دو بالیاں، دو چوڑیاں، ایک بریسلیٹ اور دو جوڑی پازیب برآمد کی۔ اس کے ساتھ ہی قتل میں استعمال ہونے والا چاقو، ریوالور اور کچھ زندہ گولیاں بھی برآمد کر لیں۔ تا دم تحریر تمام ملزمان جیل میں ہیں۔

محترم ستار عباسی صاحب ایک ریٹائرڈ ڈی ایس پی ہیں اور عمر کے
آخری حصے میں ہیں۔ وہ لکھ نہیں سکتے، انہوں نے اپنی یہ ہڈ بیتی بیان کردی ہے جسے
محترم محمد رضوان قیوم صاحب لکھ رہے ہیں۔ یہ ایک دھیمے مزاج کی مگر دلچسپ کہانی ہے۔

قسط: 1 .... محمد رضوان قیوم

یہ 1946ء کی بات ہے، تقسیم برصغیر سے قبل ہمارا خاندان کانپور شہر کے ہندو اکثریتی محلہ منشی گھاٹ میں رہائش پذیر تھا۔ ہمارے گھر کے دائیں جانب لالہ کیدار ناتھ کی حویلی تھی۔ لالہ جی میرے ابا کے گہرے دوست تھے اور وہ روزانہ شام کو لازماً ہمارے گھر آتے اور رات گئے لوٹتے تھے۔ وہ مجھے ستار عباسی کی بجائے باسو کہتے تھے۔ عام ہندوؤں کی طرح تنگ دل اور متعصب نہیں تھے۔ وہ مجھے ہمیشہ پڑھائی میں دل لگانے کو کہتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اپنے بڑے بھائی ماجد کے مقابلہ میں پڑھائی میں نا صرف تیز تھا بلکہ مجھے اپنی زندگی میں کچھ کرنے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ وہ مجھے کہا کرتے تھے۔

''باسو بیٹے! اگر تم نے اچھے نمبر سے میٹرک کرلیا تو میرا تم سے وعدہ ہے کہ میں تمہیں اچھی سرکاری نوکری دلواؤں گا''۔

''تاؤ جی! آپ اپنی بات پر قائم رہنا''۔ میں نے بھی انہیں مزاقاً کہا۔ ''میں ان شاء اللہ شب و روز اپنی پوری محنت کرکے آپ کو اچھے نمبروں سے میٹرک کرکے دکھاؤں گا''۔

''ہاں ہاں، باسے! میرا تم سے پکا وعدہ ہے کہ میں تمہیں سرکاری نوکری دلوادوں گا''۔

اُس زمانہ میں 99% سرکاری نوکریوں میں ہندو، سکھوں کا راج تھا۔ مسلمانوں کا کوئی پُرسان حال نہ تھا۔ وہ نا صرف تعلیم میں ہندوؤں، سکھوں سے پیچھے تھے بلکہ اپنی جہالت اور مختلف شعبوں میں نظرانداز کی وجہ سے تیسرے درجے کے کمتر پیشوں سے منسلک تھے۔ چند مسلمان ہی آٹے میں نمک کے برابر درمیانی سطح کے کاروباری یا سرکاری ملازمت کے حوالہ سے کامیاب تھے۔

لالہ جی کے دو بیٹے اور ایک بیٹی نوتن تھی۔ کلدیپ میرا ہم عمر جبکہ مانا تقریباً ہم سے دو سال چھوٹا اور نوتن مانا سے ایک سال چھوٹی تھی۔

کلدیپ میرے ساتھ میٹرک کررہا تھا جبکہ مانا نہم میں فیل ہو چکا تھا۔ اُسے لالہ جی نے سکول سے اٹھوانے کے بعد کانپور شہر کی ایک بڑی مہنگی مارکیٹ میں قیمتی برتنوں کی دُکان کھلوادی تھی جبکہ نوتن آٹھویں کلاس میں پڑھ رہی تھی۔ کلدیپ اور میں اپنی اپنی جگہ سر دھڑ کی محنت کے ساتھ تیاری کررہے تھے۔ میرا میتھ کمزور تھا میں اس کی تیاری کے لئے کلدیپ کے پاس چلا جایا کرتا تھا۔ اس نے مجھے بڑی فراخ دلی اور محنت سے میتھ سکھلانا شروع کردیا تھا۔ اس کا طریقہ پڑھائی یہ تھا کہ وہ دو چار گھنٹے مسلسل پڑھائی کرنے کے بعد ایک گھنٹہ کے لئے اپنی کتابیں، کاپیاں بند کرکے ریسٹ کیا کرتا تھا۔ اس دوران وہ مجھ سے ہر موضوع پر کھلے ڈھلے دوستانہ ماحول میں گفتگو کیا کرتا تھا۔ ایک دن گفتگو کی روانی میں اس نے اپنے دل کا یہ راز بتلادیا کہ وہ اس شہر سے 30 میل دور ایک گاؤں ''لاسا'' سے تعلق رکھنے والی ایک غریب لڑکی دیپا سے محبت کرتا ہے اور وہ بھی اس پر جان چھڑکتی ہے۔ دیپا کا باپ کریانے کی دُکان کرتا ہے اور وہ غریب لوگ ہیں۔

''پتا اور ماتا جی کے سامنے اپنے دل کی بات کہنے کی میری ہمت نہیں ہے''۔ اس نے پریشان لہجے میں کہا۔ ''دوسرے پتا جی کبھی بھی اس غریب کریانہ والے کی بیٹی سے سگائی پر راضی نہ ہوں گے۔ یار! میں بہت پریشان ہوں''۔

''عشق محبت کے لئے بڑی عمر پڑی ہے یار!'' میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''فی الحال پڑھائی پر توجہ دو۔ میٹرک کا امتحان کسی پہاڑ کی طرح نظر آرہا ہے''۔

''نہیں یار میرے اعصاب اور سوچوں پر دیپا سوار

ہے"۔ اس نے کہا۔ "پڑھائی میں دھیان نہیں لگتا"۔

کلدیپ کی ماں ہم دونوں کو پڑھائی کے دوران پانچوں مغز اور باداموں سے بنی کھیر کا پیالہ دیا کرتی تھی۔

میں کلدیپ سے میتھ سیکھ کر اپنے گھر میں آ کر اس کی مشق کیا کرتا تھا۔ میتھ میں میرا دماغ چلنے لگا تھا۔ میں نے اور کلدیپ نے میٹرک کے امتحان دے دیئے اور جب نتیجہ آیا تو خلاف توقع میری میٹرک میں ہائی سیکنڈ ڈویژن آئی جبکہ کلدیپ دو مضامین میتھ اور انگلش لازمی میں کمپارٹ آنے کی وجہ سے فیل ہو گیا۔ لالہ کیدار ناتھ نے میٹرک بورڈ میں کلدیپ کے پیپرز کی ری چیکنگ کے لئے درخواست دی۔ متعلقہ میٹرک بورڈ میں جب اُس کے پرچے نکلوا کر ری چیک کروائے گئے تو واقعی کلدیپ نے بڑی بے دلی سے پرچے دیئے تھے اور اس کے مارکنگ نمبر صحیح تھے۔

لالہ جی اور اس کی پتنی ارادھنا ہمارے گھر آئے، انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ بیٹا تم ہی بتلاؤ کلدیپ کے فیل ہونے کی اصل وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ وہ تو تم سے میتھ اور انگلش میں بہت قابل تھا۔

"یہ بات آپ ستار سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟" ابا نے انہیں کہا۔ "کلدیپ سے کیوں نہیں پوچھتے؟"

"وہ کچھ بولتا ہی نہیں"۔ اس کی ماں نے کہا۔ "نہ جانے کلدیپ کو چپ سی کیوں لگ گئی ہے؟ وہ نہ صحیح طریقہ سے کسی سے بولتا ہے اور نہ ہی وقت پر کھانا کھاتا ہے۔ لگتا ہے اُس پر کوئی اوپری اثر ہو گیا ہے۔ وہ گم صم ہو گیا ہے"۔

"ارے یہ تمہارا وہم ہے"۔ ابا نے کہا۔ "کوئی سایہ وغیرہ نہیں ہوتا۔ مجھے لگتا ہے کلدیپ کے دماغ پر کچھ اور ہی بھوت سوار ہو گیا ہے"۔

"کیسا بھوت؟" لالہ جی نے تجسس کے عالم میں ابا سے پوچھا۔

"وہی بھوت جو تجھ پر جوانی کے دنوں میں سوار ہوا تھا"۔ ابا نے اسے مزاحیہ انداز میں کہا۔ "اور تو نے جوانی کی پہلی سیڑھی چڑھتے ہی بھاوج کے عشق میں پڑ کر اس سے زبردستی شادی کی تھی۔ مجھے تو کم از کم یہی معاملہ لگ رہا ہے"۔

"نہیں نہیں، میرا کلدیپ ایسا نہیں ہو سکتا"۔ کلدیپ کی ماں نے تڑپ کر کہا۔ "عظیم بھائی! آپ کو کچھ تو خیال کرنا چاہئے، ایک تو ہم لوگ پریشان ہیں اور دوسرے آپ ہم لوگوں کا اس قسم کی بے ڈھنگی بے موقع بات کر کے مذاق اڑا رہے ہیں"۔

"ارے بھاوجیہ! میں تمہارا مذاق نہیں اُڑا رہا، مجھے تو کلدیپ کی حالت دیکھتے ہوئے یہی محسوس ہو رہا ہے"۔ ابا نے کہا اور میری جانب غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تو امتحان کی تیاری کے سلسلہ میں کلدیپ کے پاس جایا کرتا تھا، تو ہی اس کے بارے میں بتلا"۔

میں نے ایک لمحے کے لئے اس بارے میں سوچا کہ مجھے کلدیپ کے ماتا پتا کو اس کے فیل ہونے کی اصل حقیقت بتلانی چاہئے کہ نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھے اس بات کا بھی بخوبی علم تھا کہ تاؤ لالہ کیدار ناتھ اور اس کی پتنی اس وقت انتہائی کرب کا شکار ہیں۔ لہٰذا میں نے ان کو اس ذہنی کوفت سے نکالنے کے لئے کلدیپ کی دماغی حالت کی اصل حقیقت بتلانے کا فیصلہ کر لیا۔

میں نے اپنی ہمت کو یکجا کیا اور بڑے حوصلہ سے سب بڑوں کے سامنے اپنی زبان کھولتے ہوئے کلدیپ اور اس کی محبوبہ دیپا کے عشق کے بارے میں بتلا دیا۔

"اوہو، دیکھو میں نے کلدیپ کے بارے میں صحیح اندازہ لگایا تھا کہ نہیں"۔ ابا نے اپنے اندازے کی درستی پر فوراً کہا۔ "وہ آج کل لازماً کسی چھوکری کے عشق میں مبتلا ہے"۔

میرے منہ سے کلدیپ کے فیل ہونے کا سبب سن

کرلالہ جی اپنا سر پکڑ کر فرش پر بیٹھ گئے جبکہ ان کی پتنی نے پریشان کن انداز میں اپنی انگلی دانتوں میں لے لی۔

"یار لالہ! تُو پریشان نہ ہو"۔ ابا نے لالہ جی کو تسلی دینے کے لئے کہا۔ "تُو فی الحال گھر جا کر آرام کر۔ اس مسئلہ پر زیادہ نہ سوچ"۔

"میری جان پر بنی ہوئی ہے"۔ لالہ جی نے غصہ کے عالم میں ابا کو کہا۔ "اور تُو مجھے کہتا ہے کہ کلدیپ کے عشق کے بارے میں چِنتا نہ کروں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں گھر جا کر کلدیپ کی بوٹی بوٹی کر کے کتوں کو کھلا دوں"۔

"ارے بے وقوف! تُو ذرا میری بات غور اور شانتی سے سُن"۔ ابا نے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے کہا۔

پھر ابا نے مجھے لالہ جی کے لئے ٹھنڈا پانی لانے کو کہا۔

میں بھاگ کر پانی لے آیا اور غصہ سے بھرے لالہ جی کے ہاتھوں میں ڈرتے ڈرتے پانی دیا۔ مجھے امید تھی کہ وہ اسے نہیں پئیں گے لیکن انہوں نے خلاف توقع گلاس پکڑ لیا۔ ٹھنڈا پانی پینے کے بعد جب ان کے غصہ میں کسی حد تک ٹھنڈ پڑی تو وہ آرام سے کرسی پر بیٹھ گئے۔

"اچھا بتلا اب مجھے اس گھمبیر صورت حال سے کیسے نکلنا چاہیے؟" اس بار انہوں نے ابا سے پوچھا۔

"لالہ جی! تم نے ایک چھوٹے سے مسئلے کو مسئلہ فیثا غورث بنا کر ہوا کھڑا کر رکھا ہے" ابا نے کہا۔ "ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے بشرطیکہ ٹھنڈے دماغ سے سوچا جائے"۔

یار! تُو اسے چھوٹا سا مسئلہ کہتا ہے"۔ لالہ جی نے تحمل سے کہا۔ "ایک تو کلدیپ میٹرک میں انتہائی بُرے طریقہ سے فیل ہو گیا ہے اور دوسرے بقول باسو کے میرے بیٹے پر کسی کریانے والے کی بیٹی دیپا سے عشق کا بھوت سوار ہو گیا ہے"۔

"لالہ جی! یہ فیل پاس زندگی کا ایک حصہ ہے"۔ ابا نے لالہ جی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "یہ ضروری تو نہیں کہ انسان اپنی زندگی میں ہر بار کامیاب ہی ہو۔ ناکامی زندگی کا ایک فطری پہلو ہے۔ کلدیپ کو کچھ پیار اور کچھ سختی سے سمجھائیں گے، وہ ذہن کا میرے بیٹے سے بھی اچھا ہے۔ اُسے ہم دوبارہ میٹرک کا امتحان دینے کی جانب راغب کریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ناکامی کا یہ داغ دھو دے گا"۔

"کلدیپ نے میٹرک میں فیل ہو کر ساری برادری، اوس پڑوس میں ہماری ناک کٹوا دی ہے"۔ لالہ جی کی پتنی نے دخل اندازی کرتے ہوئے کہا۔ "اور اب وہ ایک کریانے والے کی بیٹی سے عشق پیچا لڑا کر ہماری بدنامی کا ڈھول بجوائے گا"۔

"ذرا ہاتھ لگا کر دیکھ تیری ناک اپنی جگہ قائم ہے کہ نہیں"۔ ابا نے مذاق کے لہجے میں کلدیپ کی ماں سے کہا۔ "بھاوجیہ! میں نے تجھے پہلے ہی کہا کہ یہ دونوں مسئلے ہم حل کر لیں گے۔ میں تھوڑی دیر بعد تمہارے گھر آ کر خود کلدیپ کو سمجھاؤں گا"۔

ابا تھوڑی دیر بعد پڑوس میں لالہ جی کے گھر گئے۔ لالہ کی بیٹھک میں اس کی پتنی، لالہ ابا اور میں موجود تھے۔ تھوڑی دیر بعد ابا نے کلدیپ کو بلوایا۔ کلدیپ بیٹھک میں بڑی خاموشی کے عالم میں داخل ہوا۔

"بیٹا! میرے ساتھ قریب ہو کر بیٹھ جاؤ"۔ ابا نے اسے بڑے ملائم لہجے میں کہا۔ کلدیپ بڑی تابعداری سے ابا کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ابا نے اُسے میٹرک میں فیل ہونے پر تسلی دی اور حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔

"فیل ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ انسان کی زندگی ختم ہو گئی ہے۔ بیٹا! زندگی تو اپنے مخصوص انداز سے رواں دواں رہتی ہے۔ انسان اپنی زندگی میں ہمیشہ کامیاب نہیں ہوتا۔ جس طرح ہر اندھیرے کے بعد روشنی ہے اسی طرح ہر ناکامی کے بعد کامیابی ہے"۔

کلدیپ کی ماتا جو ابھی تک خاموش بیٹھی تھی اس سے خاموش نہ رہا گیا اور ابا کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''اس کلموئے سے اس کے عشق کے بارے میں بھی تو پوچھو..... اس سے پوچھو کہ کون رنڈی اس کے پیچھے پڑ گئی ہے''۔

''دیپا کو کچھ بُرا نہ کہیں ماتا جی!'' کلدیپ نے تڑپ کر اپنی ماں سے کہا۔ ''میں اس سے محبت کرتا ہوں، وہ ایک شریف باپ کی پاکیزہ بیٹی ہے''۔ کلدیپ نے گستاخانہ انداز میں اپنی ماتا کے سامنے یہ الفاظ کہے تو لالہ جی انتہائی غصیلے انداز میں اپنی جگہ سے اٹھے اور انہوں نے ایک زوردار تھپڑ کلدیپ کے منہ پر مارتے ہوئے کہا کہ تجھ کیڑے کی یہ مجال کہ تُو اپنی ماں کے منہ لگے اور گستاخانہ انداز میں بات کرے۔

ابا درمیان میں آئے اور انہوں نے کلدیپ کو پکڑ کر علیحدہ کر کے لالہ جی کے عتاب سے بچالیا۔

''میں کسی کے منہ سے دیپا کی برائی نہیں سن سکتا''۔ کلدیپ نے تیور بدلتے ہوئے کہا۔ ''وہ چاہے ماں ہو یا آپ اور کان کھول کر سن لیں نہ ہی میں نے میٹرک کرنا ہے''۔

''اچھا تو تُو چاہتا کیا ہے؟'' لالہ جی نے اس کی جانب میز پر پڑا پیپر ویٹ مارتے ہوئے کہا۔

پیپر ویٹ کلدیپ کو نہ لگا وہ بدقسمتی سے ابا کی پیٹھ پر جا لگا لیکن انہوں نے اس کے لگنے کی وجہ سے اپنی تکلیف کا اظہار نہ کیا۔

''اوہو عظیم الدین تجھے کوئی زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟'' لالہ جی نے شرمندگی سے پوچھا۔

''تُو میری چوٹ، تکلیف کی فکر نہ کر تُو صرف اپنا دماغی علاج کروا''۔ ابا نے اسے طنزیہ طور پر کہا۔ ''تُو بس اپنے دماغ کے اندر بسی گرمی کو ٹھنڈک دے''۔

''میں کیا کروں؟ اس اولاد نے تو مجھے زمانہ میں رسوا کر کے رکھ دیا ہے''۔ لالہ جی نے رو دینے والے انداز میں کہا۔

''معاف کرنا، ان مسائل کا ایک بڑا سبب تُو بھی ہے''۔ ابا نے صاف صاف کہا۔ ''تُو اپنی اولاد پر پاگل کتوں کی طرح جھپٹ پڑتا ہے''۔

''اچھا اب تُو ہی بتا''۔ لالہ نے اپنے لبوں سے تھوک اڑاتے ہوئے کہا۔ ''اگر تُو میری جگہ ہوتا اور تیری اولاد اسی طرح تجھے ذلیل، رسوا کرتی تو تُو کیا کرتا؟''

''ارے عقل سے پیدل انسان!'' ابا نے لالہ جی سے کہا۔ ''آج کل کی اولادیں اپنے بڑوں کی باتیں کہاں مانتی ہیں۔ کیا تُو نے اپنے پتا کی بات مانی تھی؟ انہوں نے تجھے بھاد جیہ کے ساتھ شادی کرنے سے منع کیا تھا۔ تُو بھی تو ان کے سامنے اینٹھ گیا تھا اور تُو نے بھی تو وہی کیا جو تیرے دل میں تھی''۔

''لیکن میں اتنا گستاخ نہ تھا جتنا کہ اس چھوکرے نے میرے سامنے گستاخی کی ہے''۔ لالہ نے کہا۔

''تاریخ ہمیشہ اپنے آپ کو دہراتی ہے''۔ ابا نے

جمع پونجی

☆......دنیا میں جو کھایا پیا خرچ کیا، وہ سب ختم ہو گیا۔ جو پیچھے چھوڑا وہ سب ورثاء کا مال ہو گیا۔ جو صدقہ کیا کر دیا وہ جمع ہو گیا اور وہی جمع پونجی ہے جو کام آئے گی۔

☆......سب سے بُرا وقت وہ ہو گا جب تمہارے غصے کے خوف سے تمہارے والدین اپنی ضرورت اور تمہیں نصیحت کرنا چھوڑ دیں۔

☆......''جب چھوٹے تھے تو والدین سے ڈرتے تھے، اب خود والدین ہیں تو اولاد سے ڈرتے ہیں''۔ یہ ایک والد کا کہنا ہے۔ واللہ کتنا بُرا وقت آ گیا ہے!

(محمد عبدالعزیز۔ شکارپور)

اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''اور وہی کچھ انسان کا بنتا ہے جو وہ بوتا ہے۔ تجھے میری یہ بات بُری لگے گی لیکن یہ حقیقت ہے کہ آج تُو اسی دوراہے پر کھڑا ہے۔ جیسے کہ کبھی تیرا باپ آج سے برسوں پہلے کھڑا تھا''۔

''یہ تُو مجھ سے ہمدردی کررہا ہے؟'' لالہ نے جھنجھلا کر کہا۔ ''یا میرے زخموں پر نمک چھڑک کر ان سب کے سامنے تذلیل کررہا ہے''۔

میں تیری تذلیل نہیں کررہا''۔ ابا نے کہا۔ ''اگر تُو سمجھے تو صرف تجھے حقیقت کا آئینہ دکھلا رہا ہوں''۔

''جا بڑا آیا مجھے میری حقیقت کا آئینہ دکھانے والا''۔ لالہ جی نے منہ بسور کر کہا۔

ابا نے اُس کی اس بات کا بالکل جواب نہ دیا اور اٹھ کر باہر نکل آئے۔ نہ ہی لالہ جی نے ابا کو روکنے کی کوشش کی۔

ابھی ہمیں اپنے گھر آئے بمشکل گھنٹہ ہی ہوا ہو گا کہ لالہ جی اور اس کی پتنی ہمارے گھر آگئے۔ ابا نے ان دونوں کی شکلیں دیکھتے ہی دیوار کی جانب منہ موڑ لیا۔

''دیکھ تیرے لئے چیچی لایا ہوں''۔ لالہ نے ابا کو پچکار کر کہا۔

ابا نے اپنا منہ دیوار کی جانب سے موڑ کر دیکھا تو لالہ جی کے ہاتھوں میں گلاب جامن تھے۔

''یہ کیا مذاق ہے؟ دفع ہو جا میری نظروں سے''۔ ابا نے مصنوعی غصے سے کہا۔

''اچھا ہو جاؤں گا پہلے یہ گرم نرم گلاب جامن تو کھا لے''۔ لالہ جی نے کہا۔ ''مجھے معلوم ہے کہ تُو میرے بغیر اور نہ میں تیرے بغیر رہ سکتا ہوں لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہے تُو ان گرم گرم گلاب جامنوں کے بغیر نہیں رہ سکتا، یہ تیری بچپن سے کمزوری ہے''۔ پھر لالہ جی نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''ارے باسو! سنو یہ بچپن میں میری ماتا، پتا سے اتنا مانوس تھا کہ یہ اپنی توتلی زبان میں ان سے گرم گرم گلاب جامنوں کی فرمائش کرتا تھا اور انہیں چچ کہا کرتا تھا..... چل تائی! اب مجھے معاف کر دے۔ میں نے دراصل کلدیپ کے فیل ہونے اور کم عمری میں ایک گھٹیا لڑکی کے عشق میں مبتلا ہونے اور اس کی گستاخی کی وجوہات سے پریشانی میں تجھ سے سخت الفاظ بول دیئے۔ یار! مجھ بے وقوف کو معاف کر دے''۔

''جا ستار! ہاورچی خانہ میں پڑے پیالوں میں ان گلاب جامنوں کو ڈال کر لا''۔ ابا نے غصہ تھوک کر مجھ سے کہا۔

''دیکھا ناں! میں اس تائی کی کمزور نسوں کو جانتا ہوں''۔ لالہ جی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تاؤ یہ تائی سے آپ کی کیا مراد ہے؟'' میں نے لالہ جی سے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''دراصل 'تائی' عظیم کی بچپن کی چھیڑ ہے''۔ لالہ نے جواباً ہنستے ہوئے کہا۔ ''یہ پہلے اس لفظ کو سن کر چڑتا تھا لیکن اب اس کا کوئی ردعمل نہیں دیتا''۔

تھوڑی دیر بعد جب ماحول خوشگوار ہوا اور ابا نے لالہ جی کی جانب سے لائی گئی گلاب جامنیں کھا لیں تو کلدیپ کی ماں نے رندھی ہوئی آواز میں ابا سے کہا کہ عظیم بھائی اپنے خدا کے واسطے ہمیں اس گرداب سے نکالو ہمیں کوئی حل بتلاؤ جس کی بناء پر اُس کا پھر سے ذہن تعلیم کی جانب راغب ہو اور اس کلموئی دیپا کی محبت سے پلٹنے لگے''۔

''اگر تم میری ایک بات مانو، تمہارا سارا معاملہ خوش اسلوبی سے حل ہو جائے گا''۔ ابا نے اتنا کہہ کر خموشی اختیار کرلی اور کچھ سوچنے لگے۔

''عظیم الدین! تجھے اجازت ہے وہ بول جو تیرا دل ہماری بہتری کے لئے کہتا ہے''۔ لالہ جی نے کھلے دل سے کہا۔ ''تُو میرا یار ہے اور میری بہتری ہی سوچے گا''۔

''فی الحال کلدیپ کے سر پہ سوار عشق سے بڑھ کر اصل مسئلہ اُس کی تعلیم میں پیدا ہونے والا خلل ہے''۔ ابا نے بات شروع کی۔ ''اس نے اگر اب عشق کی وجہ سے تعلیم سے منہ موڑ لیا تو وہ ساری زندگی جاہل رہے گا۔ لہٰذا اب وقت کا تقاضا یہی ہے کہ کلدیپ کے ذہن میں یہی ڈالا جائے کہ وہ کسی بھی طرح پہلے اپنا میٹرک کا امتحان پاس کرلے تو پھر اس کی دیپا سے شادی کے بارے میں سوچا جائے گا''۔

''تیری بات میں وزن تو ہے''۔ لالہ جی نے ابا کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اگر کلدیپ نے میٹرک کر لیا اور اس نے دیپا سے شادی کی ضد کی تو میں کسی قیمت پر بھی اُس کی شادی اُس کریانے والے کی لڑکی سے نہیں کروں گا''۔

''اب یہ تیرا مسئلہ ہے کہ تُو کلدیپ کی شادی دیپا سے کرے گا یا نہیں''۔ ابا نے کہا۔ ''لیکن میری اس تجویز سے تمہارے خاندان کو یہ فائدہ ہوگا کہ تمہارا بیٹا میٹرک پاس کرلے گا۔ رہا سوال اس کی دیپا سے شادی کا تو وہ اس کے میٹرک کرنے کے بعد کسی تدبیر سے ٹالنے کی کوشش کریں گے''۔

''اچھا، یہ بات تُو ہی کلدیپ کو اپنے گھر بلا کر پیار بھرے طریقہ سے سمجھا''۔ لالہ جی نے ابا پر ذمہ داری ڈالتے ہوئے کہا۔ ''وہ ہم پر تو کتوں کی طرح غرا رہا ہے''۔

ابا نے شام کو کلدیپ کو گھر بلایا۔ انہوں نے اُسے سمجھایا کہ وہ اپنے عشق کو فی الحال پسِ پشت ڈالتے ہوئے اپنی پڑھائی پر توجہ دے کر اپنے میٹرک کے امتحان کو کلیئر کرنے کی بھرپور کوشش کرے۔ میٹرک کے بعد میرا تم سے وعدہ ہے کہ اس کے بعد تمہاری شادی کے معاملہ پر توجہ دیں گے۔ ابا نے کلدیپ کو اس امر پر راضی کر لیا کہ وہ آئندہ چھ ماہ کے اندر ہونے والا میٹرک کا امتحان دے گا۔ کلدیپ کے ذہن پر ابا کے سمجھانے کا اچھا اثر ہوا۔ اس نے ایک طرف پھینکی ہوئی درسی کتب کو دوبارہ سے اٹھا کر انہیں بڑی جانفشانی سے پڑھنا شروع کر دیا۔

ادھر لالہ جی نے ہمارے گھر آ کر بڑی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ابا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا تھا کہ یار عظیم تیری کوششوں سے کلدیپ کا دل پڑھائی کی جانب گامزن ہوا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ مجھے بھگوان سے پوری امید ہے کہ وہ اپنے میٹرک کے پیپرز میں اعلیٰ نمبروں سے پاس تو ہو جائے گا لیکن مجھے پریشانی اس بات کی ہے کہ اُس کے میٹرک کرنے کے بعد اُس کے دیپا سے شادی کے معاملہ کو کون سنبھالے گا۔

''یار! تُو اس بات کی ابھی پروا نہ کر اسے بھی ہم طریقہ اور عقل سے سنبھال لیں گے''۔ ابا نے اسے تسلی دی۔

چند مہینے بعد کلدیپ کا جب میٹرک کا رزلٹ آیا تو اس نے اس میں ہائی سیکنڈ ڈویژن لی۔ میٹرک پاس کرنے کے دوسرے روز وہ سیدھا ابا کے پاس آیا اور اس نے ابا سے کہا۔

''چچا عظیم! میں نے آپ کے زور دینے پر میٹرک کر کے دکھا دیا ہے''۔ اس نے ہٹ دھری سے کہا۔ ''اب آپ میرے پتا کو کہیں کہ وہ لاسا گاؤں جا کر دیپا کے پتا سے میری سگائی کی بات کریں''۔

''ہاں، ہاں میں جاتا ہوں''۔ ابا نے اُسے دبے لفظوں سے ٹالتے ہوئے کہا۔

ابا نے لالہ جی سے کلدیپ کے مطالبے یعنی دیپا سے اس کی شادی کی بات کی تو وہ آگ بگولہ ہو گیا۔

''تُو تو کہتا تھا کہ میں کلدیپ کے میٹرک کرنے کے بعد اس کی شادی کا معاملہ اپنے طریقہ و تدبیر سے حل کرلوں گا''۔ لالہ جی نے جھنجھلا کر کہا۔ ''تو اب اسے حل

کر۔"

"وہ تو میں اس کی شادی میں کوئی نہ کوئی رکاوٹ پیدا کر ہی لوں گا"۔ ابا نے لالہ جی سے کہا۔ "لیکن تم لوگ بھی اس کام میں میرا ساتھ دو"۔

"کیسا ساتھ؟" لالہ جی نے اُن سے استفسار کرتے ہوئے پوچھا۔

"میری مانو تم لوگ کلدیپ کا دل رکھنے کے لئے لاسا گاؤں اس دلربا دیپا کو دیکھنے کے لئے لازمی جاؤ"۔ ابا نے کہا۔ "اور وہاں جانے کے بعد اُسے یہ کہہ کر نال دو کہ اس کی اور دیپا کی کنڈلی نہیں ملتی اور اس طرح اس کے عشق کا معاملہ خود بخود دم توڑ جائے گا"۔

"ہاں، یار عظیم الدین! تیری یہ بات رد کرنے والی نہیں ہے"۔ لالہ جی نے خوش ہو کر کہا۔

ایک اتوار کے روز ابا، لالہ کیدار ناتھ ان کی پتنی، میں اور میری اماں اور کلدیپ کی بہن لاسا گاؤں دیپا کو دیکھنے چل پڑے۔ یہاں یہ بتلانا ضروری ہے کہ لاسا گاؤں ایک انتہائی پسماندہ اور بے کار علاقہ پر مشتمل تھا۔ اس گاؤں کی حدود سے تقریباً ایک میل دور پہلے ہی ہم لوگوں کو بس نے اتار دیا تھا۔ البتہ دیپا کا باپ مکیش اپنے بیٹے اور ایک خالی تانگہ کے ساتھ ہمیں لینے وہاں آ گیا تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر ہم لوگوں کا بڑی تابعداری سے استقبال کیا۔

تانگہ ہم لوگوں کو اٹھائے ناہموار راستے پر ہچکولے کھاتا ہوا بڑی مشکل سے آدھ گھنٹے کی مسافت کے بعد مکیش کے چھوٹے سے مکان پر پہنچا۔ مکیش نے ہم مہمانوں کے بیٹھنے کے لئے اپنے گھر کے آنگن میں بان کی چارپائیاں بچھائی ہوئی تھیں۔ اُس علاقہ کے ننگ دھڑنگ دیہاتی بچے ہم لوگوں کو دیکھنے کی غرض سے جمع ہو گئے۔

"اری کلدیپ کی ماں! مجھے یہ کس کراہت والے

ماحول میں کہاں اٹھا لے آئی ہے؟" لالہ جی نے اپنے منہ پر رومال رکھتے ہوئے اپنی پتنی کو کہا۔ "میرا تو یہاں تعفن کی وجہ سے دل متلانے لگا ہے"۔

"لالہ جی! ہم لوگ یہاں کچھ دیر بیٹھنے کی صرف رسم ادا کریں گے اور پھر ان کا دل رکھ کر چلے جائیں گے"۔ کلدیپ کی ماں نے کہا۔

"ہاں بھئی تیری لونڈیا نے ہمارے لونڈے سے کیسے عشق مٹکا کرلیا؟ ذرا وہ رام کہانی تو سنا"۔ لالہ جی نے بڑے ہتک آمیز انداز میں دیپا کے باپ سے کہا۔

مکیش نے ایک لمحے کے لئے بڑے غور سے لالہ جی کی جانب دیکھا اور پھر وہ بڑی دلیری سے جواباً لالہ جی سے مخاطب ہو کر بولا۔

"لالہ جی! آپ میرے مہمان ہیں اور مہمان بھگوان کے برابر ہوتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ مجھ سے اس گھٹیا لہجے سے بولیں کہ میں آپ کو دیپا اور آپ کے عاشق مزاج لڑکے کلدیپ کی کہانی سناؤں۔ معاف کرنا میری لڑکی اس کے پیچھے نہیں گئی تھی۔ تمہارا عاشق مزاج لونڈا ہی میری پتری کے پیچھے یہاں آیا تھا۔ آپ میرے گھر مہمان کی طرح آئے ہیں تو مہمان ہی رہیں۔ مجھ پر یوں جملے بازی نہ کریں۔ آپ میرے مالک نہیں ہیں، میں اپنا کماتا کھاتا ہوں"۔

"آپ لالہ کی بات کا بُرا نہ مانیں"۔ میرے ابا نے ماحول میں امن پیدا کرنے کے لئے درمیان میں بولتے ہوئے کہا۔ "یہ ان کا لہجہ ہے، انہوں نے یہ بات آپ کو بے عزت کرنے کے لئے نہیں کہی ہے۔ ہم لوگ تو اتنی دور سے آپ کی بیٹی کو دیکھنے کے لئے آئے ہیں"۔

مکیش نے لالہ جی کی جانب ہلکا سا ناگواری کے انداز میں دیکھا۔ چند لمحوں بعد ہمارے سامنے دیپا کا بھائی اپنے ہاتھ میں ٹھنڈی لسی سے بھرا جگ چند گلاس اور دیگر کھانے کے لوازمات لے آیا۔

"میرا خیال ہے مجھے یہاں سے چلنا چاہئے"۔ لالہ جی نے نخوت بھرے لہجے میں کہا۔ لالہ اپنے دل میں آئے غصے کو قابو نہ رکھ سکا تھا۔

"آپ میرے مہمان ہیں"۔ مکیش نے کہا۔ "میں آپ کو خود سے جانے کا نہیں کہہ سکتا"۔

"بیٹھ جا پاگل انسان!" میرے ابا نے لالہ جی کا ہاتھ غصہ سے جھٹکتے ہوئے کہا۔ "تُو نے اگر یہاں یہی ڈرامہ تماشہ کرنا تھا تو تُو یہاں آیا کیوں تھا"۔

"معاف کرنا بہن ہم لوگ جس کام کے لئے آئے ہیں وہ ہمیں کرنا چاہئے"۔ تائی سنتو نے دیپا کی ماں کو کہا۔ (پھر انہوں نے لالہ جی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا)۔ "بہن ان کے رویہ کا برا نہ ماننا ہم لوگ بذاتِ خود ان کے رویے کی طرف سے بہت پریشان ہیں۔ ان کا بھی کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ دراصل یہ آج کل کلدیپ اور چند گھریلو مسائل کی وجہ سے الجھے ہوئے ہیں"۔

"ہاں مجھے کچھ اندازہ ہے"۔ مکیش نے تائی سنتو کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"اچھا ذرا اپنی بیٹی کو تو کہو کہ وہ پرنام کرنے آئے"۔

میرے ابا نے دیپا کی ماں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

تھوڑی دیر بعد دیپا اپنے چہرے پر سفید چادر ڈالے بڑے شرمائے انداز میں آ کر اپنی ماں کے ساتھ بیٹھ گئی۔

"بیٹی ذرا اپنا چہرہ تو دکھلاؤ"۔

دیپا نے اپنے چہرہ سے چادر کیا اٹھائی کہ ہم سارے خلاف توقع اُس کا حسین سراپا دیکھ کر حیرت کا شکار ہو کر رہ گئے۔ اجلی رنگت، کھڑے دلفریب نقش و نگار پر مشتمل کسی حور پری سے کم نہ تھی۔ لالہ جی، تائی سنتو، میرے ابا، اماں اس کا حسن و جمال دیکھ کر دنگ رہ گئے۔

(جاری ہے)

ماماتا چاہے انسان کی ہو یا حیوان کی اپنے بچوں کو پہنچنے والی ذرا سی تکلیف اس کے لئے ناقابل برداشت ہوتی ہے۔

ماماتا کی چیخ

محمد نذیر ملک

وسط پوہ کی سردی سے ٹھٹھری ہوئی رات کا آخری کنارہ ٹوٹ رہا تھا۔ وہ بڑے کُہر والی رات تھی، ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ دھیمی جھڑی (ہلکی بارش) دو روز سے مسلسل جاری تھی۔ گلیوں میں بسنے والے آوارہ کتے اپنی اپنی کمین گاہوں میں دبکے بدن میں خز گھسیڑے سردی سے کپکپا رہے تھے۔

کالی کتیا اپنے چار نوزائیدہ بچوں کے ساتھ ایک گرے ہوئے مکان کی چھت کے باقی رہ جانے والے کونے کے نیچے اس گڑھے میں لیٹی تھی جسے کھود کر اس نے اس کے اندر چند روز پہلے ان بچوں کو جنم دیا تھا۔ کتیا

کے بچے اس کے جسم کے ساتھ گویا پیوست ہوئے جا رہے تھے، وہ اس کے ساتھ چپکے پڑے تھے۔ وہ دودھ پیتے پیتے سو جاتے، جاگتے پھر دودھ چوسنے لگتے۔ متواتر بارش کے باعث دو روز سے کتیا کو کچھ کھانے کو نہیں ملا تھا لہٰذا اس کا دودھ اپنے ان چار بچوں کے لئے ناکافی ہو چلا تھا۔ اگر اس کے بچوں کے پیٹ بھرے ہوتے تو وہ دیر تک سوتے رہتے۔ بھوک انہیں ذرا ذرا سی دیر بعد جگا دیتی۔ سردی انہیں اتنا تنگ نہیں کر رہی تھی جتنی ان کی ماں کو کر رہی تھی۔ کیونکہ جنم لیتے ہی ان کا واسطہ ٹھنڈی یخ فضا والی دنیا سے پڑا تھا لہٰذا ان کے اندر ابھی اس بات کا احساس پیدا نہیں ہوا تھا کہ اس کے علاوہ بھی کوئی موسم یا دنیا ہوتی ہے۔ ان کا تو فقط ایک ہی موسم تھا اور وہ تھا بھوک۔ وہ صرف بھوک لے کر اس دنیا میں آئے تھے۔ ان کے پیٹ کی بھوک جب ختم ہو جاتی تو وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر سو جاتے پھر انہیں کسی موسم جیسی چیز کی پروا نہ رہتی چاہے برفیلی ہوائیں چلیں یا آگ برساتی لو چلے۔

ان کی آنکھیں ابھی پوری طرح نہیں کھلی تھیں انہوں نے نیم وا آنکھوں کے کونوں سے ایک مدھم سی روشنی کی لکیر کی شکل میں اس دنیا کو دیکھا تھا۔ جسے دیکھتے ہی ان کی آنکھیں مزید چندھیا گئیں اور ان میں پانی اتر آیا۔ ان کی دنیا کیا تھی فقط ماں کے لئے دودھ والی جگہ کا وجود۔

ماں کے دودھ کا پستان منہ میں ڈالتے ہی ان کی نیم وا آنکھیں مکمل طور پر بند ہو جاتیں پھر وہ ماں کے پیٹ والے اسی سابقہ اندھیرے میں پہنچ جاتے۔ ماں کے جسم کا لمس انہیں ہلکی ہلکی حرارت دیتا۔ ادھر ماں کی ممتا کو بھی ان کے ریشم جیسے نرم ملائم اور گداز بدن سکون اور راحت پہنچا رہے تھے۔ ممتا ان کے جسموں کے لمس سے نہال ہوتی جا رہی تھی۔

قدرت نے اس جانور میں دیگر جانوروں کی ماؤں کی طرح ممتا کوٹ کوٹ کر بھر دی اور وہ ممتا کے ہاتھوں اپنے بچوں کو اپنا خونِ جگر (دودھ) پلانے پر مجبور تھی ورنہ اس رات کے اس گھور اندھیرے میں ایسا کرنے پر کسی دوسری شے نے مجبور نہیں کیا تھا۔ اس کے پستان اب دودھ سے خالی ہو چلے تھے۔ عام حالات میں تو وہ کب کی اٹھ کر گڑھے سے باہر آ چکی ہوتی۔ اپنے لئے خوراک حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ بچوں کے لئے دودھ بھی بھر لیتی اور تازہ دم ہو کر ان کے پاس آتی لیکن بارش تھی کہ رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ وہ اپنے لئے تو صبر کر کے پڑی رہتی فطرت نے اس کے اندر لمبی مدت تک کے لئے بھوک سہنے کا مادہ رکھ دیا تھا۔ وہ کبھی جاگ کر اور کبھی سو کر ایسی سینکڑوں راتیں بھوکے پیٹ بھوگ چکی تھی لیکن اس ممتا کو وہ کہاں سلا دیتی جو اس کے ننھے منے نوزائیدہ بچوں کی بھوک کی وجہ سے جاگ کر بے قرار ہو جاتی۔ پلے اب بھوک سے مسلسل بلبلا رہے تھے اور ہر سانس کے ساتھ چاؤں چاؤں کی آواز میں کراہ رہے تھے اور ان کی یہ آواز ممتا کا کلیجہ چیر رہی تھی۔ ممتا چاہے انسان کی ہو یا حیوان کی اپنے بچوں کو پہنچنے والی ذرا سی تکلیف اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔

آخر اس سے رہا نہ گیا اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور ننھے منے بچوں کو بلکتا چھوڑ کر بھری برسات میں کالی رات کے اندھیرے میں گم ہو گئی۔ وہ سردی سے کپکپاتی بارش میں بھیگتی رات کے اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے لگی۔ وہ راستے میں پڑی ہر چیز کو سونگھتی اور اس کی بو لیتی چلی جا رہی تھی کہ مبادا اسے کوئی اس کے کھانے کی چیز مل جائے جس سے اس کی اپنی بھوک بھی مٹ جاتی اور ساتھ ہی ساتھ وہ بچوں کا پیٹ بھرنے کے لئے اپنا دودھ اتار سکے۔

اس کے تھنوں میں دودھ تب ہی اترتا جب اس

کے اپنے پیٹ میں خوراک پہنچتی ورنہ بھوکے پیٹ نہ جانے اس کا دودھ بھی کہاں چلا جاتا۔ کہتے ہیں کتے میں سونگھنے اور بوگیری کی حس دیگر جانوروں سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ یہ ہلکی سی بو کو بھی پالیتا ہے اور بسا اوقات یہ زمین سونگھنے کی بجائے فضا کو سونگھ کر مطلوبہ شے تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کے اس وصف سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس سے سراغرسانی کا کام لیا جاتا ہے۔

آج رات کالی کتیا بھی اپنی خوراک کی سراغرسانی کا مشن لے کر بارش میں سردی سے کانپتی چلی جارہی تھی کہ اچانک اسے ایک مخصوص اور عجیب سی بو نے اپنی جانب متوجہ کیا۔ وہ فوراً اُدھر کو لپکی جہاں سے یہ بو اٹھ کر آ رہی تھی۔ وہ رات کے اندھیرے میں بارش سے بھیگتی کپڑوں کی ایک گٹھڑی سے جا ٹکرائی جس کے اندر سے وہ بو اٹھ رہی تھی۔ اس نے اندھیرے میں تیز نظروں سے اس گٹھڑی کو دیکھا اور پھر ایک ساتھ اسے اپنے دانتوں اور پنجوں سے اس گٹھڑی کو ادھیڑنے لگی۔ جلد ہی اسے اندر سے نرم و نازک سی شے ملی جسے سونگھتے ہوئے اس نے اس پر اپنے دانت گاڑ دیئے اور فوراً ہی اس میں سے اس کا ایک ٹکڑا نوچ لیا اور اسے لمحوں میں نگل گئی پھر اس کے بعد دوسرا اور پھر تیسرا۔ اسی طرح وہ اس سے اپنی باقی کی بھوک مٹانے لگی۔ بارش برابر برس رہی تھی اب اسے ان برستی بارش اور ہڈیوں میں اترنے والی برفیلی ہوا کی پروا نہیں رہی تھی۔ آج جو کچھ اس نے کھایا اس سے پہلے وہ اسے کبھی نہیں ملا تھا۔ اس کا ذائقہ اس نے پہلی بار چکھا تھا۔ وہ اسے بھنبھوڑتی رہی اور اس کے ٹکڑے نگلتی رہی حتیٰ کہ وہ سیر ہوگئی۔

اسے اب واپسی کی جلدی تھی۔ کچھ ہی دیر میں اس کے خشک تھنوں میں دودھ بھرنے لگا۔ دودھ کے آتے ہی اسے اپنے بچے یاد آنے لگے۔ اس نے منہ موڑ لیا اور واپس بچوں والے گڑھے کو دوڑ پڑی۔ پلے گڑھے میں پڑے اکٹھے ہو کر ایک دوسرے سے چپکے ہوئے تھے۔ ماں کی عدم موجودگی میں وہ ایک دوسرے سے بغلگیر ہو کر حدت حاصل کرتے ہوئے کوں کوں اور چیاؤں چیاؤں کر رہے تھے۔ وہ فی الوقت بھوکے تھے۔

کالی کتیا رات کے اندھیرے کا حصہ بنی بچوں کے پاس دوڑی آئی اور آ کر ان کے اوپر گر گئی۔ پلے اس کے دودھ سے بھرے تھنوں پر پل پڑے۔ آج ان کے دودھ میں بھی الگ سا مزہ تھا۔ انہوں نے جھاگ اڑاتے ہوئے خوب جی بھر کر دودھ پیا۔ جب ان کے پیٹ بھر گئے تو وہ سب ماں کے ساتھ مل کر ایسے سوئے کہ کافی دن چڑھ آیا۔ بادل چھٹ چکے تھے اور خوشگوار دھوپ نکل آئی۔

بارش کے رکنے پر جب لوگ اپنے اپنے کام کاج کے لئے گھروں سے نکلے تو انہوں نے یہ دلخراش منظر دیکھا کہ راستے میں گلی کی نکڑ پر تار تار کی ہوئی کپڑے کی دھجیوں کے ساتھ ایک انسانی نوزائیدہ بچے کی آدھ کھائی لاش پڑی ہے۔

رات کے اندھیرے اور مسلسل بارش کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کسی انسانی ماں نے اپنا گناہ چھپانے کے لئے ممتا کا گلا گھونٹ کر بچہ گلی میں پھینک دیا۔ دوسری طرف ممتا کی ماری حیوانی ماں اپنے بچوں کی زندگی کی خاطر ٹھنڈی یخ بارش برساتی رات میں خوراک کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی اور گلی میں پھینکے گئے اس انسانی بچے کے ساتھ جا ٹکرائی اور اسے ہڑپ کر گئی۔ وہ بھوکی تھی اسے کیا پتہ کہ یہ انسانی گوشت ہے یا حیوانی۔ ممتا دونوں ماؤں کی ایک جیسی تھی لیکن دونوں ماؤں میں بہت فرق نکلا۔ ایک ماں اپنے بچوں کی زندگی بچانا چاہتی تھی جبکہ دوسری (انسانی ماں) نے سماج کے ڈر سے اپنے بچے کی زندگی لے لی اور ساتھ ہی اپنی ممتا کا بھی گلا گھونٹ دیا۔

حیوانی ماں تو فقط اپنے بچوں کی بھوک برداشت نہ

کر سکی اور جا کر انسانی گوشت پر ٹوٹ پڑی جبکہ انسانی ماں نے زمانے کے ڈر سے اپنے لخت جگر کے ساتھ ساتھ اپنی ماںتا کا نرخرہ دبانے کی اذیت بھی برداشت کر ڈالی لیکن کیا ایسا ہو پایا؟ کیا انسانی ماں ماںتا کا گلا دبانے میں کامیاب رہی؟ اس کا جواب نفی میں آیا۔

ہوا یوں کہ صبح بارش تھمنے پر لوگ آدھ کھائی (نوزائیدہ بچے کی) لاش کے قریب جمع ہو گئے۔ کئی چھٹی ننھی سی لاش سے بدبو کے بھبھوکے اٹھ رہے تھے لوگوں نے اپنے ناکوں پر ہاتھ یا کپڑے رکھے تھے۔ اکثر لوگ توبہ توبہ کرتے اپنے کانوں کو بھی پکڑ رہے تھے۔ ان لوگوں میں مردوں کے ساتھ عورتیں بچے اور بچیاں بھی شامل تھیں۔ نوزائیدہ بچے کی لاش کا کوئی وارث نہ تھا، نہ ہی وارث بننے کو کوئی تیار تھا سب ہی تماش بین تھے۔

کوئی آ کر لاش (کے ٹکڑوں) پر کپڑا ڈال دیتا، دوسرا آتا تو کپڑا ہٹا کر دیکھتا لیکن لاش فی الواقع دیکھنے کے قابل نہ تھی۔ اس بات پر چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ لاش کو کہاں دفن کیا جائے۔ بعض لوگوں کو اس پر اعتراض تھا کہ اسے کس قبرستان میں دفن کیا جائے۔ لاش کپڑے میں ڈال دی گئی۔ اسی اثناء میں وہاں پاس کھڑی لڑکیوں میں سے کسی نے لاش پر سے کپڑا ہٹایا اور دیکھتے ہی اس زور سے چیخ ماری کہ سب کو ہلا کر رکھ دیا۔ وہ محلہ کی کلثوم نام کی ایک نوعمر لڑکی تھی جس کا تعلق نہایت ہی شریف اور عزت دار گھرانے سے تھا۔ جونہی اس کے منہ سے چیخ نکلی اس کی ماں نے جو نہ جانے کب اور کہاں سے اُدھر آ گئی تھی، تڑاخ سے دو تین تھپڑ کلثوم کے منہ پر جڑ دیئے اور اسے گھسیٹتے ہوئے وہاں سے دور لے جانے لگی لیکن یہ سب کچھ اتنا اچانک غیر متوقع اور جلدی میں ہو گیا کہ ماں بیٹی دونوں کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ ملا اور وہ سب کی نظروں میں آ گئیں۔ لوگوں نے منہ میں انگلیاں ڈال لیں۔ کلثوم کی ہچکیاں بندھ چکی تھیں۔ لوگ دوبارہ توبہ توبہ کر اٹھے۔

ماں اپنی بیٹی کو منظر سے ہٹا کر گھر لے تو گئی لیکن ماںتا کی اس بے اختیار چیخ نے سب کو چونکا دیا تھا۔ بھرے مجمع میں بیٹی کا پول کھل گیا تھا۔ وہ ایک عزت دار گھرانہ تھا لوگ ان کی عزت کرتے تھے، اب سب ان پر تھوتھو کر رہے تھے۔

کلثوم کا باپ جو اس وقت گھر سے باہر تھا اور اس سارے معاملہ سے بے خبر تھا وہ اچانک واپس آ گیا جب وہ اس جگہ سے گزر رہا تھا تو لوگوں کا ہجوم دیکھ کر رک کر پوچھنے لگا کہ یہاں کیا ہوا ہے؟ کوئی بھی اسے بتانے کی ہمت نہ کر سکا۔ آخر اس کا ایک قریبی رشتہ دار اسے پکڑ کر ایک طرف لے گیا اور اسے تمام واقعہ بتا دیا جسے سن کر اس کا سر چکرا گیا، وہ دھپ سے زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔ لوگ اس کے گرد جمع ہونے لگے لیکن جلد ہی اس کے رشتہ دار نے اسے وہاں سے ہٹا لیا اور گھر پہنچا دیا۔

اسی اثناء میں لوگوں نے لاش کو اٹھا کر قریب کے ایک ویرانے میں گڑھا کھود کر دفن کر دیا۔ کلثوم کو ماں گھر تو لے آئی تھی لیکن اس رسوائی اور جگ ہنسائی سے بہتر ہوتا دونوں ماں بیٹی کہیں ڈوب مرتیں۔ گھر میں بیٹھا باپ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہا تھا۔ بھائی اپنی اپنی جگہ الگ پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ وہ سب لوگوں کی تیز نظروں کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ اس گھر کا ہر فرد باہر کے لوگوں سے تو کیا گھر کے اندر بھی ایک دوسرے سے نظریں چراتا پھر رہا تھا۔ ماں بیٹی نے گھر کے کسی فرد کو معاشرے کے کسی فرد سے نظریں چار کرنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔

کہتے ہیں ماں بیٹی کی اور بیٹی ماں کی ہم راز ہوتی ہے اور یہ بھی سنا ہے کہ بیٹیاں ماں کی انگلی کے پوروں میں ہوتی ہیں۔ ان کی چال ڈھال، اٹھنے بیٹھنے، پہننے اوڑھنے یا بولنے میں ذرا سا فرق آ جائے تو ماں کے دل پر لگے Antina پر فوراً سگنل آ جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ بیٹی کا

تصور اور جرم نا قابل معافی تھا لیکن اس جرم میں ماں بھی برابر کی شریک تھی۔ اگر معاشرے نے بیٹی کو اس کے اس گھناؤنے جرم پر کوئی سزا دینی تھی تو اس سزا کی حصہ دار بیٹی کے ساتھ ساتھ ماں بھی تھی۔ جس کی ناک کے نیچے یہ سارا کھیل کھیلا جاتا رہا اور اس نے بیٹی کو کھلی چھٹی دے رکھی تھی کہ وہ جو مرضی کرے اس سے پوچھا نہیں جائے گا۔

آخر جب پانی سر سے گزر گیا تو ماں بیٹی دونوں کو ہوش آیا۔ کلثوم دفتر کی ملازمت کے زعم میں وہاں کے عامیانہ ماحول کا حصہ بن گئی۔ ماں بھی اس میں خوش تھی کہ بیٹی شہر کے ایک بڑے آفس میں اچھی تنخواہ پر کام کرتی ہے۔ باپ البتہ اس پر راضی نہ تھا لیکن اس غریب کی اس گھر میں کون چلنے دیتا۔ وہ بھی پیرانہ سالی میں گھر سے باہر چھوٹی موٹی ملازمت میں دھکے کھا رہا تھا۔ گھر میں ماں کی حکمرانی تھی، دونوں بھائی پڑھائی سے بھاگے ہوئے آوارہ منش تھے۔ بظاہر کسی آٹو ورکشاپ میں کسی استاد کے نیچے گاڑیوں کا کام سیکھ رہے تھے اور اس گھر میں ہر کوئی شتر بے مہار کی طرح زندگی گزار رہا تھا۔ کوئی کسی کا پُرسان حال نہ تھا، نہ کسی کی کسی کو پروا تھی البتہ ماں بیٹی کی گاڑھی چھنتی تھی وہ آپس میں شیر و شکر تھیں اور ایک دوسری کی ہمراز تھیں۔ کلثوم نے اپنے باس کے ساتھ دوستی کی تو ماں نے حوصلہ افزائی کر ڈالی تھی لیکن بات جب قابو سے باہر ہو گئی اور خطرے کا الارم بج اٹھا تو دونوں ماں بیٹی باس کو ملیں اور ماں نے اسے کہا کہ وہ کلثوم سے شادی کر لے۔ باس نے جواب میں کہا کہ وہ پہلے سے شادی شدہ اور بچوں والا ہے۔ ماں نے کہا دوسری کر لو۔ کہا نہیں وہ متحمل نہیں ہو سکتا۔ البتہ وہ کلثوم کے وضع حمل کا تمام خرچہ ادا کرنے کو تیار ہے۔

اب کلثوم کی ماں نے ڈاکٹروں سے مشورہ لیا، گائناکالوجسٹ نے معائنہ اور الٹراساؤنڈ Tests وغیرہ

کے بعد بتایا کہ اس مرحلے پر وضع حمل انتہائی خطرناک نتائج کا حامل ہوگا۔ اس میں لڑکی کی جان جا سکتی ہے۔ بہتر ہے کہ بچے کی نارمل delivery (پیدائش) کا انتظار کیا جائے۔ کلثوم کو گھر بٹھا دیا گیا اور گھر آنے جانے والے مرد و عورتوں سے ملنے سے قطعی طور پر منع کر دیا گیا۔ حتیٰ کہ باپ اور بھائیوں کو بھی بے خبر رکھا گیا اور پھر وہ وقت آتے دیر نہ لگی جب کلثوم کے ہاں بچہ پیدا ہوا۔ ماں نے اسے شہر کے ایک ہسپتال میں داخل کرا دیا تھا۔ وہیں بچے کی پیدائش ہوئی۔ دو دنوں بعد ہسپتال والوں نے زچہ بچہ کو چھٹی دے دی۔

اب مسئلہ یہ آن پڑا کہ بچے کو دنیا والوں سے کیسے چھپایا جائے۔ باہر والوں سے زیادہ گھر والوں سے اسے چھپانا مشکل تھا۔ اب بچے کو لے کر کلثوم کی ماں دوبارہ جا کر اس کے باس سے ملی اور اسے بتایا کہ اس کا یہ بیٹا پیدا ہوا ہے اور یہ کہ وہ اسے اپنا لے اور اسے واسطے دیئے۔ باس یہ سن کر ہکا بکا رہ گیا اور کہا کہ اس نے تو اسی دن جب دونوں اس سے ملی تھیں کہہ دیا تھا کہ ابارشن کرا دو وہ تمام خرچہ دینے کو تیار ہے لیکن تم لوگوں نے میری بات نہیں مانی۔ اب مجھ کو میں کسی طور بھی اس ناجائز بچے کو اپنانے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ میرے ہاں بچوں کی کمی نہیں اور پھر کیا میں نے ساری دنیا کا ٹھیکہ اٹھایا ہوا ہے کہ بچے پالتا پھروں۔ اب کلثوم کی ماں کے لئے یہ دروازہ بھی بند ہو گیا، وہ پھر ہسپتال آئی اور انہیں کہا کہ بچے کو ہسپتال داخل کر لیں۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ اوپر سے برسات شروع ہوگئی اور سردی میں بے پناہ اضافہ ہو گیا اور بچہ فی الحقیقت بیمار ہو گیا۔ اسے ڈبل نمونیہ ہو گیا۔ بچہ ہسپتال میں داخل کر لیا گیا اور بچے کی ماں کو گھر بھیج دیا گیا۔ ناجائز طریقہ سے دنیا میں آنے والے بچے کو بھی پتہ چل گیا کہ دنیا میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں نہ کوئی اس کا گھر ہے نہ کوئی اس کا باپ، پھر اسے زندہ رہنے کا بھی حق نہیں ہے۔ دوسرے روز بچہ ایسی زندگی سے منہ موڑ گیا۔ بچے نے ہسپتال میں دم توڑ دیا اور ہسپتال والوں نے بچے کی لاش کلثوم کی ماں کے حوالے کر دی کیونکہ وہ بچہ کی وارث بنی پھر رہی تھی۔ اس نے ہسپتال والوں کو بتیرا کہا کہ بچے کی میت ہسپتال والے ہی کہیں دفن کر دیں لیکن انہوں نے یہ کہہ کر معذوری کا اظہار کر دیا کہ ان کے ہاں ایسا کوئی انتظام نہیں ہے، آپ اسے گھر لے جائیں۔ کلثوم کی ماں مردہ بچے کو چادر میں لپیٹ کر گھر لے آئی اور گھر آ کر چپکے سے ایک چارپائی پر پڑے، لحافوں کے بیچ رکھ دیا۔ باہر بارش ہو رہی تھی اور سردی کی نئی لہر آئی ہوئی تھی۔ اس نے سوچا کہ بارش تھم جائے گی تو وہ اسے لے جا کر دفن کر دے گی۔

جب گھر والے سب سو گئے تو اس نے کلثوم کو سب ماجرا بتایا، کلثوم ہچکیاں لے کر رونے لگی۔ ماں نے اسے بمشکل چپ کرایا کہ سب جاگ جائیں گے اور قیامت آ جائے گی۔ اب دونوں ماں بیٹی کے سامنے بچہ کی لاش کو ٹھکانے لگانے کا اہم مسئلہ درپیش تھا کہ اس کا کیا کیا جائے۔ بارش تھی کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی، سردی بھی نام پوچھ رہی تھی۔ البتہ اس بارش کا ایک مثبت پہلو یہ تھا کہ سب لوگ گھروں کے اندر بند کمروں میں بیٹھے یا تو آگ تاپ رہے تھے یا گرم لحافوں میں دبکے ہوئے تھے۔ ایسے موسم میں کسی کے باہر نکلنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ کلثوم نے رو رو کر برا حال کیا ہوا تھا۔ یہ رات فی الواقع ان ماں بیٹی پر بہت بھاری تھی۔ باقی گھر والے سب سوئے ہوئے تھے۔ کلثوم بار بار جا کر مرے ہوئے بچے کو اٹھاتی اور اس کو چومتی پھر روتی رہتی۔ کلثوم کی ماں نے سوچا کہ ایسا کب تک چلے گا۔ صبح بچے کی لاش کو کہاں چھپایا جا سکے گا۔ صبح اس گھر میں کہرام مچ جائے گا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ بچے کی لاش کے ساتھ وہ اس گھر میں صبح نہیں ہونے دے گی۔ اس نے ایک ہاتھ میں بچہ اور

دوسرے میں کدال لی اور بھری برسات میں رات کے اندھیرے میں گھر سے باہر نکل آئی۔ وہ بارش میں سردی سے کانپتی چل رہی تھی اور گھر سے کچھ ہی فاصلہ پر جا کر رک گئی، اس نے بچہ کی لاش کو زمین پر رکھ دیا اور کدال سے زمین کھودنی شروع کر دی۔ گو کہ دو دن سے بارش جاری تھی لیکن اتفاق سے اس جگہ کی زمین بے حد پتھریلی تھی۔ اس نے دوسری جگہ پھر تیسری جگہ کوشش کی لیکن گڑھا کھودنے میں کامیاب نہ ہوئی۔ پھر اس نے چوتھی جگہ کوشش کر ڈالی یہ جگہ قدرے نرم نکلی لیکن اب گڑھا کھودنے کی اس میں سکت نہیں رہی تھی۔ وہ عورت ذات تھی ایک دو کدال کے بعد وہ ہانپنے لگتی۔ ادھر مٹی بھی کیچڑ بنی ہوئی تھی۔ آخر اس نے ذرا سی کھدائی کے بعد وہاں بچہ کی لاش رکھی اور اندھیرے میں ٹٹولتی ہوئی اپنی دانست میں مٹی بھی ڈالی لیکن رات کی تاریکی، بارش اور سخت سردی کے باعث اس کا یہ کام ادھورا رہا۔ فی الواقع بچے کی لاش کو دبانے کے لئے گڑھا پورا نہ تھا۔ وہ فقط برائے نام تھا۔ اندھیرے میں اوپر جو مٹی کا کیچڑ ڈالا گیا اسے بھی دھیمی دھیمی مسلسل ہونے والی بارش دھوئے چلی جا رہی تھی۔

اب اس سے زیادہ کچھ کرنے کی اس میں قطعاً ہمت نہ تھی، وہ دو تین مرتبہ پھسل کر گری بھی تھی پھر بھی اس نے اپنی دانست میں کام کر دیا تھا لیکن فی الحقیقت کام ہوا نہیں تھا۔ اس نے واپسی کی راہ لی۔ اس نے جو کچھ بھی محنت کی تھی بارش نے سب پر پانی پھیر دیا۔ بچے کی لاش پر پڑی ہوئی مٹی بارش میں بہہ گئی اور ایسے لگا کہ لاش زمین پر پڑی ہے۔ وہ دفن ہوئی ہی نہ تھی۔ بارش اس سے اگلے روز بھی ہوتی رہی اور پھر رات کو بھی ہوتی رہی تھی کہ کالی کتیا اپنی خوراک کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی اور اس نے جا کر لاش دریافت کر لی۔

صبح ہوئی اور بارش تھم گئی سورج نکل آیا لیکن اس گھر کی صبح محلہ کے دیگر گھروں کی طرح نہیں تھی۔ باہر شور اٹھا کہ محلہ کے قریب ایک جگہ کسی بچے کی ادھ کھائی لاش پڑی ہے۔ کلثوم کی ماں فوراً سمجھ گئی کہ معاملہ گڑبڑ ہو گیا ہے۔ ہر کوئی بھاگ کر لاش دیکھنے جا رہا تھا۔ کلثوم کی ماں نے کلثوم کو سختی سے منع کر دیا کہ وہ کسی بھی حالت میں گھر سے باہر نہ نکلے اور بالخصوص لاش کے بالکل قریب نہ جائے۔ کلثوم کی ماں گھر کے کام کاج میں لگی تھی۔ کلثوم سے رہا نہ گیا وہ ماں سے نظر بچا کر بھاگتی ہوئی لاش کے پاس جا پہنچی۔ ماں نے جب بیٹی کو گھر سے غائب پایا تو اس کے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ بیٹی کہاں گئی ہے۔ لہٰذا وہ بھی پیچھے پیچھے لاش والی جگہ پر پہنچ گئی جہاں کلثوم پہلے سے موجود تھی اور بچے کی لاش سے کپڑا اٹھا رہی تھی۔ کپڑا اٹھاتے ہی اس کے منہ سے بچے کی لاش کی حالت دیکھتے ہوئے زور کی چیخ نکل گئی اور اس نے ہچکیاں لے کر رونا شروع کر دیا۔ ماں نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر تھپٹر جڑ دیئے اور اسے مجمع سے باہر کھینچ کر گھر لے آئی۔

کلثوم کا سارا گھرانہ بدنام ہو گیا، ہر کوئی سکتے کے عالم میں تھا۔ باپ گھر میں کسی سے بات نہیں کر رہا تھا، اس نے چپ سادھ لی تھی۔ بھائی الگ بپھرے پڑے تھے۔ ماں بیٹی سب سے نظریں چرا رہی تھیں۔ کلثوم کا مستقبل تاریک ہو گیا تھا۔ اسے تازندگی اس گھر میں گھٹ گھٹ کے مرنا اور مر مر کے جینا تھا۔ بھائیوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اس بدنامی اور رسوائی کا کیسے ازالہ کریں۔

آخر کلثوم نے اس کا حل نکال لیا اس نے ایک رات کافی مقدار میں خواب آور گولیاں نگل لیں۔ صبح سب نے دیکھا کہ وہ اپنے بستر پر مری پڑی ہے اور تپائی پر خواب آور گولیوں کی خالی شیشی پڑی ہے۔

❋❖❋

شاہِ بطحاؐ کا سفرِ آخرت

"اللہ نے اپنے بندے کو اختیار دیا ہے کہ یا تو دنیا کی چمک دمک اور زیب و زینت میں سے کچھ لے لے یا پھر جو کچھ اللہ کے پاس ہے اس کو اختیار کر لے"۔

☆ .... محمد اعظم

اُن دنوں میں کھیوڑہ ریلوے سٹیشن پر بطور اسسٹنٹ سٹیشن ماسٹر کام کر رہا تھا۔ کھیوڑہ ضلع جہلم کا ایک قصبہ ہے اور نمک کی کان کی وجہ سے پورے ملک میں جانا پہچانا جاتا ہے۔ چونکہ بازار زیادہ بڑا نہ تھا اس لئے ہمیں بعض اوقات خریداری کے لئے ملکوال جانا پڑتا تھا۔ ملکوال جانے کے لئے صرف ٹرین ہی ذریعہ تھی۔ ملکوال دریائے جہلم کے مشرقی کنارے پر اور کھیوڑہ دریائے جہلم کے مغرب کی طرف آباد ہے۔

میں نے ملکوال جانا تھا۔ ایک چھوٹے ڈبے میں چند جانے پہچانے لوگ بیٹھے دیکھے تو میں بھی اُسی ڈبے میں سوار ہو گیا۔ انہی لوگوں میں سٹیشن کے قریب واقع جامع مسجد کے خطیب مولانا تاج ملوک صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ یہ تقریباً ایک گھنٹے کا سفر تھا۔ ٹرین روانہ ہوئی تو کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر بات کا رُخ ایک اچھے خطیب کی طرف مڑ گیا۔

مولانا فرمانے لگے۔ "اچھا خطیب وہ ہے جو چاہے تو مجمع کو ہنسا دے اور چاہے تو مجمع کو رُلا دے"۔

"مولانا! آج ہمیں رُلا دیں تب مانیں گے"۔ ایک ساتھی کہنے لگا۔

مولانا سوچنے لگے اور ڈبے میں خاموشی چھا گئی۔ میں بھی سوچنے لگا دیکھیں آج مولانا کیسے رُلاتے ہیں۔ خاموشی کی وجہ سے صرف ڈبے کے پہیوں کی آواز آ رہی تھی۔

"اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے...... ہر نفس نے موت کا مزا چکھنا ہے"۔ کچھ دیر بعد مولانا نے بات شروع کی۔ "اس حکم میں کسی کے لئے استثنا نہیں ہے چاہے ہم جیسے

گناہگار لوگ ہوں، اولیاء کرامؒ یا انبیاء علیہم السلام ہوں جو بھی دنیا میں بھیجا گیا ہے اُس نے ہر صورت اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہے"۔

"جب دعوت دین مکمل ہو گئی اور جزیرہ نما عرب کے تمام اختیارات مسلمانوں کے ہاتھ آ گئے تو رسول اللہؐ کی بات چیت اور احوال سے ایسی علامات ظاہر ہونے لگ گئیں جن سے معلوم ہوتا تھا کہ آقائے دو جہاںؐ اس حیات مستعار اور اس جہانِ فانی کو اور اس کے باشندوں کو الوداع کہنے والے ہیں۔

یوں تو آپؐ ہر سال 10 دن اعتکاف فرماتے تھے لیکن رمضان 10ھ میں آپ نے 20 دن اعتکاف فرمایا۔ اسی طرح اس سال جبرئیل امینؑ نے آپ کو دو مرتبہ قرآنِ حکیم کا دورہ کرایا جب کہ ہر سال ایک مرتبہ دورہ کرایا کرتے تھے۔

حجتہ الوداع میں آپؐ نے فرمایا۔ "مجھ سے حج کے اعمال سیکھ لو، معلوم نہیں آئندہ حج کر سکوں گا یا نہیں"۔ پھر انہی دنوں سورہ نصر بھی نازل ہوئی جس کی زبان سے اندازہ ہونے لگ گیا کہ اب آپؐ کی دنیا سے روانگی کا وقت قریب ہے۔

صفر 11ھ میں آپ کوہ احد کے دامن میں تشریف لے گئے، وہاں پر شہدائے اُحد کے لئے دعا فرمائی۔ واپس آ کر آپؐ منبر پر فروکش ہوئے اور فرمایا۔ "میں تمہارا میر کارواں ہوں، میں اس وقت اپنا حوض یعنی حوضِ کوثر دیکھ رہا ہوں۔ مجھے زمین کے خزانوں کی کنجیاں عطا کی گئی ہیں۔ مجھے تم سے یہ خوف نہیں کہ تم شرک کرو گے بلکہ یہ خوف ہے کہ تم دنیا طلبی میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرنے لگ جاؤ گے"۔

اور پھر ایک رات آپؐ بقیع تشریف لے گئے اور ان کے لئے دعائے مغفرت فرمائی۔ صحابہ کرامؓ اور اُمہات المومنینؓ آپؐ کے معمولات کا بغور جائزہ لے رہے تھے اور انہیں اندازہ ہو رہا تھا کہ اب محبوب خداؐ کا اپنے محبان سے بچھڑنے کا وقت قریب سے قریب تر آتا جا رہا ہے۔

29 صفر 11ھ کو آقاؐ ایک جنازے میں شرکت کے لئے بقیع تشریف لے گئے، واپسی پر راستے میں سر میں درد ہونے لگا اور گھر پہنچنے تک تیز بخار ہو گیا۔ بخار اتنا تیز تھا کہ سر پر بندھی پٹی کے اوپر سے بھی حرارت محسوس ہو رہی تھی۔ یہ مرض کا آغاز تھا اور یہ مرض تقریباً 12 دن قائم رہی اور آپؐ نے 11 دن تک اسی بیماری کی حالت میں مسجد نبوی میں نماز پڑھائی۔

اب میں آپ سب کو بتاتا ہوں کہ حضورؐ کی زندگی کا آخری ہفتہ کیسے گزرا۔ طبیعت مبارک روز بروز بوجھل ہوتی جا رہی تھی۔ آپؐ ازواج مطہراتؓ سے پوچھتے میں کہاں رہوں گا؟ ازواج مطہراتؓ آپؐ کے اس سوال کا مطلب سمجھ گئیں اور یک زبان عرض کی یا رسول اللہؐ آپ جہاں چاہیں رہیں۔ چنانچہ حضورؐ اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حجرے میں منتقل ہو گئے۔ حجرے کی طرف جاتے ہوئے حضرت فضل بن عباس اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے سہارا دے کر پہنچایا۔ صورت ایسی تھی آپ کے سر مبارک پر پٹی بندھی تھی اور چلنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ چنانچہ آپؐ نے زندگی کے آخری ایام اسی حجرے میں گزارے۔

وفات سے پانچ دن قبل چہار شنبہ یعنی بدھ کے روز جسم مبارک کی حرارت میں شدت آ گئی اور تکلیف بڑھ گئی۔ یہاں تک کہ غشی طاری ہونے لگی۔ جب آپؐ نے کچھ بہتری محسوس کی تو مسجد میں تشریف لے گئے۔ منبر پر تشریف فرما ہوئے اور فرمایا۔ "یہود و نصاریٰ پر اللہ کی لعنت کہ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مساجد بنا لیا۔ تم لوگ میری قبر کو بت نہ بنانا کہ اُس کی پوجا کی جائے۔ پھر آپؐ نے خود کو قصاص کے لئے پیش کیا کہ اگر آپ نے

کسی سے کوئی زیادتی کی ہو تو وہ بدلہ لے لے۔ پھر آپؐ نے انصار کے متعلق وصیت فرمائی اور فرمایا۔ ''میں تمہیں انصار کے بارے میں وصیت کرتا ہوں کیونکہ وہ میرے قلب و جگر کی طرح ہیں، ان کے نیکوکار سے قبول کرنا اور خطاکار سے درگزر کرنا''۔ پھر آپؐ نے فرمایا۔

''اللہ نے اپنے بندے کو اختیار دیا ہے کہ یا تو دنیا کی چمک دمک اور زیب و زینت میں سے کچھ لے لے یا پھر جو کچھ اللہ کے پاس ہے اس کو اختیار کرلے''۔ حضرت ابوخدریؓ کا بیان ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ یہ بات سن کر رونے لگے اور فرمایا۔ ''ہم ماں باپ سمیت آپؐ پر قربان''۔ ابوخدریؓ کا بیان ہے کہ بندے سے مراد خود حضورؐ تھے اور ابوبکرؓ ہم سب سے زیادہ صاحب علم تھے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ مجھ پر اپنی رفاقت اور مال میں سب سے زیادہ صاحب احسان ابوبکرؓ ہیں اگر میں اللہ کے سوا کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکر کو خلیل بناتا۔

اس سے اگلے دن میرے آقاؐ نے وصیت فرمائی کہ یہود و نصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے نکال دینا اور وفود کی اسی طرح نوازش کرنا جس طرح حضورؐ فرماتے تھے۔ یہ جمعرات کا دن تھا اُس دن کی مغرب کی نماز تک کی نمازیں آپؐ نے بیماری کے باوجود خود ہی پڑھائیں۔

عشاء کے وقت صورت ایسی تھی کہ آپؐ اٹھ کر مسجد جانے کی طاقت محسوس نہیں کر رہے تھے۔ آپؐ نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کیا لوگوں نے عشاء کی نماز ادا کر دی ہے؟ انہوں نے عرض کی لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ آپؐ نے پانی منگوا کر غسل کیا اور پھر اٹھنے کی کوشش کی لیکن غشی طاری ہوگئی۔ تین دفعہ یہی صورت پیش آئی تب آپؐ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو پیغام بھیجا کہ وہ نماز پڑھائیں۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضورؐ کی حیات طیبہ کے دوران جو نمازیں پڑھائیں ان کی تعداد سترہ ہے۔

شجرہ مبارک

محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مُرہ بن کعب بن لوئی بن غالب۔

ہفتہ کے روز آقاؐ نے طبیعت بہتر محسوس کی اور سہارا لے کر مسجد تشریف لے گئے اُس وقت حضرت ابوبکرؓ امامت کر رہے تھے۔ آپ کی آمد محسوس کر کے وہ پیچھے ہٹنے لگے تو آپؐ نے اشارے سے روک دیا اور امامت جاری رہی۔ حضورؐ بائیں طرف بیٹھ گئے اور بیٹھ کر نماز مکمل کی۔

اُس سے اگلے روز یعنی اتوار کو آپؐ تمام غلاموں کو آزاد فرمادیا، آپ کے پاس سات دینار موجود تھے، وہ صدقہ کر دیے۔ اپنے تمام ہتھیار مسلمانوں کو ہبہ فرما دیئے''۔

ٹرین چلی جارہی تھی، ہم سب بڑے انہماک کے ساتھ مولانا کی گفتگو سن رہے تھے۔ مولانا تھوڑی دیر کے لیے رکے اور پتہ لگتا تھا کہ مولانا کی گفتگو اب اپنے اختتام تک پہنچنے والی ہے۔ مولانا نے اپنی سانس درست کی اور پھر بات شروع کردی۔

''دوشنبہ یعنی پیر کا روز آگیا، صبح سویرے کا وقت تھا مسجد نبوی میں نماز فجر ادا کی جارہی تھی، حضرت ابوبکر صدیقؓ امامت فرمارہے تھے۔ حضورؐ نے حجرے کا پردہ اٹھایا، نماز میں مصروف صفیں باندھے اپنے صحابہ پر نظر پڑی یہ منظر دیکھ کر حضورؐ کے لبوں پر تبسم آگیا۔ پردہ ہٹنے سے صحابہ کرامؓ نے محسوس کیا کہ شاید حضورؐ مسجد میں تشریف لانا چاہ رہے ہیں، قریب تھا کہ حضرت ابوبکرؓ امامت سے پیچھے ہٹ جاتے اور صحابہؓ اس خوشی میں نماز توڑ دیتے حضورؐ نے سب کو اشارے سے منع فرما دیا اور پردہ گرا

دیا۔ اس کے بعد حضورؐ پر کسی دوسری نماز کا وقت نہیں آیا۔

''سورج نکل آیا چاشت کا وقت ہو گیا۔ آپؐ نے اپنی صاحبزادی حضرت سیدہ فاطمہؓ کو یاد فرمایا ان سے سرگوشی کی تو وہ رونے لگیں پھر حضورؐ نے قریب بلا کر سرگوشی کی تو وہ ہنسنے لگیں۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ بعد میں جب حضرت فاطمہؓ سے رونے اور ہنسنے کا سبب پوچھا تو سیدہؓ نے فرمایا۔ پہلے حضورؐ نے فرمایا کہ وہ اس مرض کے سبب وفات پا جائیں گے اور دوبارہ فرمایا کہ آپ اہل و عیال میں سب سے پہلے آپ کو آملیں گی۔ اس کے بعد حضورؐ نے حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو قریب بلایا دونوں بچوں کو چوما اور دونوں کے بارے میں خیر کی وصیت فرمائی پھر حضورؐ نے ازواج مطہراتؓ کو بلایا اور ان سب کو وعظ و نصیحت فرمائی پھر آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو وصیت فرمائی اور فرمایا۔ ''نماز...... نماز اور تمہارے زیر دست یعنی لونڈی غلام'' یہ الفاظ کئی دفعہ دہرائے۔ یہاں پہنچ کر مولانا پھر رک گئے ان کی آواز بھرائی تھی لگتا تھا وہ بڑی مشکل سے اپنے آنسو روک رہے ہیں۔ ہم سب کی بھی اسی طرح کی کیفیت تھی یعنی آنسو پلکوں پر رکے ہوئے تھے اور کسی وقت بھی وہ بادو باراں بن سکتے تھے۔

مولانا صاحب پھر گویا ہوئے اور فرمایا۔ ''اور پھر نزع کا وقت آ گیا حضرت عائشہ صدیقہؓ کا بیان ہے کہ میں نے حضور کو اپنے اوپر ٹیک لگوا دی۔ اسی دوران حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکر تشریف لائے ان کے ہاتھ میں مسواک تھی۔ حضور نزع کی حالت میں بھی ہوش میں تھے اور مسواک کی طرف دیکھ رہے تھے میں نے اپنے بھائی سے مسواک لے کر نرم کی اور حضور کو پکڑا دی۔ پاس کٹورے میں پانی موجود تھا، حضورؐ نے اچھی طرح مسواک کی اور کٹورے میں ہاتھ ڈال کر چہرہ مبارک تر کرتے جاتے اور فرماتے جاتے اللہ کے سوا کوئی معبود

نہیں موت کے لئے سختیاں ہیں۔

مسواک سے فارغ ہو کر حضورؐ نے ہاتھ کی انگلی اٹھائی اور نگاہ چھت کی طرف بلند فرمائی دونوں ہونٹوں میں حرکت ہوئی حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں میں نے کان قریب کرلیا، آپؐ فرما رہے تھے۔ ''ان انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ہمراہ جنہیں تُو نے انعام سے نوازا۔ اے اللہ مجھے بخش دے مجھ پر رحم فرما اور مجھے رفیق اعلیٰ میں پہنچا دے۔ اے اللہ رفیق اعلیٰ''۔ آخری نقرہ تین بار دہرایا اور ہاتھ جھک گیا۔ آپ رفیق اعلیٰ سے جالاحق ہوئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

اس دن ربیع الاوّل کی 12 تاریخ سن 11 ہجری اور دن پیر کا تھا۔ آپ کی عمر مبارک 63 سال 4 دن تھی۔ اس حادثۂ دل فگار کی خبر فوراً پھیل گئی، مسلمانوں پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہر شخص کے آنسو رواں تھے اور ہر گھر سے سسکیوں کی آوازیں آ رہی تھیں''۔ مولانا خاموش ہو گئے۔

میں نے آنسوؤں کے آگے جو بند باندھ رکھا تھا وہ ٹوٹ گیا۔ میرے آنسو رواں ہو گئے۔ میرے ساتھ بیٹھے ساتھیوں کی بھی یہی کیفیت تھی، میں نے مولانا کی طرف نظر اٹھائی ان کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو رہی تھی اور وہ خود پر ضبط کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

مولانا نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا۔ انہوں نے رندھی ہوئی آواز میں اپنی گفتگو کا دوبارہ آغاز کیا۔ کہنے لگے۔ ''حضرت انسؓ کا بیان ہے جس دن حضورؐ مدینہ تشریف لائے اس سے بہتر اور تابناک دن کوئی نہ تھا اور جس دن آپ دنیا سے رخصت ہوئے اُس دن سے زیادہ تاریک دن بھی ہماری زندگی میں نہیں آیا۔ سیدہ فاطمہ الزہراؓ فرطِ غم سے رو رہی تھیں اور فرما رہی تھیں۔ ''ہائے ابا جان جنہوں نے پروردگار کی پکار پر لبیک کہا جن کا ٹھکانہ جنت الفردوس ہے۔ ہائے ابا جان ہم جبرئیل کو آپ کی وفات کی خبر دیتے ہیں''۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کو وفات کی خبر ملی تو حجرہ میں آئے اُس وقت حضورؐ کا جسد مبارک دھاری دار یمنی چادر میں ڈھکا ہوا تھا۔ جناب ابوبکرؓ نے رخِ انور سے چادر ہٹا کر چوما اور فرمایا۔ ''میرے ماں باپ آپؐ پر قربان، اللہ آپؐ پر دو موت جمع نہیں کرے گا۔ جو موت لکھ دی گئی تھی وہ آ چکی''۔ آپ کی جانشینی پر صحابہ کرامؓ میں اختلاف ہوا لیکن پھر جلد ہی سب حضرت ابوبکرؓ کی خلافت پر متفق ہو گئے۔

اگلے روز یعنی منگل کو حضورؐ کے جسدِ پاک کو کپڑوں سمیت غسل دیا گیا اور پھر تین سفید چادروں میں آپ کو کفن پہنا دیا گیا۔ آپ کی آخری آرام گاہ کے لئے جس مقام پر آپ کی وفات ہوئی اُسی جگہ کو منتخب کیا گیا۔ جنازہ کا یہ انتظام تھا کہ دس دس صحابہؓ باری باری آتے بغیر امام کے جنازہ پڑھتے اور واپس تشریف لے جاتے۔ سب سے پہلے بنو ہاشم نے پھر مہاجرین پھر انصار اس کے بعد عورتوں اور بچوں نے نماز جنازہ پڑھی۔

بدھ کی رات کو آپؐ کے جسدِ پاک کو سپردِ خاک کر دیا گیا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)۔

وہ صادق و امین، گالیاں سن کر بھی دعا دینے والا۔ دشمنوں کو بھی معاف کر دینے والا، وہ چراغِ روشن جس کی روشنی آج دنیا کے ہر کونے میں پہنچ چکی ہے۔ اپنے اُس مشن کی تکمیل کر کے جو اللہ تعالیٰ نے اُنؐ کے ذمہ لگایا تھا دنیا کو چھوڑ گیا''۔

مولانا نے بات ختم کی تو گاڑی ملکوال سٹیشن کی حدود میں داخل ہو رہی تھی، ہم سب نے منہ ہاتھ دھو کر اپنے چہروں کو درست کیا اور اپنی اپنی منزل کی طرف چلے گئے۔

O▼
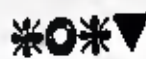
طب وصحت

مریض دوائی منگوانے کے لئے اپنا حوالہ نمبر ضرور لکھا کریں
رپورٹس اور خطوط پر اپنا موبائل نمبر لازماً لکھیں

دستِ شفاء

چکروں کی پُراسرار بیماری کا راز

ڈاکٹر رانا محمد اقبال (گولڈ میڈلسٹ)
0321-7612717
ڈی۔ ایچ۔ ایم ایس (DH.Ms)
ممبر پیرامیڈیکس ایسوسی ایشن پنجاب
ممبر پنجاب ہومیو پیتھک ایسوسی ایشن
شعبۂ طب ونفسیات

اکثر لوگ مجھ سے ایک ہی سوال بار بار کرتے ہیں۔ ”جناب ڈاکٹر صاحب! مجھے فلاں فلاں مرض ہے اس کی دوا بتا دیں یا بھیج دیں“۔ تو جناب بات دراصل یہ ہے کہ ڈاکٹری کسی صابن کی ٹکیہ یا چائے کی پتی یا شربت کا نام نہیں ہے کہ کسی دُکان پر جاؤ اور کہو کہ مجھے بپریم چائے یا لکس کا صابن چاہئے تو دُکاندار آپ کو اس برانڈ کی وہ چیز نکال کر دے دے گا۔ آپ نے چیز لی، پیسے دیئے بات ختم۔ اگرچہ اکثر ڈاکٹر یا حکیم یا ہومیو پیتھک ابھی تک ایسے ہی کام چلا رہے ہیں اور اس میں انہیں آسانی بھی بہت ہے مگر آپ خود سوچیں کہ جب ایک گاڑی خراب ہوتی ہے تو ہم کسی ماہر مکینک کے پاس جاتے ہیں تو وہ پہلے گاڑی کو کھول کر چیک کرتا ہے۔ تاکہ فالٹ (خرابی کی وجہ) ڈھونڈ لے اور پھر اس کی مرمت کرے۔ کیونکہ گاڑی خراب ہونے کی کئی ایک وجوہات ہوتی ہیں اور انسان بھی تو ایک قسم کی مشین ہی ہے۔ تو پس ثابت ہوا کہ جب تک ہم موجودہ طریقوں (Recently Available Methods) کی مدد سے اصل وجوہات کا پتہ نہیں چلاتے، کوئی علاج بھی 100% مؤثر ثابت نہیں ہو سکتا اور اسی وجہ سے اکثر معالجین کے کیس خراب ہوتے ہیں۔ البتہ کبھی تیر تکا بھی لگ جاتا ہے مگر اکثر نہیں لگتا۔ لہٰذا بہتر مشورہ یہ ہے کہ مریض کو تسلی کے ساتھ چیک کریں، ضروری رپورٹس ملاحظہ کریں اور مریض کی اندرونی و بیرونی کیفیات کو مدنظر رکھ کر اور Reasons کے ساتھ Co-Relate کر کے دوا دیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ بہترین رزلٹ آئیں گے۔ ہاں ضروری احتیاطیں بھی مریض کو لازمی بتائیں

تاکہ شفایابی کا عمل تیز ہو سکے۔

اس ماہ جو کیس ہم آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں وہ کیس کی نسبت میری زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے۔ یہ واقعہ کچھ اس طرح ہے کہ آج سے کافی عرصہ قبل محکمہ انکم ٹیکس فیصل آباد میں ایک بہت اہم سرکل میں تعینات تھا۔ میری عمومی صحت بہت اچھی تھی، خوراک بھی بہت اچھی تھی نیز یہ کہ میں اس وقت بہت خوش لباس بھی تھا۔ بہر حال جلد ہی قریبی عزیزوں میں شادی بھی ہو گئی، وہ تمام گھرانہ بہت مذہبی اور خوش اخلاق ہے۔ شادی کے تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد مجھے اچانک چکر (Vertigo) کا مرض شروع ہو گیا اس وقت گرمیوں کا سیزن تھا۔ بظاہر اس مرض کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی نہ کسی قسم کا سر درد نہ بخار نہ نزلہ زکام نہ بے خوابی مگر میں جونہی نہا کر نکلتا تو سر چکرانے لگتا اور آنکھوں کے سامنے سیاہ پردہ سا آ جاتا۔ چند ایک ادویات بھی لی گئیں۔ بادام اور ہر طرح کے خمیرے وغیرہ بھی آزمائے گئے کئی دم درود بھی کرائے گئے اور صدقے دیئے گئے مگر رزلٹ زیرو بٹا زیرو اور اب مجھے میرے رشتہ دار دبے دبے لفظوں میں جادو اور عملیات کے بارے میں اپنے خدشات کا اظہار کرنے لگے مگر اس وقت تک میں ان باتوں کا اتنا قائل نہیں تھا۔ ویسے بھی ہم جو بات عقل میں نہ آئے اس کو بلا تامل جادو سے منسوب کر دیتے ہیں اصل ماہرین سے معذرت اور کاروباری / پیشہ ور حضرات پھر اپنی چاندی بناتے ہیں جھوٹ باتیں بنا کر۔

سارے نسخے اور ٹوٹکے آزما آزما کر تھک گئے مگر چکر ہیں کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہے۔ یہاں میں وہ مقولہ استعمال کروں تو بے جا نہ ہوگا کہ "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی"۔ سب حکیم ڈاکٹر عاجز آ گئے کہ پتہ نہیں یہ کیا مسئلہ ہے۔ کوئی طاقت کی گولیاں دے رہا ہے، کوئی انجکشن لگا رہا ہے، کوئی روغن زیتون، بادام روغن کدو کی مالش کرا رہا ہے الغرض تقریباً چار ماہ اس معاملے نے طول کھینچا۔ بالآخر ایک دن اللہ تعالیٰ نے ایک راہ دکھا دی۔ میں صبح شام سیر کا عادی ہوں اکثر بلاناغہ سیر کو جاتا ہوں۔ وہ جمعہ کی ایک بے حد گرم شام تھی اگرچہ سر چکرا بھی رہا تھا مگر میں آہستہ آہستہ امرودوں کے ایک باغ کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ یاالٰہی یہ ماجرا ہے کیا؟ دماغ ایک نکتے پر سوچ رہا تھا کہ پہلے مجھے چکر نہیں آتے تھے مگر اب بلاناغہ آ رہے ہیں تو اس سے ایک ہی بات ثابت ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ میری زندگی کے معمولات میں کوئی ایسی نئی چیز داخل ہوئی ہے جو پہلے نہ تھی بہت دیر تک سوچتا رہا اور آخر دماغ میں ایک جھماکا ہوا اور مجھے اس بات کا جواب مل گیا اور جواب بڑا حیران کن تھا یعنی کہ "Shampoo"۔ جی ہاں وہی جو ہم روزانہ بڑی خوشی سے استعمال کرتے ہیں اور یہ میری زندگی میں کیسے آیا یہ بھی تفصیل آپ کو بتا دیتا ہوں۔

میری شادی کے تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد ہمارے ہاں پہلے بچے کی آمد ہوئی تو گھر والوں نے کہا کہ اس کے لئے ایک اچھا سا "ٹیلکم پاؤڈر" لے کر آئیں۔ میرا دفتر D گراؤنڈ پیپلز کالونی میں تھا وہاں اس وقت بہت سٹینڈرڈ کی دکانیں تھیں اور اب بھی ہیں۔ میں ایک واقف کار کے پاس گیا۔ اس نے مجھے ایک بہت اچھی کمپنی کا ٹیلکم پاؤڈر دیا (غالباً Eden کمپنی تھی) اور اس کے ساتھ ہی ایک منی سائز کا Egg Shampoo بھی فری ملا۔ جب گھر والوں نے استعمال کیا تو اس کو بال نکھارنے میں بہت اچھا پایا۔ یہ شیشی 2 ہفتے میں ختم ہو گئی تو نئی ذرا بڑی (میڈیم سائز کی) آ گئی۔ اب تو گھر کے سب لوگ اسے پسند کرنے لگے حالانکہ ہم سارے لوگ اس سے قبل صرف صابن ہی استعمال کرتے تھے۔ بہر حال اب میں نے سوچا کہ کون بار بار خریدنے جائے پھر ایک فیملی سائز لارج پیک لے آیا اور اسی دوران یہ

چکروں والا مسئلہ بھی شروع ہو گیا۔ پہلے بہت ہلکا تھا پھر اس کے بعد شدید ہو گیا۔ اب اصل وجہ ذہن میں آ گئی تھی۔

میں گھر واپس آیا اور چپکے چپکے دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ آج سے شیمپو کی چھٹی اور پھر دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ میں نے رات کو سر میں ہلکا سا سرسوں کا تیل لگانا شروع کیا اور ساتھ دہی کا استعمال بڑھا دیا۔ رات کو کبھی دہی کی لسی سے سر بھی دھو لیتا۔ آپ یقین کریں کہ کسی دوا کے بغیر ہی ایک ہفتے کے دوران 80% فیصد چکر آنے غائب ہو گئے۔ میں نے بھی اللہ کا شکر ادا کیا اور پھر گھر والوں کو اصل بات بتا دی کہ اب میں ٹھیک ہوں فکر نہ کریں ورنہ وہ اس دوران کئی نئے عاملوں کو ٹریس کر چکے تھے۔ اب میں نے ساتھ Natrum Mur-30 اور Kali Phos-12 کا بھی استعمال شروع کر دیا اور اس طرح سارا معاملہ 2 ماہ میں کلیئر ہو گیا۔

میں تمام معالجین سے دوبارہ درخواست کروں گا کہ اس واقعے کو مدِنظر رکھ کر اصل وجہ جاننے کے بعد ہی علاج کیا کریں اللہ کامیابی ضرور دے گا۔

اب میں اسی سے ملتا جلتا ایک اور واقعہ بھی قارئین کے روبرو پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اگرچہ میڈیسن کے بارے میں نہیں لیکن روزمرہ زندگی میں بہت کام آ سکتا ہے۔

فیصل آباد میں شادی کے فوراً بعد میں نے کچھ رقم جمع کر کے یاماہا موٹر سائیکل 80CC لے لی تاکہ دفتر آنے جانے میں آسانی رہے (یہ جاپانی گاڑی ہے جس کا اس وقت خرچہ بہت کم اور رزلٹ دوسروں کے مقابلے میں بہت اچھا تھا) اس گاڑی نے مجھے کبھی تنگ نہیں کیا تھا مگر تقریباً 3 سال کے بعد اس میں ایک عجیب (Fault) پیدا ہو گیا جو کہ کسی مکینک کے دماغ میں نہ آتا تھا، وہ یہ کہ گاڑی چلتے چلتے اچانک بند ہو جاتی۔ پلگ، رنگ، کرنٹ، پیٹرول ہر چیز ٹھیک۔ میں نے گاڑی کا ایک ہی مکینک رکھا جو کہ بہت محنتی اور قابل تھا۔ اس کی طرف سے مجھے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ مگر اب وہ بھی پریشان ہونے لگا۔ وہ چیک کرتا مگر کوئی چیز نہ ملتی۔ گاڑی چلتی اور اچانک کچھ دیر کے بعد بغیر کسی وجہ کے بند۔ سب حیران و پریشان۔ آخر میں نے اوپر والا فارمولا سوچا (کہ ضرور کوئی ایسی تبدیلی یا بات ہے جو پہلے نہ تھی مگر اب مستقل گاڑی کے ساتھ ہے۔ جو کہ اس پریشانی کا سبب بن رہی ہے۔ آخر بہت سوچنے کے بعد جو بات سامنے آئی وہ یہ تھی کہ چند دن قبل میں اچانک اپنے ایک سابقہ کلاس فیلو سے ملا جو کہ اس وقت آئل وغیرہ کا کام کرنے لگا تھا، اس نے شاید اخلاقاً ہی کہا کہ "یہ آپ کی اپنی دکان ہے جب بھی موبل آئل کی ضرورت ہو آ جائیں۔ اس نے ایک بار تو خود ہی اچھی کوالٹی کا آئل سائیڈ والے ڈبے میں ڈال دیا۔ جب میں دوسری بار اس کے پاس گیا تو اس نے آنکھ کے اشارے سے یا کسی طرح ملازم کو کہہ دیا ہو گا، تب اس نے کوئی اور آئل ڈال دیا۔

جب یہ بات میرے ذہن میں آئی تو میں فوراً گاڑی لے کر اپنے مکینک کے پاس گیا اور اسے آئل چیک کرنے کا کہا۔ اس نے آئل چیک کیا اور پتا چلا کہ یہ موٹا آئل ہے جو کہ بڑی گاڑیوں میں ڈالتے ہیں۔ میں نے اسے کہا کہ یہ نکال کر پھینک دو اور کاربوریٹر بھی کھول کر چیک کرو کہ اس نے تمام نالیاں بند کر دی ہوں گی۔ جب کاربوریٹر کھولا تو یقین کریں کہ جمے ہوئے پنیر کی طرح اس کی حالت تھی اور تمام نالیاں بلاک تھیں جس کی وجہ سے پیٹرول انجن میں نہیں جاتا تھا اور گاڑی بند ہو جاتی تھی۔ میں نے کاربوریٹر کو پیٹرول سے دھلوایا اور نیا موبل آئل ڈالا پھر کبھی وہ شکایت نہ ہوئی۔

جو حرکت میرے اس ہم جماعت نے کی تھی اس کے بارے میں آپ جو رائے مناسب ہو قائم کر لیں، مجھے

کوئی اعتراض نہیں۔ مگر مجھے ایک بات کا بے حد دکھ ہے کہ اس کے چہرے پر داڑھی تھی اور نمازی ہونے کے باوجود اس کی اس حرکت نے مجھے بہت دکھ دیا اور میں نے اس سے ملنا ہی چھوڑ دیا کیونکہ میں کوئی فقیر نہ تھا صاحب حیثیت تھا اور کوئی مالی تنگی نہ تھی نہ میں نے اسے پیسے دینے سے انکار کیا تھا وہ مجھے صاف بھی کہہ سکتا تھا کہ اس کا حق تھا کہ اپنے مال کے پیسے لیتا مگر منافقت نہ کرتا۔

''حکایت'' کے ریگولر قارئین کرام جنھوں نے میرے کیس دقتاً فوقتاً پڑھے ہیں ان کو اچھی طرح یاد ہوگا کہ میں نے اکثر ایسے کیسوں میں شفایابی میں کامیابی حاصل کی ہے جن کو دیگر معالجین نے ہر طرح کے علاج کے بعد لاعلاج قرار دیا تھا مگر یہاں اللہ تعالیٰ نے ان کو شفاء عنایت فرمائی تو اس سے کیا بات واضح ہوتی ہے؟ یہی کہ ان کی خود ساختہ تھیوریاں اور فارمولے (طریقہ علاج) ان کیسوں کے بارے میں ٹھیک نہ تھا اور نہ ہی ان کی ادویات وہاں تک کام کر سکتی تھیں اور مزید یہ کہ ان کو مزید تحقیقات کی ضرورت ہے۔ میں بھی ہر کیس میں اچھی طرح غور کرنے کے بعد ہی دوا دیتا ہوں اور بعد میں بھی Improvement کے لئے سوچتا رہتا ہوں کہ مزید کیا کرنا چاہئے۔

(1) میرا سب سے اوّل کیس مسز فوزیہ مسیح کا تھا فیصل آباد میں جس کی دونوں ٹانگیں کراس دائز (Crosswise) جڑ گئی تھیں اور اسے بھی لاعلاج کہا گیا تھا۔ وہ چار ماہ میں ٹھیک طرح چلنے لگی۔

(2) اُسامہ (جو کہ ایک سکول ٹیچر کا بیٹا ہے) انتڑیوں سے خون آتا تھا۔ پانچ ماہ کے علاج سے شفایاب ہوا۔

(3) خدیجہ بیٹی کا کیس جو کہ C.P. تھی۔ دو سال میں 80% سے زیادہ ٹھیک ہوا۔

(4) باجی آمنہ لاہور کا کیس جس میں سب ڈاکٹرز نے جوڑ تبدیل کرنے کا حتمی مشورہ دیا تھا۔ 6 ماہ میں یہ تکلیف رفع ہوئی۔

وضاحت

پچھلے شمارہ میں مرحوم ڈاکٹر گلزار احمد صاحب کی کتاب ''سحر ہومیوپیتھی'' کے بارے میں چند باتیں لکھی گئی تھیں۔ اس کے بعد محترم جناب ڈاکٹر آر اے امتیاز صاحب نے ہمیں فون کر کے کچھ حقائق سے آگاہ کیا اور یہ بھی بتایا کہ مذکورہ کتاب میں ڈاکٹر صاحب کی رضامندی سے خاصی تبدیلیاں کی گئی تھیں اور مصنف کا نام و پتہ بھی ڈاکٹر صاحب کی مرضی سے تبدیل کیا گیا تھا نیز ان کا مقصد ہومیوپیتھی کی خدمت اور فلاح انسانیت کے سوا کچھ نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے بیان کردہ حقائق کی روشنی میں چونکہ اب ساری بات کلیئر ہو گئی ہے لہٰذا اگر ان کی کوئی دل آزاری ہوئی ہو تو میں ان سے معذرت خواہ ہوں اور امید کرتا ہوں کہ وہ آئندہ بھی اسی جوش و جذبے کے ساتھ انسانیت کی خدمت کے لئے کوشاں رہیں گے۔

○

مریض توجہ فرمائیں!

ہماری بار بار گزارش کے باوجود دوسرے شہروں سے آنے والے مریض فون پر وقت لئے بغیر آجاتے ہیں جس کی وجہ سے ہمیں اور مریضوں کو پریشانی اٹھانی پڑتی ہے۔ پچھلے ہفتے ایک صاحب ٹوبہ ٹیک سنگھ سے بغیر ٹائم لئے چل پڑے اور آدھے راستے میں آکر فون کیا کہ میں آرہا ہوں۔ اس دن ڈاکٹر صاحب کی چھٹی تھی اور وہ ضروری کام سے فیصل آباد جا رہے تھے لیکن اس مریض کی خاطر آدھے راستے سے واپس پلٹ آئے۔ اس طرح ان کا وقت اور پیسہ برباد ہوا۔ براہ کرم ان باتوں کا خاص خیال رکھیں۔ (عارف محمود)

گمشدہ جنت

یہ دنیا ایک مکمل تماشا ہے۔ اس سٹیج پر ہر شخص اپنے اپنے حصے کا
کردار ادا کر کے گزر جاتا ہے۔ ہمارے سماج، سوسائٹی اور
معاشرے کے فرسودہ نظام کے موضوع پر ایک سو فیصد سچی کہانی

حفیظ بشر

ہمارے گاؤں میں چوہدری حشمت خان کا بہت نام اور خوب ڈنکا بجتا تھا۔ دور دور، آس پاس کے دیہات تک اس کی طاقت، شہرت اور رعب داب کے خوب چرچے تھے اور ڈھیروں اراضی اس کی ملکیت تھی۔ اس کے علاوہ جہاں کہیں بھی اسے گاؤں میں یا اردگرد دیہات میں کوئی زمین کا خالی یا متنازعہ ٹکڑا نظر آتا تو وہ اس پر بھی اپنا قبضہ جمانے میں دیر نہ کرتا۔ تھانے، کورٹ کچہری میں بھی اس کی خوب رسائی تھی۔ عرف عام میں لوگ اسے حشمت خان تلوار کے نام سے پکارتے کیونکہ اس کی ہر بات میں تیز تلوار کی دھار جیسی کاٹ ہوتی۔ اس کی سوچ فکر، کردار اور عمل بھی ہر ایک کو زہر آلود خنجر کی طرح گھائل کر دیتا۔ وہ ایک اکھڑ دماغ اور جاہل انسان تھا۔ لہٰذا گاؤں کے لوگ اسے چوہدری حشمت خان کی بجائے تلوار کے نام سے یاد کرتے۔

اس کے دو بیٹے تھے۔ بڑا بیٹا پڑھ لکھ کر وکیل بن گیا۔ نام اس کا ہارون الرشید چوہدری تھا۔ چھوٹا بیٹا جس کا نام چوہدری قیصر رشید تھا۔ وہ میٹرک تک تعلیم یافتہ تھا اور اس کے ذمہ زمینوں کی دیکھ بھال تھی۔ حشمت خان کی کوئی بیٹی نہ تھی اور نہ ہی وہ بیٹی کا طلبگار تھا۔ وہ اکثر کہتا کہ بیٹی کے وجود سے جدی ملکیت یا جائیداد پر زد پڑتی ہے جو تقریباً تقریباً ہر زمیندار کی سوچ ہے۔

اس کے گاؤں میں پرائمری سکول کا ایک ٹیچر بھی رہتا تھا۔ دو اس کے بیٹے تھے اور تین بیٹیاں۔ بڑی بیٹی سکینہ بشیر نے بی اے پاس کر رکھا تھا۔ باقی بچے بھی زیر تعلیم تھے۔ گاؤں میں لوگ اسے ماسٹر جی کے نام سے پکارتے تھے۔ اس کے اصل نام بشیر احمد سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ گاؤں میں ہر چھوٹا بڑا اسے بہت زیادہ احترام اور عزت دیتا۔ گاؤں کے دیگر بچوں کو بھی تعلیم کے زیور سے آراستہ کرتا تھا اور غریب نادار بچوں کی فیس اور کتابیں بھی اپنی جیب سے ادا کرتا تھا۔ ماسٹر بشیر احمد نہایت ہی شریف النفس انسان تھا لیکن تھا۔ بے خوف اور ترش مزاج تھا۔ جب بھی اس کی گاؤں کے لوگوں سے بات چیت ہوتی تو وہ انہیں تاکید کرتا کہ اپنے بچے، بچیوں کو زیادہ سے زیادہ تعلیم دلائیں۔ کچھ لوگ تو اسے وقت کا سرسید بھی کہتے۔ اس طرح شب و روز گزرتے چلے گئے۔

چوہدری ہارون جو چوہدری حشمت خان کا بڑا بیٹا تھا، وہ اور ماسٹر بشیر احمد کی بڑی بیٹی سکینہ دونوں ایک عرصے سے پیار محبت میں گرفتار تھے لیکن خوف کے مارے کوئی بھی اس بات کا برملا اظہار نہ کرتا کہ کہیں یہ بات بڑے چوہدری حشمت خان تک نہ جا پہنچے اور لڑائی جھگڑا اور خون خرابہ نہ ہو جائے اور اس صورت میں ماسٹر بشیر احمد چوہدری حشمت خان کی زد میں آ سکتا ہے اور اسے نقصان بھی ہو سکتا ہے۔ دوسرے گاؤں کی بیٹی سب کی بیٹی ہوتی ہے۔ گاؤں کے لوگ ماسٹر بشیر احمد کی عزت کو پامال ہوتا نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔

دوسری طرف، چوہدری ہارون الرشید اور سکینہ دونوں نے اس خوف سے باہر نکلنے کا فیصلہ کر لیا اور ایک دوسرے کے ساتھ جینے مرنے کے عہد و پیمان بھی کئے۔ وہ شادی کرنا چاہتے تھے لیکن دونوں کی راہ میں وہی معاشرتی حد بندیاں تھیں۔ یعنی امیر غریب اور ذات پات کا تضاد جسے حشمت خان تلوار جیسا اکھڑ دماغ اور اجڈ قسم کا انسان ماننے کے حق میں نہ تھا۔ لہٰذا صورت حال کو سمجھتے ہوئے چوہدری ہارون نے ڈرتے ڈرتے اس بات کا اظہار اپنی ماں سے کیا کہ وہ ماسٹر بشیر احمد کی بڑی بیٹی سکینہ سے نکاح کرنے کا فیصلہ کئے ہوئے ہے اور اس کی ماں اپنے بیٹے کا پیغام اس کے والد چوہدری حشمت خان تک پہنچائے۔

ماں نے جب اپنے بیٹے کا فیصلہ سنا تو وہ سخت پریشان ہوئی اور اپنے بیٹے سے کہا کہ یہ تم کیا کہہ رہے ہو اور یہ کیسے ممکن ہو گا۔ تمہیں اپنے باپ کا پتہ ہے۔ وہ تو

ذات پات پر یقین رکھتا ہے۔ کیا تمہیں اپنی حیثیت کا علم نہیں۔ تمہارا والد تمہیں ہرگز گاؤں کی کسی کی کمین لڑکی سے نکاح کی اجازت نہیں دے گا۔ پھر آخر تمہیں اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں تمہارے والد نے تمہاری شادی کے لئے ساتھ والے گاؤں کے چوہدری دوسوندھی خان کی بیٹی کے لئے بات چلا رکھی ہے۔ وہ صاحب حیثیت لوگ ہیں اور ہمارے ہم پلہ بھی۔ سنا ہے وہ لڑکی کو جہیز میں دس مربعے زمین دیں گے۔ اس سے بڑھ کر کیا تمہیں کوئی اچھا رشتہ مل سکتا ہے۔ امید ہے جب فصل اٹھالی جائے گی تو تمہاری باقاعدہ منگنی کا اعلان بھی کردیا جائے گا۔ لہٰذا تمہارے لئے یہی بہتر ہوگا کہ اس بات کو یہاں ہی ختم کردو۔ تمہارا والد تمہیں کبھی بھی اس شادی کی اجازت نہیں دے گا۔ تم بھی بیٹا! اپنی حیثیت کو سمجھو کہ کیا ماسٹر بشیر احمد تمہارے پائے کا آدمی ہے۔ اس کی حیثیت ہمارے سامنے ایک کی کمین سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔

''نہیں ماں جی!'' ہارون نے کہا۔ ''میں آپ کی بات سے بالکل متفق نہیں۔ کوئی بڑا چھوٹا نہیں، اللہ کی نظر میں سب برابر ہیں۔ ہم اس فرسودہ رسم و رواج پر کیوں یقین رکھتے ہیں، یہ ذات پات، اونچ نیچ، امیر غریب، اس سوچ کو ہمیں بدلنا ہوگا۔ تعلیم ہمیں بہت کچھ سکھاتی ہے۔ ہمیں اس جہالت کے گڑھ سے باہر نکلنا ہوگا۔ چوہدری دوسوندھی خان کی بیٹی جس کا آپ نے ذکر کیا ہے وہ تو میٹرک پاس بھی نہیں اور جس لڑکی کا ذکر میں نے کیا ہے وہ گریجویٹ ہے۔ پھر سب سے بڑھ کر میری پسند ہے''۔

''بیٹا! کیا تمہیں یہ خبر نہیں؟'' ماں نے کہا۔ ''چوہدری دوسوندھی خان کی بیٹی اپنے ساتھ جہیز میں ڈھیر ساری زمین اور سو دو سو تولہ سونا اور سامان بھی لائے گی۔ ماسٹر بشیر کی لڑکی جس کا تم نے ذکر کیا ہے، ان کے پاس تو ایک مرلہ زمین بھی نہیں۔ فقط ایک چھوٹا سا پانچ چھ مرلے کا کچا پکا مکان ہے۔ میں خود بھی تمہارے اس فیصلے پر تمہاری مخالفت کروں گی۔ بیٹے! ہمیں اپنی حیثیت کے مطابق فیصلہ کرنا ہوگا۔ ماسٹر بشیر کی بیٹی سے نکاح کرنے کی صورت میں ہم لوگ گاؤں والوں کو نہیں منہ دکھا سکیں گے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ اب بھی وقت ہے اپنا فیصلہ بدل لو۔ ہاں سنو، جب اس بات کا علم تمہارے والد کو ہوگا تو سوچ لو لڑائی جھگڑا اور خون خرابہ بھی ہو سکتا ہے۔ پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ماسٹر بشیر اور اس کے خاندان کے لئے گاؤں میں بہت سی مشکلیں پیدا ہو جائیں اور ان کی زندگی گاؤں میں دوبھر ہو جائے۔ تم ماسٹر بشیر اور اس کی اولاد پر رحم کھاؤ اور اس شادی کا خیال دماغ سے نکال دو۔ اچھی اور فرمانبردار اولاد اپنے ماں باپ کے سامنے حکم عدولی ہرگز نہیں کرتی''۔

''لیکن ماں جی! جو کچھ آپ نے کہا میں تو اس فرسودہ نظام کو بالکل نہیں جانتا''۔ ہارون نے دلائل دیتے ہوئے کہا۔ ''میں اسی معاشرے کا ایک تعلیم یافتہ فرد ہوں۔ اپنے مستقبل کے متعلق بہتر سمجھتا ہوں کہ میرے لئے کون سی چیز بہتر ہے یا کون سی نقصان دہ ہو سکتی ہے۔ یہ میرا اٹل فیصلہ ہے کہ شادی کروں گا تو ماسٹر بشیر کی بیٹی سکینہ سے۔ اس کی راہ میں جو مشکل بھی پیش آئی میں مقابلہ کروں گا۔ میری رگوں میں بھی میرے والد کا خون ہے، دیکھوں گا کس کی جیت ہوگی''۔

''ایسا لگتا ہے تعلیم نے تمہارا دماغ خراب کر دیا ہے''۔ ماں نے غصے میں کہا۔ ''آخر والدین کے بھی اپنی اولاد پر کچھ حق حقوق ہوتے ہیں۔ کچھ خاندانی رسم و رواج اور روایت ہوتی ہیں۔ بیٹا! والدین اپنی اولاد کے نفع نقصان کو بہتر سمجھتے ہیں''۔

اس طرح بات کچھ عرصہ تک گھر میں زیر بحث رہی۔ دوسری طرف سکینہ نے بھی جرأت کی اور اپنے

والدین سے چوہدری ہارون سے نکاح کرنے کا اظہار کیا۔ جب اس کے والدین نے بیٹی کا فیصلہ سنا تو وہ پریشان ہوگئے۔

''بیٹی! یہ تُو نے اکیلے میں اتنا بڑا فیصلہ کیسے اور کیونکر کرلیا؟'' ماسٹر نے بیٹی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو آگ اور خون کا کھیل ہے، مت کھیلو۔ ہم لوگ ان کی نسبت بہت کمزور ہیں۔ تم چوہدری حشمت خان کی فطرت اور عادت کو بالکل نہیں سمجھتی۔ وہ تو نہایت ہی جاہل اور اجڈ قسم کا بندہ ہے۔ دوسرے یہ لوگ ذات پات سے باہر بالکل نہیں نکلتے۔ بے شک تم ایک تعلیم یافتہ لڑکی ہو لیکن زمانے کے رسم و رواج اور سماجی بندھن کو بالکل نہیں سمجھتی۔ ابھی تک تو چوہدری حشمت خان تک یہ خبر نہیں پہنچی۔ جب اسے اس بات کا پتا چلے گا تو پھر اس صورت میں وہ ہمارے خلاف ایک ہنگامہ برپا کردے گا، جگ ہنسائی ہوگی۔ ہم لوگ بہت کمزور اور بالکل ان کے ہم پلہ نہیں۔ تمہاری تعلیم ان کے سامنے کچھ معنی نہیں رکھتی''۔

کچھ دیر سکینہ خاموش رہی اور بڑے غور سے اپنے ماں باپ کی باتیں سنتی رہی پھر دبی دبی زبان سے مخاطب ہوئی۔

''ابو جان! اب میں بالغ ہوں، اپنے نفع نقصان کو بھی بخوبی سمجھتی ہوں۔ میں نے اور چوہدری ہارون نے یہ پکا فیصلہ کرلیا ہے کہ اکٹھے جئیں گے اور اکٹھے ہی مریں گے۔ ہر حالت میں نکاح کریں گے''۔

''تو، بیٹی! کیا تمہیں یہ یقین ہے کہ چوہدری ہارون مشکل میں تمہارا ساتھ دے گا۔ کہیں تمہیں تنہا تو نہیں چھوڑ دے گا؟'' ماسٹر بشیر نے بیٹی سے پوچھا۔

''نہیں، ابو ایسی بات بھی نہیں، چوہدری ہارون نے قرآن پر حلف دے رکھا ہے کہ وہ ہر حالت میں نکاح کرکے رہے گا۔ چاہے اس کے عوض اسے اپنی جان کی قربانی بھی دینا پڑی تو وہ دریغ نہیں کرے گا۔ میں اس کو آپ لوگوں کی نسبت بہتر سمجھتی ہوں۔ وہ قول و فعل کا ایک پکا انسان ہے اور مجھے ہرگز ہرگز زندگی کے کسی موڑ پر دھوکہ نہیں دے گا''۔

''بیٹی! ہمیں اپنی حیثیت کا بخوبی علم ہے''۔ ماسٹر بشیر نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''حشمت خان کے سامنے ہم کیا، گاؤں کا کوئی فرد بھی سر اٹھا نہیں سکتا۔ دیکھ لینا کہیں ایسا نہ ہو کہ شادی نکاح کے اس کھیل کی وجہ سے ہمارا دشمن نہ بن جائے۔ تو پھر اس صورت میں ہمارے لئے بہت زیادہ مشکلیں پیدا ہوسکتی ہیں''۔

''کیا ہم کوئی غلط کام کررہے ہیں؟'' سکینہ نے باپ سے کہا۔ ''ہم دونوں نکاح کررہے ہیں۔ ایک مذہبی فریضہ ادا کررہے ہیں۔ اس نیک کام میں کسی کو بھی اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔ جب مذہب اس چیز کی اجازت دیتا ہے تو پھر لوگ کیوں اعتراض کرتے ہیں۔ اللہ مالک ہے۔ جو بھی ہوگا دیکھا جائے گا۔

''غلط کام تو نہیں کررہے''۔ ماسٹر نے کہا۔ ''لیکن ایک اچھا کام غلط طریقے سے تو کرنا چاہتے ہو۔ ہمارا معاشرہ ہمارا سماج جس میں ہم لوگ رہ رہے ہیں ایسی شادی کی راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ میں نے زندگی میں ایسی کئی شادیاں دیکھی ہیں جن کا آگے چل کر انجام بھیانک ہوا ہے۔ ڈر رہا ہوں، نہ تو انکار کرنے کی پوزیشن میں ہوں اور نہ ہی ہاں کرنے کی جرأت کرسکتا ہوں۔ کیا کروں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ اس کے باوجود بیٹی! ہم لوگ تمہارے ساتھ ہیں۔ تمہاری خوشی ہماری خوشی''۔

دوسری طرف اس بات کا علم کسی نہ کسی طرح چوہدری حشمت خان کو بھی ہوگیا کہ اس کا بیٹا ہارون الرشید، ماسٹر بشیر احمد کی بیٹی سے شادی کرنے کا فیصلہ کرچکا ہے۔ یہ بات سنتے ہی چوہدری حشمت خان آگ

بگولا ہو گیا اور غصے سے اپنی بیوی سے پوچھا کہ ہارون کدھر ہے۔

"وہ اپنے کمرے میں پڑھائی میں مصروف ہے"۔ بیوی نے بتایا۔

"ذرا اس کو باہر میرے پاس لے کر آؤ"۔ چوہدری حشمت نے کہا۔ ہارون پیغام سن کر فوراً اپنے والد کے سامنے پیش ہو گیا"۔

"ہارون یہ میں کیا سن رہا ہوں؟" چوہدری حشمت خان اپنے بیٹے سے مخاطب ہوا۔ "تم، ماسٹر بشیر کی بیٹی سے شادی کرنے کا فیصلہ کیے ہوئے ہو؟"

"ہاں، ابا جی!" ہارون نے دبی زبان میں کہا۔ "میرا ارادہ تو یہی ہے، بس آپ کی اجازت چاہیے"۔

"میرے ہوتے ہوئے یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" چوہدری حشمت خان غصے سے گرجا۔ "ابھی میں زندہ ہوں، میرے مرنے کے بعد اگر ایسا ہو تو کہہ نہیں سکتا۔ ایک بات تو بتاؤ۔ کیا تمہیں اپنی حیثیت کا علم نہیں کہ تم گاؤں کے چوہدری ہو؟ تمہارا دادا نمبردار تھا، چچا ذیلدار، ہم خاندانی لینڈ لارڈ لوگ ہیں۔ ہمارا ایک مقام ہے۔ ایک تم ہو کہ ہماری عزت کو خاک میں ملانے پر اتر آئے ہو۔ میں تمہیں اس شادی کی اجازت ہرگز نہیں دے سکتا۔ ویسے بھی میں نے چوہدری دوسوندھی خان کی لڑکی کے لئے تمہاری نسبت طے کرنے کی بات کر رکھی ہے۔ وہ لوگ بھی رضامند ہیں اور امید ہے بہت جلد تمہاری منگنی کی رسم کر دی جائے گی"۔ "ابا جی! میں چونکہ اپنی شادی کا فیصلہ کر چکا ہوں"۔ ہارون نے جرأت کر کے کہا۔ "آپ ایسا کریں، اگر آپ نے بات کر رکھی ہے تو چھوٹے قیصر کی شادی وہاں طے کر دیں۔ میری شادی میری مرضی کے مطابق ہونے دیں"۔

"ایسا کبھی نہیں ہو سکتا"۔ حشمت نے کہا۔ "ابھی تو میں پیار سے تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ تمہارے لئے بھی بہتر ہوگا کہ اپنا فیصلہ بدلو۔ بصورت دیگر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ میرے ہوتے ہوئے صرف اور صرف اس گھر میں میری مرضی چلے گی۔ ہمارے خاندان میں چھوٹے اپنے بڑوں کے آگے اپنا فیصلہ نہیں دیتے"۔

"آپ میری بات تو سمجھنے کی کوشش کریں"۔ ہارون نے کہا۔ "ویسے بھی شادی وہی کامیاب ہوتی ہے جس میں لڑکی اور لڑکے کی رضامندی ہو۔ جبر کی شادی کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ آخر زبان بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ جیسے آپ نے زبان چوہدری دوسوندھی خان کو دے رکھی ہے بالکل اسی طرح میں نے بھی سکینہ کو دے رکھی ہے۔ بڑوں میں بھی حق سچ کی بات سننے کا حوصلہ ہونا چاہیے"۔

"واہ، بھئی واہ...... دیکھو کیا زمانہ آ گیا ہے"۔ حشمت نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "چھوٹے بڑوں کے آگے زبان چلاتے ہیں۔ چھوٹے بڑے کا کوئی ادب لحاظ ہی نہیں رہا۔ تم کان کھول کر سن لو اور سکینہ کا خیال دل سے نکال دو۔ ورنہ انجام ٹھیک نہ ہوگا۔ میں ماسٹر بشیر کو بھی دیکھ لوں گا کہ وہ کس قسم کی تعلیم بچوں کو دے رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس کو اپنی اوقات کا علم نہیں اور اس کی بیٹی سکینہ پر بھی عشق کا بھوت سوار ہے۔ وہ خود کو انارکلی سمجھتی ہے۔ اگر تم لوگوں نے یہ شادی کرنے کی کوشش کی تو میں ماسٹر بشیر کی نسل کو ختم کر دوں گا۔ بے غیرت کہیں کا بچوں کا ماسٹر بنا پھرتا ہے"۔

"غاشاں! میری بندوق کدھر ہے"۔ اس نے غصے سے کانپتے ہوئے اپنی بیوی سے کہا۔ "اندر سے لے کر آؤ میں ابھی اور اسی وقت ماسٹر بشیر اور اس کے خاندان کا نام و نشان مٹا دیتا ہوں۔ نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری"۔

"کیا ہو گیا ہے آپ کو"۔ چوہدرانی نے کہا۔ "خواہ مخواہ بات کو طول دے رہے ہو۔ میرے سرتاج! ذرا صبر سے کام لو۔ بیٹا ہے تمہارا پھر وہ جوان بھی ہے اور تعلیم یافتہ

بھی۔ آخر اس کی بھی کچھ خواہشات ہوں گی۔ اس کو پیار سے سمجھائیں، آپ تو ہر وقت ہر ایک پر اپنا فیصلہ صادر کرتے رہتے ہیں۔ دوسروں کے جذبات اور احساسات کو سمجھنے کی کوشش کیا کریں۔ اگر بیٹا بھی تمہاری طرح ضد پر اتر آئے تو پھر کیا ہوگا۔ اس مسئلے کا کوئی دانشمندانہ حل نکالیں۔ لڑائی جھگڑے، مار کٹائی سے ہماری جگ ہنسائی ہوگی۔ لوگ طرح طرح کی باتیں بنائیں گے اور ہماری شریکہ برادری خوش ہوگی''۔ چوہدری حشمت کی بیوی نے اپنے خاوند کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''تم خاموش رہو، ہارون کی ماں!'' چوہدری حشمت دھاڑ کر بولا۔ ''مردوں کے کاموں میں عورتیں نہیں بولتیں۔ بس تم اپنی زبان بند رکھو اور ایک طرف ہٹ کر بیٹھ جاؤ۔ میرا فیصلہ اٹل ہے، یہ شادی ہرگز نہیں ہوسکتی اور نہ ہی ماسٹر کی بیٹی سکینہ کا اس گھر کی بہو بننے کا خواب پورا ہوگا''۔

''ٹھیک ہے ابا!'' ہارون نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''آپ کا فیصلہ یہی ہے تو پھر میرا فیصلہ بھی یہی ہوگا۔ سکینہ سے ہر حالت میں شادی کرکے رہوں گا۔ چاہے اس کی کتنی بھی قیمت کیوں نہ ادا کرنا پڑے۔ میں اپنے اوپر کسی بھی شخص کا جبر برداشت نہیں کرسکتا۔ میری رگوں میں بھی آپ کا خون ہے۔ میں کٹ سکتا ہوں لیکن اپنی زبان سے انحراف نہیں کرسکتا۔ مرد وہ ہوتا ہے جو اپنے قول فعل پر مرمٹتا ہے۔ آپ دوسروں پر اپنے فیصلے مسلط کرتے چلے آئے ہیں اور اپنی چودھراہٹ کو گھر میں بھی چلاتے ہیں۔ انسان کو اپنی عمر اور حالات کے پیش نظر سوچ سمجھ کر فیصلے کرنے چاہئیں۔ آخر برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے''۔

''اگر تمہارا یہی فیصلہ ہے تو پھر یاد رکھو! میں تمہیں اپنی جائیداد سے عاق کردوں گا۔ بس پھر تم نام کے چوہدری بن کے رہ جاؤ گے۔ تمہاری یہ ساری شان و شوکت، میں دیکھوں گا کدھر چلی جائے گی اور تمہارا عشق کا بھوت بھی جلدی اتر جائے گا''۔ چوہدری حشمت نے بیٹے کو ڈراتے دھمکاتے ہوئے کہا۔

''مجھے مت ڈرائیں دھمکائیں''۔ ہارون نے ڈرے بغیر کہا۔ ''مجھے رتی بھر بھی پروا نہیں کہ آپ مجھے اپنی جائیداد سے عاق کردو گے۔ اس دنیا میں لاکھوں کروڑوں انسان ایسے بستے ہیں جن کی کوئی جائیداد وغیرہ نہیں۔ وہ کیسے زندہ ہیں؟ جس شخص کے دو ہاتھ اور دو پاؤں ہوں وہ کبھی بھی بھوکا نہیں رہتا۔ میں تو پھر بھی معاشرے کا ایک پڑھا لکھا فرد ہوں، وکیل ہوں اپنی بیوی کو ساتھ لے کر شہر چلا جاؤں گا۔ وکالت کے پیشے سے وابستہ ہوکر اپنے بیوی بچوں کے لئے ایک بہتر اور خوشحال مستقبل بنا سکتا ہوں''۔

''یاد رکھو! یہ سب زبانی کلامی اور تصوراتی باتیں ہیں''۔ حشمت نے بیٹے کو ڈرانے کے لئے کہا۔ ''روزی کمانا اس ملک میں اتنا آسان بھی نہیں جتنا تم سمجھتے ہو۔ اس رزق اور روزی کی قدر اس ہاری یا اس مزدور سے پوچھو جسے صبح وشام خون پسینہ ایک کرکے بھی پیٹ بھر کے کھانا نصیب نہیں ہوتا۔ ہارون پتر! تم ٹھنڈے دودھ کو پھونکیں مار رہے ہو۔ ایک عام سی لڑکی کو میرے گھر کی بہو بنانے پر تلے ہوئے ہو جو تمہیں زیب نہیں دیتا۔ بہتر یہی ہوگا کہ تم اس وقت میری آنکھوں سے دور چلے جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ میری بندوق کا رُخ تمہاری طرف ہو جائے''۔

چوہدری حشمت خان کے تیور بگڑتے ہوئے دیکھ کر اس کی بیوی پریشان ہوگئی کہ وہ باپ بیٹے میں سے کس کو سمجھائے لہٰذا اس نے مداخلت کرتے ہوئے بیٹے سے کہا کہ وہ اس وقت یہاں سے چلا جائے۔ اگر اسی طرح باتیں ہوتی رہیں تو پھر اس صورت میں باپ بیٹے کے درمیان جنگ چھڑ جائے گی اور کسی ایک کا نقصان بھی

ہوسکتا ہے۔ ہارون نے بھی حالات کا جائزہ لیا اور وقتی طور پر اپنے غصے کو پی گیا اور اپنی ماں کے کہنے پر بوجھل بوجھل قدموں کے ساتھ وہاں سے چلا گیا اور اپنے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ وہ مختلف قسم کی سوچوں میں کھو گیا۔

دوسری طرف چوہدری حشمت خان بھی اپنے بیٹے کے ساتھ ہونے والی گفتگو پر حیران اور پریشان ہو گیا اور دل ہی دل میں خیال کرنے لگا کہ آج اس کو پہلی بار زندگی میں اپنے بیٹے کے ہاتھوں شکست اور ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ جس کو اس نے اپنی توہین سمجھا۔ کیونکہ آج تک اس کے سامنے کسی نے بھی نظر اٹھا کر بات نہ کی تھی۔ تاہم اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے بیٹے کو ضرور سبق سکھائے گا کہ کے فیصلوں کی حکم عدولی کرنے پر کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح شب و روز گزرتے رہے اور باپ بیٹے کے درمیان گفتگو کا سلسلہ بھی بڑی حد تک منقطع ہو گیا۔ سکینہ سے نکاح ہونے کی بات اب چونکہ کھل گئی تھی اور چوہدری حشمت خان نے بھی اپنا فیصلہ سنا دیا تھا کہ وہ کسی حالت میں بھی سکینہ کو بہو تسلیم نہیں کرے گا۔

چوہدری ہارون نے بھی سکینہ کو صاف صاف بتا دیا کہ اس کا والد اس شادی کی اجازت نہیں دے رہا بلکہ ایک طرح سے رکاوٹ بنا بیٹھا ہے۔ اب صرف ایک راستہ بچا ہے کہ ہم دونوں کورٹ میرج کر لیتے ہیں۔ بعد میں جو کچھ بھی ہو گا دیکھا جائے گا۔ کورٹ میرج کے سلسلہ میں تمہارا تعاون اور ہمت چاہئے۔

سکینہ نے بھی عزم کر رکھا تھا کہ وہ دونوں حالات کا مقابلہ کریں گے۔ چنانچہ سکینہ نے اپنے والدین سے اجازت مانگی کہ وہ چوہدری ہارون کے ساتھ کورٹ میرج کر رہی ہے کیونکہ اس کا والد اس کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت نہیں دے رہا بلکہ ایک طرح کی رکاوٹ بنا بیٹھا ہے۔

''دیکھ لینا بیٹی! کہیں آگے چل کر یہ کورٹ میرج ہمارے تمہارے لئے کوئی نئی مصیبت نہ کھڑی کر دے۔ ہم لوگ چوہدری حشمت خان سے بہت زیادہ خائف ہیں۔ اگر اس شادی میں اس کی مرضی شامل نہیں تو پھر وہ یقیناً ہم سے کسی نہ کسی طرح انتقام لے گا''۔

ماسٹر بشیر اور اس کی بیوی نے سکینہ کو آنے والی مشکلات سے آگاہ کیا۔

''ایسی بھی کوئی فکر والی بات نہیں''۔ سکینہ نے جواباً کہا۔ ''محبت میں خراج تو دینا ہی پڑتا ہے۔ اگر اللہ کی رحمت شامل حال رہی تو چوہدری حشمت ہمارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا۔ پھر سب سے بڑھ کر ہارون نے مجھے یقین دہانی کروا رکھی ہے کہ نکاح کے بعد خدانخواستہ اگر حالات ناسازگار ہوئے تو پھر اس صورت میں ہم لوگ گاؤں چھوڑ کر شہر چلے جائیں گے اور اپنی زندگی کا ایک نئے سرے سے آغاز کریں گے۔ ویسے بھی ہارون پیشے کے لحاظ سے ایک وکیل ہے، وہ وکالت شروع کر رہے تھے۔ ہاں اگر ضرورت پڑی تو میں بھی ملازمت کر کے اس کی معاونت کروں گی۔ ہماری راہ میں مشکلیں تو ضرور آئیں گی لیکن اللہ بہتر کرے گا۔ کیونکہ ہماری نیتیں ٹھیک ہیں، کوئی گناہ کا ارتکاب نہیں کر رہے۔ فقط نکاح کر رہے ہیں''۔

اس طرح کچھ وقت گزرا اور یہ بات گاؤں میں لوگوں کی زبان پر بھی تھوڑی بہت آ گئی تھی۔ لہٰذا پروگرام کے تحت سکینہ اور چوہدری ہارون نے بڑی رازداری کے ساتھ ایک دن شہر جا کر عدالت میں کورٹ میرج کر لی اور یوں دونوں میاں بیوی کے رشتہ سے منسلک ہو گئے اور عہد کیا کہ ابھی نکاح کا اظہار نہ کیا جائے اور اس بات کو راز میں رکھا جائے لیکن اس قسم کی باتیں زیادہ دیر تک چھپی نہیں رہتیں، کسی نہ کسی طرح منظرِ عام پر آ ہی جاتی

ہیں۔ جلد ہی چوہدری حشمت خان کو بھی اس نکاح کی خبر مل گئی اور اس نے اس کی تصدیق بھی کر لی۔ چوہدری حشمت نے ہارون کو بلایا اور پوچھا کہ اس نے اپنے باپ کی اجازت کے بغیر اتنا بڑا قدم کیوں اٹھایا؟ اب تمہیں اس حرکت کی سزا بھگتنا ہی پڑے گی۔

''دیکھو تمہارے لاڈلے نے کیا گل کھلایا ہے''۔ اس نے اپنی بیوی سے کہا۔''اس کو تو میں بعد میں دیکھوں گا''۔ چوہدری حشمت نے اپنی بندوق پکڑی اور غصے سے گرجا۔''پہلے ماسٹر بشیر اور اس کے ٹبر سے نمٹ لوں۔ آج ماسٹر کا گھر سارے کے سواہ نہ کر دیا تو حشمت نام نہیں''۔

چوہدری ہارون نے دیکھا کہ اس کے والد کے تیور کچھ اچھے نہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کچھ کر گزرے۔ وہ بھی فوراً اپنے کمرے میں گیا اور اپنی بندوق اٹھا لایا۔ بندوق کو لوڈ کیا پھر اپنے والد کے سامنے بندوق تان کر کھڑا ہو گیا اور للکارا۔

''ابا! ہمت ہے تو اپنے گھر کا دروازہ پار کر کے دیکھو۔ ہم دونوں میں جیت کس کی ہوگی یا تو گولی تیرا سینہ چاک کر دے گی یا میں گولی کھاؤں گا''۔ چوہدری حشمت نے جب اپنے بیٹے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا ہے، ڈر سا گیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ باپ بیٹے میں خون کی ہولی کھیلی جائے۔ وہ کچھ دب سا گیا اور اس کی گرفت بندوق پر قدرے ڈھیلی پڑ گئی۔ دوسرے چوہدری حشمت کی بیوی بھی دونوں باپ بیٹے کے درمیان آن کھڑی ہوئی۔ اس نے اپنے سر سے دوپٹہ اتار کر باپ بیٹے کے درمیان رکھ دیا اور اللہ اور اس کے رسول کا واسطہ دینے لگی کہ خون خرابہ مت کرو۔

چوہدری ہارون کا چھوٹا بھائی چوہدری قیصر رشید بھی گھر میں سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس نے بھی اپنے والد سے کہا۔ ابا! آپ اپنے آپ کو اپنے رتبے کو سمجھے اور حالات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ ہارون نے جو کچھ بھی کیا ہے آپ اسے معاف کریں۔ چھوٹے ہمیشہ غلطیاں کرتے آئے ہیں اور بڑے درگزر کرتے ہیں۔ اس طرح لڑائی جھگڑا کرنے سے کسی ایک کی جان بھی جا سکتی ہے اور سارا گاؤں ہمارا تماشا دیکھے گا۔ ہماری شریکہ برادری بھی ہمارے اس طرز عمل پر خوش ہوگی۔

چوہدری حشمت نے جب اپنے چھوٹے بیٹے کی بات سنی اور سمجھا کہ صورت حال واقعی اتنی خراب ہے کہ باپ بیٹا آمنے سامنے ہیں اور گھر کے افراد بھی ہارون کے حق میں ہیں، وہ وقتی طور پر اپنا غصہ پی گیا۔

''ٹھیک ہے میں آج سے ہارون کے ساتھ باپ بیٹے کا رشتہ ختم کرتا ہوں''۔ اس نے پتھر جیسے لہجے میں کہا۔''میں کل کو کچہری جا کر بیان دے آؤں گا کہ اپنی جائیداد سے اپنے بیٹے ہارون کو عاق کرتا ہوں۔ مناسب یہی ہوگا کہ ہارون کو کہو کہ وہ اس وقت میری نظروں سے دور ہو جائے اور اپنی بیوی سکینہ کو لے کر اس گاؤں سے کہیں دور چلا جائے ورنہ کسی وقت بھی میں غصے کی آگ میں جل کر دونوں کو قتل کر دوں گا''۔

''ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے''۔ ہارون نے کہا۔ میں اپنی بیوی سکینہ کو ساتھ لے کر چلا جاتا ہوں لیکن ایک بات یاد رکھنا کہ میرے چلے جانے کے بعد اگر گاؤں کے کسی بھی فرد نے تمہارے کہنے پر ماسٹر بشیر یا اس کے اہل خانہ کے ساتھ انتقاماً کوئی حرکت کی تو اس کا انجام بہت بھیانک ہوگا''۔ ہارون چوہدری نے اپنے والد کو یہ سب کچھ اس لئے کہا کیونکہ وہ اپنے والد کی فطرت اور عادت کو سمجھتا تھا۔ دوسرے، ہارون چوہدری نے جاتے وقت گاؤں میں اپنے دوستوں کو بھی تاکید کی کہ اس کے چلے جانے کے بعد ماسٹر بشیر کے گھر کا خیال رکھیں۔

نکاح تو سکینہ اور ہارون چوہدری کا ہو ہی چکا تھا اور سارے گاؤں کے لوگوں کو بھی اس چیز کا علم ہو گیا تھا۔

وعدے کے مطابق چوہدری حشمت شہر گیا اور اپنے وکیل کے ذریعہ بیان حلفی لکھ کر عدالت میں پیش ہو کر بیان دیا کہ وہ اپنے بیٹے ہارون کو جائیداد سے عاق کرتا ہے۔ واپس آ کر اپنے بیان کی نقل، ہارون کو دے دی تا کہ وہ کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ رہے کہ جو کچھ اس کے والد نے کہا تھا پورا نہیں کیا۔

ہارون چوہدری نے جب بیان پڑھا تو پریشان نہ ہوا اور کہا کوئی بات نہیں اللہ مالک ہے۔ بنک میں سارا روپیہ پیسہ ہارون کے نام تھا۔ سب سے پہلے وہ شہر گیا اور بنک سے ساری رقم نکال کر اکاؤنٹ بند کروا آیا۔ ایک دو دن میں اس نے اپنی تیاری مکمل کی اور بیوی کو ساتھ لے کر لاہور چلا آیا اور آتے ہی لاہور میں اپنے ایک دوست کی وساطت سے مکان کرائے پر لے لیا۔

شہر میں پہلے سے ہی اس کا ایک دیرینہ دوست وکالت کر رہا تھا، چوہدری ہارون نے آتے ہی اس کے ساتھ بطور معاون وکیل پریکٹس شروع کر دی۔ سب سے پہلے چوہدری ہارون نے یہ کام کیا کہ اپنی اور اپنی بیوی کی پانچ پانچ لاکھ کی انشورنس پالیسی لی کیونکہ اس کو اپنے والد کا پتہ تھا کہ وہ کسی وقت بھی کرائے کے قاتلوں کے ذریعے انہیں نقصان پہنچا سکتا ہے اور ساتھ ساتھ اس نے سکینہ کے والدین سے بھی گاؤں میں رابطہ قائم رکھا کہ کہیں اس کا والد ماسٹر بشیر اور اس کے اہل خانہ کو پریشان نہ کرے۔ گاؤں میں جب بھی دونوں کا آمنا سامنا ہوتا تو چوہدری حشمت ماسٹر بشیر کو دیکھ کر غصے کے کڑوے گھونٹ پی جاتا۔ اسے یہ خوف اور ڈر تھا کہ کہیں لڑائی جھگڑا کرنے کی صورت میں ان کا بیٹا ہارون نہ سامنے آ جائے۔ دوسرے گاؤں کے لوگ بھی ماسٹر بشیر کی حمایت کرتے تھے۔

ہارون چوہدری کے شہر چلے جانے کے بعد چوہدری حشمت خان کے گھر میں اداسی اور ویرانی نے ڈیرے ڈال دیئے۔ ہارون کی ماں اکثر اپنے بیٹے کی جدائی میں پریشان رہتی۔ اس ماحول سے نکلنے کے لئے اور گھر میں بہلانے کے لئے چوہدری حشمت خان نے اپنے چھوٹے بیٹے قیصر رشید چوہدری کی شادی، چوہدری دوسوندھی خان کی بیٹی سے کر دی۔ یوں گھر میں قدرے رونق لوٹ آئی لیکن پھر بھی چوہدرانی اپنے بڑے بیٹے کی جدائی میں دن رات جلتی اور اداس اداس رہتی لیکن ڈر خوف کے مارے وہ اس بات کا اظہار کسی سے بھی نہ کرتی۔ اس طرح وقت گزرتا چلا گیا چوہدری قیصر رشید کے ہاں لڑکا تولد ہوا۔ گھر میں خوشیاں لوٹ آئیں۔ پورے گاؤں میں مٹھائی بانٹی کہ اللہ نے چوہدری حشمت خان کو پوتا دیا ہے جس کا نام حامد رشید چوہدری رکھا۔

دوسری طرف اللہ نے چوہدری ہارون کے ہاں لڑکی عطا کی اور میاں بیوی بہت خوش ہوئے اور لڑکی کا نام جنت ہارون رکھا۔ اب چوہدری ہارون کی وکالت بھی چل نکلی۔ ہارون کی ماں کو جب لڑکی کے تولد ہونے کا پتہ چلا تو وہ بھی بہت خوش ہوئی۔ وہ اپنے خاوند کو بتائے بغیر کسی بہانے لاہور روانہ ہوئی۔ اچانک جب وہ ہارون کے گھر پہنچی تو ماں کو اپنے گھر آتے دیکھ کر ان کی خوشی دوبالا ہو گئی اور بچی کو گود میں اٹھا لیا اور ڈھیروں دعائیں دیں۔ اپنی بہو کو بھی گلے لگایا۔ اب ہارون کی ماں کسی نہ کسی ذریعہ گاؤں سے ان کو آٹا، چاول، گھی وغیرہ بھیجتی رہتی اور وقت نکال کر ان کو شہر آ کر مل بھی جاتی۔

اس کھیل میں تیسری پارٹی ماسٹر بشیر تھی۔ وہ ایک دانا پڑھا لکھا انسان تھا۔ گاؤں میں چوہدری حشمت خان نے بھی اپنے بڑے بیٹے ہارون کے ڈر اور خوف سے اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی لیکن وہ اس فکر میں ضرور تھا کہ کس طرح ماسٹر کو گاؤں میں ذلیل اور رسوا کیا جائے لیکن وہ ایسا کرنے سے بڑی حد تک اپنے بیٹے ہارون سے ڈرتا بھی تھا۔ دوسری طرف ماسٹر بشیر نے بھی یہی بہتر

سمجھا کہ ان دو مینڈھوں کے درمیان لڑائی میں کہیں وہ نہ مارا جائے لہٰذا اس نے حفظ ماتقدم اس گاؤں سے اپنی ٹرانسفر کروالی اور اپنے اہل خانہ سمیت نزدیک شہر میں آباد ہو گیا تاکہ اسی بہانے اس کے بچوں کو تعلیم کے حصول میں آسانی رہے اب وہ شہر سے ہر روز سائیکل پر گاؤں سکول میں بچوں کو پڑھانے آتا اور شام کو واپس شہر اپنے گھر چلا جاتا۔

چوہدری حشمت نے جب اپنے بیٹے ہارون کے ہاں بچی کے پیدا ہونے کا سنا تو اسے سخت ناگوار گزرا اب دوبارہ اس کے اندر بجھی ہوئی غصے کی آگ اچانک بھڑک اٹھی اور وہ اپنے بیٹے سے انتقام کا سوچنے لگا اور عہد کیا کہ وہ اپنے بیٹے ہارون سمیت اس کی بیوی بچی کا نام ونشان مٹا دے گا۔ لہٰذا چوہدری حشمت خان نے کرائے کے دو قاتل تلاش کئے اور انہیں ایک معقول رقم دی اور ساتھ نشاندہی بھی کی کہ لاہور شہر جا کر اس پتے پر اس خاندان کو ہر حالت میں ہلاک کرنا ہوگا۔

قاتلوں نے رضامندی ظاہر کی کہ وہ ہر حالت میں دیئے گئے کام کو مکمل کر کے چوہدری صاحب کو خوشخبری سنائیں گے۔ دونوں قاتل اپنی تیاری مکمل کر کے جدید اسلحے سے لیس ہو کر دیئے گئے پتے پر لاہور پہنچ گئے اور قتل کرنے کے لئے سرگرم ہو گئے۔ دو تین مرتبہ انہوں نے چوہدری ہارون کے گھر کی ریکی بھی کی پھر منصوبہ کے تحت وقت کا تعین بھی کیا۔

سردیوں کا موسم تھا، موسم ابر آلود تھا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی بھی ہو رہی تھی۔ رات کے 9 بج رہے تھے۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں مصروف تھے۔ گلی بازار میں لوگوں کا آنا جانا بھی کم تھا۔ قاتل گھات لگائے ہارون کے گھر کے سامنے کچھ فاصلے پر چھپے بیٹھے تھے لیکن وہ قدرے پریشان بھی تھے کیونکہ چوہدری ہارون کے گھر پر تالہ لگا ہوا تھا اور گھر میں سب روشنیاں بجھی ہوئی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ گھر میں کوئی فرد موجود نہیں۔ اتنے میں چوہدری ہارون مع اپنی بیوی اور بچی کے ٹیکسی پر گھر آن پہنچے۔ وہ غالباً فلم کا شو دیکھ کر واپس آئے تھے۔ گاڑی سے اترتے ہی جلدی جلدی سکینہ نے گھر کا تالہ کھولا غالباً اس کی گود میں بچی بھی تھی جو سوئی ہوئی تھی، اس کے پیچھے پیچھے چوہدری ہارون تھا۔ جس کے ہاتھ میں کچھ کھانے پینے کی چیزیں پکڑی ہوئی تھیں قاتلوں نے اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اچانک فائر کھول دیا۔ حملہ اتنا اچانک ہوا کہ کسی کو خبر تک نہ ہوئی۔

لوگ اپنے اپنے گھروں میں موجود تھے اور گلی ویران ویران سی تھی۔ دو گولیاں چوہدری ہارون کو لگیں ایک کھوپڑی میں اور دوسری گولی اس کے پیٹ میں اور وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ تیسری گولی سکینہ جو مکان کے صدر دروازے پر تھی۔ اس کے بازو کو چھو کر گزر گئی۔ تھوڑا زیادہ خون بہنے لگا لیکن اس کی بیٹی جنت ہارون معجزانہ طور پر بچ گئی۔ سکینہ نے مڑ کر دیکھا کہ وہ حملہ آور جن کے ہاتھوں میں اسلحہ تھا رات کی تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ سکینہ نے دیکھا کہ اس کا خاوند خون سے لت پت زمین پر تڑپ رہا ہے اس نے شور مچانا شروع کر دیا۔ سکینہ کی چیخ و پکار سن کر گلی محلے کے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ فوراً پولیس کو فون کیا اور ایمبولینس بھی آ گئی۔ سکینہ کی حالت غیر تھی۔ لوگوں نے اس کی بچی کو سنبھالا جو سوئی ہوئی تھی، سکینہ اور چوہدری ہارون کو فوراً ہسپتال لے جایا گیا۔ چوہدری ہارون تو راستے میں ہی دم توڑ گیا۔ سکینہ کو معمولی زخم آیا تھا اس کو مرہم پٹی کر کے فارغ کر دیا گیا۔ پولیس بھی ساتھ ساتھ تھی اور حالات کا جائزہ لے رہی تھی کہ اس قتل کے کیا محرکات ہو سکتے ہیں۔

دوسرے موقع کا کوئی گواہ بھی نہ تھا۔ صرف اور صرف ایک سکینہ تھی جسے معلوم تھا کہ قاتل کون ہیں اور اس قتل کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے اور اب اس کا خاوند بھی زندہ نہ تھا اور

وہ چوہدری حشمت خان سے دشمنی لینے کا اتنا بڑا فیصلہ کر بھی نہیں سکتی تھی کیونکہ چوہدری حشمت خان ہر لحاظ سے طاقتور اور اثر رسوخ والا شخص تھا۔

لہٰذا سکینہ نے جواب بیوہ ہو چکی تھی اور مزید دشمنی سے بچنے کے لئے نامعلوم افراد کے خلاف پولیس میں ایف آئی آر درج کروا دی۔ کچھ دنوں تک پولیس ضابطے کی کارروائی کرتی رہی لیکن وہ کسی حتمی نتیجے تک نہ پہنچ سکی کیونکہ موقع کا کوئی گواہ موجود نہ تھا اور نہ ہی کوئی مدعی تھا جو کیس کی پیروی کر سکے۔ لہٰذا کچھ عرصے تک مقدمہ زیر التوا رہا پھر داخل دفتر کر دیا گیا۔

اب سکینہ کی زندگی میں ایک مشکل موڑ آیا لیکن ایک بیوہ ہونے کے ناطے اس نے اپنی ہمت جوان رکھی۔ وہ اب شہر کی بود و باش سے بھی بڑی حد تک واقف ہو چکی تھی۔ اب اس نے اپنی بیٹی کے لئے جینا تھا اور مشکلیں بھی ان کے ساتھ ساتھ تھیں۔ کبھی کبھی سوچتی کہ اتنی لمبی زندگی تنہا اکیلے گزارے گی۔ سکینہ کے والدین بھی اس کے غم میں برابر کے شریک تھے کسی حد تک اس کا خیال بھی رکھتے لیکن کب تک رہتے۔ اکیلی عورت کا تنہا شہر میں رہائش پذیر ہونا کوئی آسان نہ تھا لہٰذا اپنی حفاظت کے لئے اس نے اپنے چھوٹے بھائی کو جس نے حال ہی میں بی اے بی ایڈ پاس کیا تھا، اپنے والدین کی اجازت سے اس کو اپنے پاس لاہور بلا لیا اور سکینہ اب اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے لگی۔ سب سے پہلے تھوڑی زیادہ کوشش کر کے اپنے مرحوم شوہر کے بیمہ کی رقم پانچ لاکھ اپنے بھائی کے ذریعے کاغذات مکمل کر کے وصول کی۔ اس کے ساتھ ساتھ سکینہ جو خود بھی اس سانحہ میں زخمی ہوئی تھی، اس کی انشورنس جو تقریباً دو لاکھ کے قریب تھی وہ بھی اس کو ملی۔ سکینہ اب مالی طور پر بڑی حد تک مضبوط تھی۔ سکینہ یہ بھی سمجھتی تھی کہ گھر بیٹھ کر ساری کی ساری رقم خرچ ہو جائے گی لہٰذا اس نے ماہوار آمدنی کی ایک راہ نکالی۔ اپنے بھائی کے ساتھ مل کر اپنے گھر کے قریب ایک بچوں کا سکول جو مڈل تک تھا اس کا مالک ملک سے باہر کہیں جا رہا تھا وہ خرید لیا۔

تقریباً ایک سو کے قریب سکول میں طالب علم زیر تعلیم تھے لہٰذا دو لاکھ کی رقم بھائی بہن نے سکول کے مالک کو ادا کی اور حق ملکیت سکول کے اپنے نام کروا لئے۔ سکول کا کرایہ ماہوار جتنا بھی تھا سکینہ نے اپنے ذمہ لے لیا۔ دونوں بہن بھائی تعلیم یافتہ تھے کچھ سٹاف بھی تھا سکول کا کنٹرول پوری طرح سنبھال لیا اور یوں آمدنی کا ایک ذریعہ چل نکلا۔

اسی دوران سکینہ کے دیگر بھائی بہن، والدین بھی اس کا پابندی سے خیال رکھتے اور اس کے ہاں لاہور آتے جاتے لیکن سکینہ اکثر اپنے مرحوم خاوند کو یاد کرتی رہتی کہ وہ موت کی نیند سو گیا۔ پھر اس نے سب کچھ اللہ کی رضا پر چھوڑ دیا اور عہد کیا کہ وہ اب عمر بھر شادی نہیں کرے گی۔ اپنی بیٹی کے لئے جیئے گی، اس کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دے گی۔ سکینہ نے تھوڑے ہی عرصے میں بہت کچھ دیکھ اور سیکھ لیا تھا۔ سکینہ بڑے ہی محتاط طریقے سے دن گزار رہی تھی۔ ماہ و سال اس طرح گزرتے چلے گئے۔ اس کی بیٹی جنت اب چار سال کی ہو چکی تھی۔

اس طرح وقت بڑی تیزی سے گزرتا چلا گیا۔ سکینہ حالات کا بڑی ہمت اور جرأت کے ساتھ مقابلہ کرتی رہی لیکن ان کی زیادہ تر توجہ اپنی بیٹی۔ جنت پر مرکوز رہی، یہی اس کی دنیا تھی اور اس کے مرحوم شوہر کی نشانی بھی۔ سکینہ اپنی زندگی میں اس کو ایک پڑھی لکھی کامیاب عورت کے روپ میں دیکھنا چاہتی تھی۔ جلد ہی اس نے اپنی پرائمری تعلیم مکمل کی پھر مڈل کا امتحان بھی اس نے امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کر لیا۔ پھر کچھ عرصے بعد میٹرک۔ آخر کار ایف ایس سی کا امتحان بھی اس نے فرسٹ کلاس

میں امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کرلیا اور یوں اسے میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا۔ جنت اپنے گھریلو حالات خاص کر اس کی ماں نے جو زندگی میں دکھ اٹھائے تھے بخوبی ان سے آگاہ تھی اور اپنی ماں کے مشن کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا فیصلہ کیے ہوئے تھی۔

اب وقت کے ساتھ ساتھ چوہدری حشمت خان میں بھی پہلے والا دم خم نہ رہا۔ اسے اپنے جوان بیٹے کی موت نے اندر سے توڑ پھوڑ دیا تھا لیکن وہ اس غم کا اظہار کسی سے کر بھی نہ سکتا تھا۔ کیونکہ وہ یہ بھی اچھی طرح سمجھتا تھا کہ وہ خود بھی اپنے بیٹے کی موت کا ذمہ دار ہے۔ اب وہ اکثر بیمار سا رہنے لگا اسے پھیپھڑوں کی تکلیف تھی اور ڈاکٹروں نے اسے ٹی بی جیسے مہلک مرض کا مریض قرار دیا۔ علاج معالجہ بھی جاری رہا لیکن مرض بڑھتا ہی چلا گیا۔ شاید یہ سب کچھ ایک طرح کا مکافات عمل تھا یا پھر زندگی بھر اس کے کیے ہوئے کرموں کا پھل تھا۔ کچھ عرصہ بعد چوہدری حشمت خان کی بیوی اپنے جوان بیٹے ہارون کے فراق میں انتقال کرگئی۔ بیوی کے صدمے نے حشمت خان کو مزید پریشان اور اکھیڑ دیا۔ اب چوہدری حشمت خان کے سارے کس بل نکل گئے تھے۔ وہ ہر وقت اللہ کے حضور اپنی آخرت میں خیر کے لئے دعا گو رہتا۔

ادھر جنت ہارون نے ایم بی بی ایس کا امتحان پاس کرلیا اور یوں اس کی ماں سکینہ کا مشن مکمل ہوگیا۔ وہ اپنی بیٹی کو اپنی زندگی میں ایک خودمختار عورت کی حیثیت سے دیکھنا چاہتی تھی، وہ اب بہت خوش تھی جنت ہارون اب ڈاکٹر جنت کے نام سے پکاری جانے لگی۔

حشمت خان کا جاہ و جلال اور اس کی انتقام لینے والی تلوار بھی ٹوٹ چکی تھی اور وہ عمر کے آخری حصے میں پہنچ چکا تھا۔ ٹی بی کے موذی مرض نے اس کے دونوں پھیپھڑے بُری طرح متاثر کر رکھے تھے۔ ڈاکٹروں نے اسے مشورہ دیا کہ اس کو فوری طور پر علاج معالجے کے لئے مری سائی نی ٹوریم لے جایا جائے۔

ڈاکٹروں کے مشورے کے مطابق، چوہدری حشمت خان کو وہاں داخل کروا دیا گیا۔ چوہدری صاحب کا چھوٹا بیٹا قیصر رشید اپنے باپ کو وہاں لے گیا اور علاج معالجہ شروع ہوگیا۔ اتفاق سے ڈاکٹر جنت کی تعیناتی بھی وہاں ہوئی۔ ڈاکٹر جنت نے ہر مریض کی طرح چوہدری حشمت خان کے علاج پر خصوصی توجہ دی۔ یہ ڈاکٹر جنت کا معمول تھا کہ وہ مریضوں کی دلجوئی کے لئے ان سے گپ شپ بھی کرتی تھی اور اللہ کے حضور ان کی صحت کے لئے دعا بھی کرتی تھی۔

چوہدری حشمت خان بھی دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا اور خیال کرتا کہ یقیناً یہ لیڈی ڈاکٹر کسی اچھے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ ایک ماہ بعد چوہدری حشمت پہلے کی نسبت بہتر محسوس کر رہا تھا اور اس کے ذہن میں یہ خیال بھی آتا کہ شاید ڈاکٹر جنت کی وجہ سے اسے دوبارہ صحت یابی مل رہی تھی۔ پھر اس کا دھیان اس طرف بھی جاتا۔ کاش! یہ ڈاکٹر بھی اس کی بہو ہوتی۔ چوہدری حشمت کے بیٹے قیصر رشید کا ایک بیٹا تھا جس کا نام چوہدری حامد رشید تھا۔ بی اے کرنے کے بعد پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاس کرنے کے بعد اس کی پوسٹنگ بطور اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ جیل خانہ جات ہوئی اور وہ جہلم تعینات ہوا تھا۔

دوسرے دن جب ڈاکٹر جنت وارڈ میں آئی تو اس نے چوہدری حشمت خان سے خیر خیریت دریافت کی۔ ڈرتے ڈرتے اس نے ڈاکٹر جنت سے پوچھا۔ بیٹی ایک بات تو بتاؤ تم کہاں کی رہنے والی ہو اور کس خاندان سے تعلق رکھتی ہو۔ تمہارے باپ کا کیا نام ہے، قبیلہ کون سا ہے۔

ڈاکٹر جنت نے بھی مسکراتے ہوئے جواباً پوچھا۔

"آپ کیوں پوچھ رہے ہیں۔ خیریت تو ہے ناں؟"

بیٹی! ویسے ہی پوچھ رہا ہوں تم ایک بہت اچھی اور بااخلاق بچی ہو۔ یقیناً تمہاری رگوں میں صالح خون دوڑ رہا ہے۔ تمہارے والدین نے تمہاری ہر لحاظ سے مکمل تعلیم وتربیت کی ہے"۔

"میرے والد کو فوت ہوئے ایک عرصہ بیت گیا ہے"۔ جنت نے کہا۔ "میرا والد بیچارہ خاندانی دشمن کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔ اس کا نام چوہدری ہارون رشید تھا۔ میں نے تو باپ کی شکل تک نہیں دیکھی۔ مجھے یہ سب کچھ میری ماں نے بتایا تھا میرے والد کو اس کے باپ نے کرائے کے قاتلوں کے ذریعے قتل کروایا تھا۔ آج تک قاتلوں کا سراغ نہیں ملا۔ والدہ نے یہ بھی بتایا کہ قتل کرنے کی وجہ محض میرے خاوند کی اپنی پسند کی شادی تھی"۔

چوہدری حشمت خان نے جب یہ سب کچھ سنا تو اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

"ایک بات تو بتاؤ بیٹی! تمہاری ماں کا نام سکینہ تو نہیں یعنی ماسٹر بشیر کی بیٹی"۔

جب جنت نے اپنی ماں کا نام چوہدری کی زبانی سنا تو وہ بھی حیران اور پریشان ہوگئی۔ پھر پوچھا۔ "آپ میری ماں کو کیسے جانتے ہیں، اس کا نام سکینہ ہی ہے"۔

"بیٹا! کیا بتاؤں سوچ رہا ہوں تقدیر نے مجھے کس موڑ پر لا کھڑا کیا ہے۔ میں تمہارے مرحوم والد کا بدنصیب باپ چوہدری حشمت خان ہوں"۔ اس نے کہا۔ "تم تو ہمارا خون ہو"۔ پھر جی بھر کے چوہدری حشمت خان نے اسے پیار کیا، گلے لگایا۔ جنت بھی غمی خوشی کے ملے جلے جذبات میں مبتلا ہوگئی اور کہا ٹھیک ہے وہ ویک اینڈ میں اپنے گھر جائے گی تو یہ ساری صورت حال اپنی ماں کو بتائے گی۔

ویک اینڈ پر جب ڈاکٹر جنت اپنے گھر گئی تو اس نے ساری صورت حال اپنی ماں کو بتائی کہ اس کے ہسپتال میں ایک مریض زیر علاج ہے اور وہ اسے اپنی پوتی کہتا ہے۔ اس شخص نے تو یہاں تک کہ آپ کا نام بھی بتادیا اس کی بہو کا نام سکینہ تھا۔

جب سکینہ نے یہ سب کچھ سنا تو وہ سخت پریشان ہو گئی۔ کیونکہ اسے یہ بھی ڈر اور خوف تھا کہ یہ لوگ اگر اس کے سسرال والے ہیں جنہوں نے اسے اپنے گھر کی بہو ماننے سے انکار کیا تو پھر وہ ضرور اس کی بیٹی سے بھی بدلہ لیں گے۔ یہ تو بڑے ظالم لوگ ہیں۔ انہی لوگوں نے اس کا سہاگ لوٹا اور اس کا گھر برباد کردیا۔

"بیٹی! خبردار، ان لوگوں سے دور اور محتاط رہو"۔ سکینہ نے بیٹی سے کہا۔ "کہیں وہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔ میرا تو مشورہ بھی ہوگا ان لوگوں سے راہ و رسم توڑ دو۔ اسی میں تمہاری بہتری ہے"۔

"نہیں، نہیں...... امی جان! ایسی بات بھی نہیں میں ایک پڑھی لکھی لڑکی ہوں اور اس قسم کے حالات کا مقابلہ کرسکتی ہوں۔ میں اتنی کمزور بھی نہیں جتنی آپ سمجھتی ہیں۔ وہ لوگ میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے"۔

"بیٹی! ان لوگوں نے ہمیں بہت دکھ دیئے ہیں"۔ والدہ نے کہا۔

"تو کیا ہوا امی جان!" جنت نے کہا۔ "اگر انہوں نے دکھ دیئے ہیں تو کیا ہوا، کچھ چیزیں انسان کے مقدر میں قدرت کی طرف سے لکھ دی جاتی ہیں۔ یہ سب قسمت کے کھیل ہوتے ہیں"۔

جنت اس سے پہلے نہیں جانتی تھی کہ اس کی شناخت کیا ہے اور وہ کس خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اب اسے شناخت ملنے لگی تھی تو وہ اس سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھی۔ وہ اپنے دادا کو پا کر بہت خوش تھی۔

"ہمیں ماضی کو بھول کر اب قریب ہونا ہوگا۔ ویسے وہ لوگ اتنے بُرے بھی نہیں، ان لوگوں کا اخلاق

پیار میرے ساتھ بہت مناسب ہے"۔ ڈاکٹر جنت نے اپنی امی کا منہ چومتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے بیٹی!" سکینہ نے اپنی جوانی کا وقت یاد کرتے ہوئے اس سے کہا۔ "تم اپنے فیصلے خود کرنے کی مجاز ہو، مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن تمہیں محتاط رہنا ہوگا"۔

ٹھیک دو مہینے بعد چوہدری حشمت خان کی صحت بہت بہتر ہوگئی اور اسے ہسپتال سے ڈسچارج کر کے گھر جانے کی اجازت مل گئی۔ چوہدری حشمت نے گھر پہنچ کر اپنے بیٹے قیصر سے جنت کے بارے میں بات کی کہ وہ اپنے پوتے حامد کے لئے اس کو پسند کر چکا ہے۔ قیصر اور اس کا بیٹا حامد جنت کو ہسپتال میں دیکھتے رہتے تھے۔ انہیں بھی وہ من موہنی سی ڈاکٹر اچھی لگتی تھی۔ لہٰذا فوراً مان گئے۔

چوہدری حشمت نے جنت سے اس کا رشتہ مانگنے کے لئے ان کے گھر آنے کی اجازت مانگی تو جنت نے ان کو بلا لیا۔

پروگرام کے مطابق چوہدری حامد کے والدین، ڈاکٹر کے گھر پہنچے۔ ڈاکٹر جنت پہلے سے گھر میں موجود تھی کیونکہ اسے یہ بھی خوف تھا کہ کہیں اس کی ماں سکینہ ان لوگوں سے ملنے سے انکار نہ کردے۔ ڈاکٹر جنت نے اپنی والدہ کو پہلے سے آگاہ کر رکھا تھا کہ وہ لوگ آج ان کے گھر ملنے آ رہے ہیں اور اس نے اپنے والد ماسٹر بشیر اور بھائیوں کو بھی گھر بلا رکھا تھا۔ وقت مقررہ پر مہمان مع چوہدری حامد، ڈاکٹر صاحبہ کے گھر پہنچ گئے۔ بڑی عزت و احترام کے ساتھ ان کو مہمان خانے میں بٹھایا گیا۔ جب سکینہ کی نظر چوہدری حشمت خان پر پڑی تو پریشان ہو گئی۔ اس کا سر گھومنے لگا، وہ کچھ عرصہ کے لئے ماضی کی بھول بھلیوں میں کھو گئی لیکن اسے یہ امید بالکل نہ تھی کہ وہ وقت بھی آئے گا جب اس کا سسر حشمت خان خود اس کے گھر اس کی بیٹی کے رشتہ کے لئے آئے گا۔

سکینہ کے ذہن میں گزرے واقعات کی فلم چلنے لگی تو اس نے طیش میں آ کر ان کو اپنی بیٹی کا رشتہ دینے سے صاف انکار کر دیا کہ ایسا ممکن نہ ہوگا۔ چوہدری حشمت خان کو سکینہ کے ساتھ کئے گئے مظالم یاد آنے لگے۔ اس نے سوچا۔ سکینہ بھی تو اس کے گھر کی بہو تھی اور ڈاکٹر جنت بھی اس کے بیٹے ہارون کا خون ہے۔ وہ ہر حالت میں یہ رشتہ اپنے پوتے کے لئے لے کر رہے گا۔ زبردستی کرنے کی تو اس میں اب سکت نہ تھی۔ لہٰذا اس نے اپنی شکست تسلیم کی اور سکینہ سے معافی مانگی۔ جو کچھ ماضی میں ہوا اسے بھول جائے اور بیٹی کے رشتہ کے لئے ہاں کہہ دے۔

چوہدری حشمت خان نے اپنی پگڑی سر سے اتاری اور سکینہ کے قدموں میں رکھ دی اور کہا کہ وہ انکار نہ کرے۔ ڈاکٹر جنت بھی سب کچھ دیکھ اور سن رہی تھی۔ ایک نظر اپنی ماں کی طرف دیکھا اور کہا۔

"امی جان! یہ ہمارے بزرگ ہیں۔ آپ ان لوگوں کو آپ معاف کر دیں اور رشتہ کے لئے ہاں کہہ دیں۔ سکینہ بھی سمجھ گئی کہ اس کی بیٹی کی رضا شامل ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور قریب ہی صوفے پر چوہدری حامد مؤدب بیٹھا ہوا تھا، اسے گلے لگایا۔ دو خاندان جو پہلے جدا جدا تھے اب نئے سرے سے ڈاکٹر جنت کی وجہ سے ایک ہو گئے۔ دونوں طرف سے مبارک مبارک کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ چوہدری حشمت خان نے سکینہ کے باپ ماسٹر بشیر کو گلے لگا کر مبارک باد دی۔ وہ بہت خوش بھی تھا اور ساتھ ساتھ قدرے شرمندہ بھی کیونکہ اُسے اپنا ماضی یاد آ رہا تھا۔ اس نے اپنی جہالت اور سنگ دلی سے جو جنت کھو دی تھی، وہ اسے دوبارہ مل گئی تھی لیکن اس کی قیمت اسے اپنے بیٹے کی صورت میں دینی پڑی تھی۔

قرآن شریف میں پوشیدہ حقائق

اللہ تعالیٰ اپنے سارے بندوں کو قرآنِ حکیم کے ذریعے کائنات کی تخلیق اور اس کے ذرّے ذرّے کی ماہیت کے بارے دعوت دیتا ہے کہ وہ اس کی کائنات اور قدرت و صناعی پر غور کیوں نہیں کرتے۔

انتخاب: ڈاکٹر رانا محمد اقبال

حیرت انگیز حقیقت ہے کہ قرآن پاک میں ان چیزوں یا اعمال کا ذکر ایک ہی تعداد میں آیا ہے جو ایک دوسرے کے برعکس ہیں یا قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ جیسے سب کو علم ہے کہ مرد اور عورت برابر ہیں۔ اب قرآن پاک میں دونوں کا ذکر چوبیس، چوبیس بار آیا ہے۔ یوں از رُوئے قواعدِ زبان بھی یہ بات درست ہے کہ مرد اور عورت برابر ہیں اور ریاضی سے بھی (24=24)۔

جب ڈاکٹر طارق علی نے متفرق سورتوں پر تحقیق کی تو ان پر یہ حیران کن انکشاف ہوا کہ پورے قرآن شریف میں ایک دوسرے کے برعکس یا قریبی چیزوں کو ایک ہی تعداد میں بیان فرمایا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی تحقیق قرآن پاک کی تعلیمات کے عین مطابق ہے اور جدید سائنس بھی ان کی تصدیق کرتی ہے۔ اب مندرجہ ذیل راز افشا نتائج پڑھیے۔

قرآن پاک میں جو الفاظ جتنی بار آئے ہیں ان کی تعداد آگے درج ہے۔

لفظ	تعداد	لفظ	تعداد
دنیا (زندگی کا ایک نام):	115	آخرت:	115
ملائکہ (فرشتے):	88	شیطان:	88
زندگی:	145	موت:	145
احسان:	50	گمراہی:	50
قوم (لوگ):	50	پیغمبر:	50
ابلیس:	11	ابلیس سے پناہ مانگو:	11
مصیبت:	75	شکر:	75
صدقہ:	73	اطمینان (تسلی):	73
گمراہ لوگ:	17	مردہ لوگ:	17
مسلمان:	41	جہاد:	41
سونا:	8	پر آسائش زندگی:	8

جادو:	60	فتنہ:	60
زکوٰۃ:	32	برکت:	32
عقل:	49	نور (روشنی):	49
زبان:	25	خطبہ:	25
خواہش:	8	خوف:	8
تبلیغ:	18	اشاعت:	18
سختی:	114	صبر:	114
حضرت محمدؐ:	4	سیرت نبویؐ:	4
مرد:	24	عورت:	24

اب مندرجہ ذیل الفاظ سے متعلق آنکھیں کھول دینے والے قرآن پاک کے عددی حقائق پڑھیں:

نماز:	5	(بار آیا ہے)
ماہ:	12	"
دن:	365	"
سمندر:	32	"
خشکی:	13	"

اگر سمندر اور خشکی کو جمع کریں تو جواب یہ آئے گا:
13+32=45 اب ریاضی کے درج ذیل حل دیکھئے:

% سمندر =71.1111111=100x32/45

% خشکی =28.88888889=100x13/45

جدید سائنس کے ذریعے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ زمین کے 71.111 فیصد حصے پر پانی ہے جبکہ 28.889 فیصد حصے پر خشکی ہے۔ قرآن پاک اور جدید سائنس کے ایک جیسے نتائج کیا اتفاقی حادثہ ہے؟ یہ حقائق کس ہستی نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتلائے تھے؟ جی ہاں، مالک کائنات نے آپ کو کائنات کے ہر راز سے کئی صدیاں پہلے آگاہ کر دیا تھا۔

قرآن پاک میں ارشاد ربانی ہے:

"(یہ) فرمان (کتاب) ہے جس کی آیتیں پختہ اور مفصل ارشاد ہوئی ہیں۔ ایک دانا اور باخبر ہستی کی طرف سے کہ تم صرف اللہ کی بندگی کرو۔" (11-1)

جواہر پارے

☆......مدد صرف اللہ سے مانگی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اپنوں سے مانگی جائے یا غیروں سے ایمان خراب کر دیتی ہے۔

☆......دونوں جہاں کا حاکم اللہ ہے اور غیب کا حال اس کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ اللہ ہر کسی کی سنتا ہے۔

☆......اصل قوت بازو اور تلوار کی نہیں ایمان کی ہوتی ہے۔

☆......جنگ صرف ہتھیاروں اور فوج سے نہیں جیتی جا سکتی بلکہ جذبے شکست کو فتح میں بدلتے ہیں۔

☆......کسی قوم نے اتنے غدار پیدا نہیں کیے جتنے مسلمانوں نے۔

("داستان ایمان فروشوں کی" از عنایت اللہ)

قرآن پاک میں حروف تہجی

کل پارے 30، سجدے 14، منزل 7، سورتیں 114، مکی 86، مدنی 28، رکوع 540، آیات 6666، حروف 323760، زبر 53243، زیر 39582، پیش 8804، مد 1771، شد 1243، نقطے 105681، الف 48872، با 11228، تا 1199، ثا 1276، جیم 3273، حا 973، خا 2416، د 5642، ذ 4897، ر 11793، ز 1590، س 5891، ش 2253، ص 2013، ض 1807، ط 1274، ظ 842، ع 92200، غ 2208، ف 842، ق 6813، ک 9522، ل 3432، م 28535، ن 28560، و 2556، ہ 19070، لام الف 3720، ء 4115، ی 25919۔

ضربِ سکندری

کیم نومبر کا سورج اہالیان گلگت بلتستان کے لیے آزادی کا پیغام لیکر طلوع ہوا۔ آزادی کی خبر جنگل کی آگ کی طرح تمام وادیوں میں پھیل گئی اور لوگوں کا ایک جمِ غفیر جمع ہو گیا جو پاگلوں کی طرح خوشی سے ناچ رہے تھے۔

انقلابِ گلگت

☆ .... سکندر خان بلوچ

31 اکتوبر 1947 کی شام کو جب رات کی تاریکی نے نانگا پربت اور کے ٹو کی چوٹیوں کو اپنے دامن میں چھپایا تو علاقے کی تاریخ ایک نیا باب رقم کرنے کے لئے تیار تھی۔ اس رات نانگا پربت کے دامن میں، دنیا کے عظیم پہاڑوں کے قدموں میں اور اباسین کے کناروں پر علاقے کے ایک چھوٹے سے قصبے گلگت میں چند سر پھرے مجاہدین آزادی نے غلامی کی سیاہ رات ختم کر دی۔ کشمیر کی ڈوگرہ حکومت کی غلامی کی زنجیریں توڑ ڈالیں۔ یہ ایک رات تاریخ ساز ثابت ہوئی۔ 31 اکتوبر کی شام تک نانگا پربت کی وادی کشمیر کے ڈوگروں کی

غلام تھی لیکن یکم نومبر 1947 کا سورج آزادی کا پرچم لے کر طلوع ہوا۔ طلوعِ صبح کے ساتھ ہی گلگت کی چھوٹی سی وادی آزادی کے نور سے منور ہوئی۔ گلگت کے باشندے آزاد اور خود مختار قوم کی حیثیت سے غلامی کی گراں خوابی سے بیدار ہوئے۔ گلگت کا یہ چھوٹا سا قصبہ آزاد جمہوریہ گلگت بن گیا۔ اس ایک رات میں علاقے کی تاریخ بدل گئی۔

''گلگت'' ہمارے شمالی علاقہ جات جس کا نیا نام گلگت بلتستان ہے کا صدر مقام ہے۔ ہمارا یہ خطہ ارض دنیا کی بلند ترین چوٹیوں، دیوہیکل پہاڑوں، عظیم برفانی تودوں، خوبصورت نیلگوں جھیلوں، پُرجوش و سرکش دریاؤں، خوبصورت پھولوں، حسین وادیوں اور خوبصورت لوگوں کی سرزمین ہے۔ یہ وہ خطہ ہے جہاں دنیا کے تین عظیم پہاڑی سلسلے یعنی کوہ ہندوکش۔ کوہ قراقرم اور عظیم ہمالیہ تینوں ایک دوسرے کو اسی سرزمین پر گلے ملتے ہیں۔ قطب شمالی کے بعد سب سے بڑے گلیشیرز بھی اسی سرزمین کی زینت ہیں۔ ماؤنٹ ایورسٹ کے بعد دنیا کی بلند ترین چوٹی کے۔ٹو بھی اسی سرزمین کا فخر ہے۔ دنیا کی سب سے زیادہ خطرناک چوٹی نانگا پربت جسے دنیا Killer Mountain کے نام سے بھی یاد کرتی ہے اور دنیا کی خوبصورت ترین چوٹی راکاپوشی بھی اسی خطے کی محافظ ہیں۔ کم از کم ایک درجن بیس ہزار فٹ سے بلند چوٹیاں بھی اسی سرزمین کا جھومر ہیں۔ بقول لوک کہانیوں کے یہ چوٹیاں پریوں کا مسکن ہیں۔ دریاؤں کا باپ ''اباسین'' جو صدیوں سے اپنے کناروں سے حالتِ جنگ میں ہے جس نے سنگلاخ پہاڑوں کا سینہ چیر کر اپنے لیے راستہ بنایا ہے وہ بھی اپنے تمام تر غصے۔ شورش اور خودسری کے ساتھ اسی سرزمین سے گزرتا ہے۔ بلند پہاڑوں کی وجہ سے اسے دنیا کی چھت بھی کہا جاتا ہے۔

ان عظیم پہاڑی سلسلوں کی مغرور چوٹیاں اور ان پر رہائشی پریاں اپنے دامن میں شاید انسانی زندگی برداشت نہ کرتیں اگر اباسین اور اس کے سینکڑوں کی تعداد میں معاون ندی نالے ان پہاڑوں کے غرور کو توڑ کر اپنے لیے راستہ نہ بناتے۔ اباسین اور اس کے معاون دریاؤں کی وجہ سے ہی ان کے کناروں پر پہاڑوں اور دریاؤں کے درمیان زمینی ٹکڑے معرضِ وجود میں آئے جنہیں انسانوں نے وادیوں کا نام دیا اور ان وادیوں کو اپنا مسکن بنایا۔ قدرت نے ان وادیوں کو خوبصورت پھولوں اور پھلدار درختوں سے سجایا تو یوں پریوں کا یہ دیس خوبصورت لوگوں کا مسکن بن گیا۔ یہاں کی تمام آبادیاں انہی دریاؤں اور ندی نالوں کے کناروں پر آباد ہیں۔ علاقے میں کوئی بڑا شہر نہیں۔ اس علاقے کے ماضی میں کوئی بڑی سلطنت بھی یہاں نہیں رہی۔ ان سربفلک پہاڑوں نے علاقے کو تاریخ کے بے رحم ہاتھوں اور فاتحین کی قتل و غارت سے بھی محفوظ رکھا۔ کسی بڑے بادشاہ یا جرنیل کو اس علاقے میں مہم جوئی کا خیال نہ آیا۔ لہٰذا پورا علاقہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم رہا جن پر علاقے کے میر یا راجے حکومت کرتے رہے۔ اگر کبھی علاقے کے کسی میر یا راجے نے اپنی سلطنت بڑھائی بھی تو وہ بھی دیرپا ثابت نہ ہوئی کیونکہ علاقے میں ذرائع آمد ورفت ناپید اور موسم بے رحم ہے۔

1842 میں پہلی دفعہ یہ علاقے تاریخ کے بڑے دھارے میں آئے بلکہ دھکیل دیے گئے اور یہ کام کیا تھا کشمیر کی سکھ فوج نے۔ سکھ فوج کے جرنیل نتھو شاہ نے 1842 میں یہ علاقہ فتح کر کے سکھ سٹیٹ کشمیر میں شامل کیا۔ فتح کے باوجود سکھ یہاں پُرامن حکومت قائم نہ کر سکے کیونکہ علاقے کے کچھ شوریدہ سر میروں اور راجوں نے سکھوں کا ناک میں دم کیے رکھا جن میں سب سے مشہور وادی یاسین اور گلگت کا راجہ گوہر امان ثابت ہوا

جس نے کئی بار سکھوں اور ڈوگروں کو عبرتناک شکست سے دوچار کیا۔ 1846ء میں معاہدہ امرتسر کے مطابق کشمیر طالع آزما ڈوگرہ سردار گلاب سنگھ کو بیچ دیا گیا جس نے مہاراجہ بن کر اپنی حکومت شروع کی اور گلگت بلتستان کو قابو میں رکھنے کے لیے ظلم و آمریت کا ایسا نظام قائم کیا کہ یہ لوگ سر نہ اٹھا سکیں۔

1857 کی جنگ آزادی کے بعد انگریزوں نے پورے ہندوستان پر حکومت کرنے کا فیصلہ کیا اور آہستہ آہستہ تمام علاقوں کو زیر کر لیا۔ اسی دوران ایشیا میں اشتراکی روس بھی اپنی طاقت بڑھا رہا تھا۔ اس نے بھی آہستہ آہستہ وسط ایشیا کی تمام مسلمان ریاستیں فتح کر کے روس میں ضم کر لیں۔ اب روس کوہ ہندوکش کے اس طرف اثر بڑھانے کا خواہشمند تھا۔ یہ علاقہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا تھا اور ان ریاستوں کے حکمران راجے اور میر ہمیشہ آپس میں دست و گریباں رہتے۔ ایسے لوگوں کو زیر کرنا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ میر آف ہنزا کے پامیر میں چین اور آگے روس سے تعلقات بھی تھے۔ حالات کا اندازہ لگانے کے لیے کچھ روسی فوجی افسران کی علاقے میں آمد کی اطلاعات بھی تھیں۔

روس کا اثر روکنے کے لئے انگریزوں نے 1877 میں گلگت ایجنسی قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور کیپٹن جان بڈلف علاقے کا پہلا پولیٹیکل ایجنٹ مقرر ہوا لیکن روس چین اور شمالی علاقہ جات کے درمیان کوئی واضح سرحد نہ ہونے کی وجہ سے روسی دخل اندازی کے خطرے کو ٹالا نہیں جا سکتا تھا۔ لہٰذا برطانوی حکومت نے اس علاقے میں واضح حد بندی کا فیصلہ کیا جس کے لئے 1889 میں کرنل الگرنن ڈیورنڈ کو پولیٹیکل ایجنٹ مقرر کیا گیا جس کی پہلی ترجیح علاقے کے راجگان اور میروں کا اعتماد حاصل کرنے کے بعد پھر ان عظیم پہاڑوں میں حد بندی کرنا تھی۔ کرنل ڈیورنڈ نے یہ کام بخیر و خوبی سرانجام دیا۔ بعد میں اپنے تجربات و مشاہدات اپنی کتاب Making of a Frontier میں درج کیے۔ یہ کتاب علاقے کی تاریخ کے ساتھ ساتھ علاقے کی تہذیب و ثقافت پر بھی بہت مؤثر انداز میں روشنی ڈالتی ہے۔ اس سے ڈوگروں کی طرف سے علاقے میں روا رکھے گئے ظلم کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ گلگتی تو پھر بھی کسی نہ کسی حد تک ڈوگروں کا مقابلہ کر کے ان کے ظلم و ستم سے بچ جاتے لیکن بلتی اس ظلم کا خصوصی نشانہ بنتے۔

ڈوگرہ دور کے حالات پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان لوگوں کو ڈوگرے بھیڑ بکری جتنی وقعت بھی نہ دیتے نہ ہی انہیں انسان سمجھتے۔ یہ لوگ ڈوگرہ فوج کے مظالم سہہ سہہ کر اتنے خائف تھے کہ پاکستان بننے کے بہت بعد تک فوجیوں کو دیکھ کر چھپ جاتے۔ اس قسم کا ایک واقعہ مجھے 1971 میں اس وقت پیش آیا جب میں ناردرن سکاؤٹس کے ساتھ گلگت میں سروس کر رہا تھا۔ شمالی علاقہ جات کی سرحدوں کی حفاظت مکمل طور پر سکاؤٹس کی ذمہ داری تھی اس لئے پوری سرحد کے ساتھ ساتھ ہماری پوسٹیں تھیں۔ فارورڈ ایریا میں تقریباً بارہ ہزار فٹ کی بلند پہاڑی پر "کلیشائی دوم" نام کی ہماری ایک پوسٹ تھی۔ سامنے بھارتی تھے۔ میں وہاں وزٹ پر گیا۔ دو دن وہاں ٹھہرنے کے بعد تیسرے دن واپس روانہ ہوا۔ پہاڑ پر جتنی چڑھائی مشکل ہوتی ہے اترائی اتنی مشکل نہیں ہوتی لیکن وہاں راستے بہت تنگ ہیں اور معمولی سی غلطی ہزاروں فٹ گہرے کھڈ میں لے جا سکتی ہے۔ ہمارے جیسے میدانی علاقے کے باسی خصوصاً بہت احتیاط سے نیچے اترتے ہیں۔ میں گھوڑے پر سوار تھا اور گھوڑ سواری کا بچپن سے شوقین ہوں۔ کئی دفعہ اپنے گاؤں کے گھوڑ سواری کے مقابلوں میں حصہ بھی لیا لیکن ان بلند پہاڑوں پر خصوصاً اترائی کے وقت میرے لئے گھوڑے پر توازن قائم رکھنا مشکل ہو جاتا تھا۔

اس پہاڑ کی اترائی بھی ذرا عمودی قسم کی تھی اس لئے گھوڑے سے اتر کر میں نے بہت احتیاط سے نیچے پیدل اترنا شروع کیا۔ سامنے سے ایک بوڑھا مرد اور ایک بوڑھی عورت بڑی مشکل سے اوپر چڑھتے نظر آئے۔ دونوں کے سروں پر بوجھ تھا جس میں شاید راشن وغیرہ تھا۔ جونہی ہم نزدیک پہنچے بوڑھی عورت اور بوڑھا مرد دونوں راستے سے کافی دور ہٹ گئے جہاں چڑھائی اور بھی مشکل تھی۔ مجھے ان کے راستہ چھوڑنے کی وجہ سمجھ نہ آئی۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے اس بوڑھے سے پوچھ ہی لیا کہ ”آپ نے راستہ کیوں چھوڑا ہے؟“

اس نے ہاتھ باندھ کر جواب دیا۔

”جناب جس راستے پر آپ چلیں اسی پر ہم بھی چلیں تو یہ آپ کی بے ادبی ہوگی۔“

جواب سن کر مجھے بہت دکھ ہوا۔ ساتھ چلتے ہوئے ایک بلتی سپاہی سے میں نے وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ ڈوگرہ دور میں جب کوئی فوجی یا سرکاری آفیسر چلتا تھا تو بلتیوں کو سامنے چلنے کی اجازت نہ تھی۔

بات ذرا موضوع سے ہٹ گئی ہے لہٰذا واپس آتے ہیں تاریخ شمالی علاقہ جات کی طرف۔ روس اور برطانوی ہند کے درمیان اپنا اپنا اثر بڑھانے کی کوششیں جاری رہیں۔ بالآخر 1935 میں برطانوی حکومت نے یہ علاقہ مہاراجہ کشمیر سے 60 سالوں کے لیے پٹے پر لے لیا۔ انگریزوں نے یہاں آ کر کشمیر ریاستی فوج کو بے دخل تو نہ کیا البتہ انہیں منظم کیا اور احکامات کے لیے وہ پولیٹیکل ایجنٹ گلگت کے تحت کر دی گئی جو انگریز تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ ضرورت کے مطابق کچھ انڈین آرمی بھی لائی گئی خصوصاً انجینئرز اور ڈاکٹرز وغیرہ تاکہ علاقے میں پُل تعمیر کیے جائیں۔ ذرائع آمد و رفت کو بہتر کیا جائے اور علاقے میں فوج۔ ریاستی اہلکار۔ میروں اور راجوں کو کسی حد تک طبی سہولتیں فراہم کی جائیں۔

کرنل ڈیورنڈ نے محسوس کیا کہ علاقے کے بہتر نظم و نسق کے لئے کسی لوکل فورس کا ہونا ضروری ہے جس سے امن و امان بھی قابو میں رہے اور مقامی لوگوں کو روزگار بھی ملے۔ لہٰذا اس نے یہاں پر ایک لوکل لیوی قائم کی۔ انہیں فوجی تربیت دی گئی اور کئی ایک علاقائی مہمات میں بھی استعمال کیا گیا۔ لیوی کے جوانوں نے شاندار خدمات سر انجام دیں۔ 1913 میں لیوی نظام ختم کر کے اس کی جگہ گلگت سکاؤٹس کی تنظیم قائم کی گئی۔ ابتدا میں تو یہ تنظیم جز وقتی تھی۔ سال میں صرف ایک ماہ تربیت دی جاتی۔ دورانِ تربیت 12 روپے ماہوار تنخواہ ملتی اور باقی گیارہ ماہ لوگ گھروں میں رہتے اور ایک روپیہ ماہانہ تنخواہ لیتے۔ بوقتِ ضرورت انہیں بلا لیا جاتا۔ 1935 میں جب برطانوی ہند نے یہ علاقہ پٹے پر لیا تو گلگت سکاؤٹس کو کل وقتی تنظیم کے طور پر منظم کیا اور اسے دفاع کی ذمہ داری بھی سونپ دی۔ ریاستی فوج کو گلگت سے 35 میل جنوب بونجی کے مقام پر منتقل کر دیا گیا۔

گلگت سکاؤٹس کی کل نفری 562 تھی جس میں ہنزہ اور نگر کی ایک ایک کمپنی (300 افراد) اور باقی 50-50 افراد پر مشتمل چار پلاٹونیں علاقے کی باقی ریاستوں جیسے نیپال، یاسین، گوپس اور گلگت سے لی جاتی تھیں تمام کمیشنڈ عہدے مقامی راجگان اور میروں کے فرزندوں کے لئے مخصوص تھے لیکن کبھی کبھار دوسرے لوگوں کو بھی ترقی دے دی جاتی۔ یہ عہدیدار VCOs کہلاتے یعنی وائسرائے کمیشنڈ آفیسرز (صوبیدار اور جمعدار وغیرہ) جس کا کلی اختیار پولیٹیکل ایجنٹ کو تھا۔ ان لوگوں کا ایک خاص معیار زندگی تھا۔ پرائیویٹ نوکر اور گھوڑے رکھنے کی اجازت تھی۔ سکاؤٹس میں انگریزوں کے بعد یہ سب سے اہم لوگ تھے۔ بہر حال یونٹ کی کمان انگریز افسران کے ہاتھ میں ہی رہی۔ سکاؤٹس کی گلگت کے علاوہ گوپس۔ چلاس اور

قلندرچی میں بھی پوسٹیں تھی۔ چلاس ان میں اہم تھا جہاں سکاؤٹس کا نائب کمانڈر عموماً کیپٹن یا لیفٹیننٹ رہتا تھا۔

1840 تک اس علاقے کا بیرونی دنیا سے کوئی خاص رابطہ نہ تھا۔ کبھی کبھار چین کے لوگ بلند پہاڑی دروں کو عبور کر کے اس طرف آجاتے یا یہاں کے لوگ ضروریات زندگی کے حصول کے لئے اُدھر چلے جاتے۔ ہاں البتہ ہنزہ کے لوگوں کا تعلق باہر کے چینی علاقے خصوصاً یارقند سے تھا۔ سکھوں اور ڈوگروں کی آمد کے ساتھ ان لوگوں کا تعلق سرینگر سے قائم ہوا۔ گلگت کی طرف سے بونجی۔ استور۔ درہ برزل۔ وادی کشن گنگا۔ بانڈی پورہ اور سری نگر جبکہ سکردو کی طرف سے دریائے سکردو کے ساتھ ساتھ کارگل۔ درہ زوجیلہ اور سری نگر۔ لیکن یہ راستے محض گھوڑوں اور خچروں تک کے لیے محدود تھے کسی بڑی فوج کی نقل و حرکت ممکن نہ تھی اور یہ کم سے کم ایک ہفتے سے دس دنوں کا راستہ تھا۔ پنڈی سے گلگت تک Goat Track پگڈنڈی براستہ بابوسر پاس اور دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ تھی۔ یہ راستہ تقریباً 400 میل طویل تھا جو علاقے میں بکریاں چرانے والے چرواہے استعمال کرتے تھے۔ لوگوں کا اس علاقے سے کسی قسم کا ثقافتی، معاشی یا تجارتی رابطہ نہ تھا۔

معاشی حالت ہمیشہ تعلیم کے ساتھ بدلتی ہے اور تعلیم یہاں نہ ہونے کے برابر تھی۔ سکھوں اور ڈوگروں کے دور میں تو یہاں تعلیم کا کسی قسم کا رواج نہ تھا۔ یہ لوگ محض باربرداری کے لئے تھے۔ البتہ کرنل ڈیورنڈ نے یہاں آنے کے بعد تین مختلف وادیوں میں 1893 میں پرائمری سکول کھولے جن کا بنیادی مقصد اپنے سٹاف اور راجگان کے بچوں کو تعلیم دینا تھا تا کہ انگریزوں کی بہتر خدمت کر سکیں۔ ان سکولوں کو 1911 میں مڈل کا درجہ دیا گیا اور 1914 میں صرف گلگت میں لڑکیوں کے لئے بھی ایک پرائمری سکول کھولا گیا۔ البتہ یہ علاقہ بٹے پر لینے کے بعد انگریزوں نے مزید پرائمری سکول کھولے۔ بقول گروپ کیپٹن ریٹائرڈ میرزادہ محمد شاہ خان کے آزادی کے وقت پورے علاقے میں 3 مڈل سکول اور 85 پرائمری سکول تھے۔ پہلا ہائی سکول یہاں پاکستان بننے کے بعد 1949 میں بنا اور 1960 میں اسے انٹر کالج کا درجہ دے دیا گیا۔ ان سکولوں کے پس منظر میں تعلیمی ترقی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مڈل سے اوپر تعلیم کے لئے لوگوں کو سری نگر جانا پڑتا تھا جس کے لیے ان کے پاس وسائل نہ تھے۔

دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد پورے ہندوستان میں تحریک آزادی نے زور پکڑا تو اس کی تھوڑی بہت خبریں براستہ سری نگر شمالی علاقہ جات میں بھی پہنچنی شروع ہوئیں۔ یہ بھی زیادہ تر مزدوروں اور سرکاری ملازمین کے توسط سے۔ علاقے میں اخبارات نہیں آتے تھے سوائے سرکاری دفاتر کے جن تک عوام کی پہنچ نہ تھی۔ ریڈیو پورے علاقے میں شاید کسی میر یا راجے کے پاس ہو تو ہو عوام کے پاس نہ تھے۔ بلند پہاڑوں کی وجہ سے نہ ہی ریڈیو وہاں کامیاب تھے۔ ریسپشن اول تو تھی نہیں اور اگر کبھی ہوتی بھی تھی تو بہت کمزور۔ 1947 میں ایسی افواہیں سننے میں آئیں کہ انگریز ہندوستان چھوڑ کر جا رہے ہیں اور ہندوستان دو ملکوں میں تقسیم ہو رہا ہے اور وہ ہیں پاکستان اور ہندوستان۔ مزید یہ کہ پاکستان گلگت سے ملحق ہے اور یہ مسلمان ملک ہے۔ اول تو انہیں انگریزوں کے یہاں سے جانے والی خبر پر اعتماد نہیں تھا اور اگر بالفرض وہ چلے بھی گئے تو یقیناً یہ علاقہ پاکستان کے ساتھ ہوگا کیونکہ علاقے کی 90 فیصد آبادی مسلمان تھی۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔

14 اگست کو پاکستان بن گیا۔ مہاراجہ کشمیر نے پاکستان اور ہندوستان کے ساتھ Standstill معاہدہ

کرلیا۔ انگریزوں نے پٹے پر لیا ہوا یہ علاقہ مہاراجہ کشمیر کو واپس کر دیا۔ آخری برطانوی پولیٹیکل ایجنٹ کرنل آر۔ اے۔ بیکن کی جگہ مہاراجہ کی طرف سے بریگیڈیئر گنسارا سنگھ علاقے کا گورنر بن کر آ گیا۔ مہاراجہ ہی کی طرف سے برطانوی آفیسر میجر ولیم براؤن کو گلگت سکاؤٹس کا کمانڈنٹ مقرر کر دیا گیا۔ یہ آفیسر پہلے یہاں خدمات سر انجام دے چکا تھا۔ علاقے سے واقف تھا۔ اب جب اس نے اپنی خدمات مہاراجہ کے سپرد کیں تو G.H.Q سری نگر نے اسے گلگت پوسٹ کر دیا۔ چلاس میں نائب کمانڈر برطانوی آفیسر کیپٹن میتھیسن تھا۔ مہاراجہ کشمیر اپنی ریاست کو آزاد رکھنا چاہتا تھا اسی لئے اس نے معاہدہ "سٹینڈسٹل" کیا تا کہ اسے مرضی کے نتائج حاصل کرنے کے لیے وقت مل جائے۔ اس معاہدے کے ساتھ ہی کشمیر میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہونی شروع ہو گئیں۔ ایک تو مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوا جس کے لیے ہندوستان سے مسلح انتہا پسند ہندو اور سکھوں کی تنظیمیں بلائی گئیں۔ دوسرا ریاستی فوج میں مسلمان آفیسرز پر اعتماد ختم ہو گیا۔ جس مسلمان آفیسر پر ذرا برابر بھی شک ہوتا اسے حراست میں لے لیا جاتا یا پھر اسے دور دراز کے علاقوں میں تبدیل کر دیا جاتا۔ انہی میں ایک نوجوان۔ جوشیلا اور آزادی پسند آفیسر کیپٹن مرزا حسن خان بھی تھا جو گلگت ہی کا رہائشی تھا۔ اس آفیسر کو ناپسندیدہ قرار دے کر سری نگر سے بونجی تبدیل کر دیا گیا۔ یہ آفیسر جب سری نگر سے روانہ ہوا تو راستے میں تمام مسلمان آبادیوں میں مہاراجہ کے خلاف ظلم و ستم کی داستانیں سنا سنا کر آزادی کی ترغیب دیتا گیا جس کا بہت مثبت اثر ہوا۔ بہت سے جوشیلے نوجوان آزادی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ بہر حال یہ آفیسر بونجی پہنچا اور مسلمان کمپنی کا کمپنی کمانڈر تعینات ہوا۔

بونجی میں 6 جموں و کشمیر بٹالین تعینات تھی۔ یاد رہے کہ بونجی گلگت سے 35 میل جنوب میں دریائے سندھ اور دریائے استور کے سنگم پر ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ وہاں پر ایک اہم چھاؤنی تھی اور اب بھی ہے جہاں یہ یونٹ مقیم تھی۔ گلگت تک دو دنوں کا سفر تھا۔ اس یونٹ کی کمان لیفٹیننٹ کرنل عبدالمجید کے پاس تھی۔ گو یہ آفیسر مسلمان تھا لیکن مہاراجہ کا بہت ہی وفادار ملازم۔ مہاراجہ کے خلاف تو یہ کسی قسم کی بات سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس یونٹ میں ایک سکھ۔ ایک ڈوگرہ کمپنی اور دو کمپنیاں پونچھ کے علاقے سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کی تھیں جس میں سے ایک کمپنی سکردو اور اس کے گرد و نواح میں بکھری تھی اور دوسری کی کمان کیپٹن مرزا حسن خان کو ملی جو یہاں پہنچ کر گلگت کی آزادی کے منصوبے بنانے لگا۔

اگست 1947 کے آخری ہفتہ میں صورت حال بڑی غیر یقینی کا شکار تھی۔ بریگیڈیئر گنسارا سنگھ بطور گورنر اقتدار سنبھال چکا تھا۔ گلگت سکاؤٹس کی کمان بھی مہاراجہ کی مرضی کے مطابق تبدیل ہو چکی تھی۔ حکومت پاکستان کے متعلق کوئی زیادہ علم نہ تھا نہ ہی رابطہ نہ ہی کسی سے جان پہچان۔ علاقے کی واحد مسلح تنظیم گلگت سکاؤٹس تھے جو صرف چھوٹے ہتھیاروں سے لیس تھے اور ان میں سے بھی سوائے ایک کمپنی کے باقی لوگ باہر پوسٹوں پر تعینات تھے جنھیں گلگت پہنچنے کے لیے 3 سے 4 دن درکار تھے جبکہ ریاستی فوج 2 دنوں کی مسافت پر بونجی میں موجود تھی۔ حالات کے مطابق ایک دفعہ پھر ڈوگروں کی غلامی سامنے نظر آ رہی تھی اور ڈوگروں کی غلامی کس قسم کی ہو سکتی تھی وہ کوئی لوگوں سے خفیہ نہ تھی۔ ہیڈ کوارٹرز گلگت سکاؤٹس میں اس وقت 6 VCOs موجود تھے۔ ان میں سے تین کا تعلق نگر سے تھا اور تین کا ہنزہ سے۔ یاد رہے کہ یہ دونوں ریاستیں علاقے کی سب سے بڑی ریاستیں شمار ہوتی ہیں۔ دونوں ریاستوں کا ایک ہی علاقہ ہے

صرف درمیان میں دریائے ہنزہ انہیں تقسیم کرتا ہے۔ دونوں حکومتی خاندانوں کی آپس میں گہری رشتہ داریاں ہیں۔

ان چھ VCOs میں دو اہم ترین VCOs تھے صوبیدار میجر محمد بابر خان جس کا تعلق نگر کے شاہی خاندان سے تھا اور میر آف نگر کا سگا چچا تھا اور دوسرا جمعدار میر زادہ محمد شاہ خان تھا جس کا تعلق ہنزہ کے شاہی خاندان سے تھا اور وہ میر آف ہنزہ کا سگا چچا تھا۔ برطانوی افسران کے بعد یہ دونوں VCOs بہت اہم اور بااثر شمار ہوتے تھے۔ سکاؤٹس کے باقی VCOs اور تمام جوان ان کی بہت عزت کرتے۔ حالات اب جو بھی رخ اختیار کرتے انہیں سنبھالنا ان لوگوں کی ذمہ داری تھی۔

اسی دوران چند اور اہم واقعات رُونما ہوئے۔ اول۔ مہاراجہ کشمیر نے علاقے کے تمام راجگان اور میروں کو سری نگر بلایا۔ انہیں پاکستان کے خلاف بھڑکایا۔ مہاراجہ کے زیرِ نگیں رہنے کی صورت میں اپنی اپنی ریاستوں کی آزادی اور مہاراجہ کی طرف سے بہت سی امداد کا لالچ دیا۔ ہوسکتا ہے یہ لوگ دل سے پاکستان کے حامی ہوں لیکن اب زمینی حقائق کے پیشِ نظر ان تمام حضرات نے مہاراجہ کی تابعداری قبول کر لی۔ دوم پاکستان سے ملحق کشمیری علاقوں میں مقامی لوگوں نے مہاراجہ کی حکمرانی قبول کرنے سے انکار کردیا اور کچھ نے تو آزادی کے لیے کچھ لشکر بھی تیار کر لیے۔ غالباً یہ تحریک عبدالقیوم خان سے شروع ہوئی تھی۔ کشمیر کی آزادی کے لیے قبائلی لشکر کشمیر میں داخل ہوگئے جن کی کامیابی کی خبریں مسلسل پہنچ رہی تھیں۔ سوم اور سب سے اہم یہ کہ ریاستی فوج بونجی سے گلگت سکاؤٹس کی بیرکس میں منتقل کی جائے گی اور سکاؤٹس ان کے ماتحت ہوں گے۔

تیسری خبر نے سکاؤٹس کو آگ بگولہ کر دیا۔ گلگت سکاؤٹس علاقے کے جوانوں پر مشتمل یونٹ تھی۔ نوجوان اس سروس میں آنے پر فخر محسوس کرتے۔ علاقے کے لوگ بھی انہیں عزت اور تعظیم کی نظر سے دیکھتے۔ VCOs کا ایک خاص مقام تھا۔ بہت سی مراعات تھیں۔ بہت عزت تھی۔ اور اب اگر ریاستی فوج وہاں آجاتی تو نہ صرف علاقے کے نوجوانوں کا روزگار ان سے چھن جاتا بلکہ VCOs کو ریاستی فوج کے جے سی اوز کے تحت سروس کرنی پڑے گی اور تمام مراعات سے دستبردار ہونا پڑے گا جو بہت بڑی بے عزتی کے مترادف تھا اور کسی صورت قابلِ قبول نہ تھا۔

لہٰذا ان چھ اشخاص نے فیصلہ کیا کہ گنسارا سنگھ سے مل کر وضاحت طلب کی جائے کہ ریاستی فوج کے گلگت آنے کی صورت میں سکاؤٹس کا کیا مرتبہ ہوگا اور سکاؤٹس کی بیرکس جو سکاؤٹس کی ملکیت تھی کا کیا بنے گا؟ بہر حال بریگیڈیئر گنسارا سنگھ سے انٹرویو لیا گیا۔ صوبیدار میجر محمد بابر خان نے اپنے تمام خدشات سے گورنر کو آگاہ کیا لیکن وہاں سے کوئی تسلی بخش جواب نہ ملا۔ چند روز بعد صورت حال واضح ہوگئی کہ سکاؤٹس کی بیرکس ریاستی فوج کو دی جائیں گی اور سکاؤٹس فوج کے انڈر کمانڈ ہوں گے۔

حالات پر غور کرنے کے لیے 27 اگست کی شام کو دوسری میٹنگ ہوئی۔ یہ چھ VCOs (۱) صوبیدار میجر محمد بابر خان (نگر) (۲) صوبیدار صفی اللہ بیگ (ہنزہ) (۳) جمعدار فدا علی (ہنزہ) (۴) جمعدار سلطان فیروز صوفی (نگر) (۵) جمعدار شاہ سلطان (نگر) اور (۶) جمعدار محمد شاہ خان (ہنزہ) شامل تھے۔ تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ ڈوگرہ حکومت کو بزور طاقت ختم کرکے پاکستان سے الحاق کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے صوبیدار میجر محمد بابر خان اور جمعدار محمد شاہ خان کو ذمہ داری سونپی گئی کہ باقی پوسٹوں پر تمام VCOs سے رابطہ کرکے ان کی رائے لی جائے اور تعاون حاصل کیا جائے۔ ان کے علاوہ گلگت سکاؤٹس

میں مسلمان افسران کیپٹن محمد سعید درانی اور سیکنڈ لیفٹیننٹ غلام حیدر بھی موجود تھے۔ فیصلہ کیا گیا کہ سکاؤٹس کا تعاون حاصل ہونے کے بعد ان دو افسران اور یونٹ میں موجود کیپٹن مرزا حسن خان (کمپنی کمانڈر) اور کیپٹن محمد خان جرال (یونٹ کوارٹر ماسٹر) سے بھی تعاون کی درخواست کی جائے۔ اس سلسلے میں کچھ بااثر سویلین کی مدد کا بھی سوچا گیا لیکن راز افشا ہونے کا خطرہ تھا۔

ستمبر اور اکتوبر اسی شش و پنج میں گزرے کہ انقلاب کیسے کامیاب بنایا جائے۔ انسان کتنا ہی بہادر اور سمجھدار کیوں نہ ہو یہ چند VCOs یا سکاؤٹس کے چند لوگ مل کر بھی ڈوگرہ طاقت کو چیلنج نہیں کر سکتے تھے۔ بہر حال ان لوگوں نے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ گلگت سکاؤٹس کے باقی VCOs کو اعتماد میں لیا گیا۔ صرف ایک VCO نے ساتھ ملنے سے انکار کیا۔ اسے قتل کرنے کی دھمکی دے کر خاموش رکھا گیا لیکن اس کے نائب اور زیر کمان جوانوں کو ہوشمندی سے اعتماد میں لے لیا گیا۔ بہر حال جب انقلاب شروع ہوا تو اس VCO نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور بہت بہادری سے لڑا۔ ہنزہ کی میر فیملی کے ایک اور VCO کو اس لیے اعتماد میں نہ لیا گیا کیونکہ اس میں راز خفیہ رکھنے کی سکت نہ تھی۔ اس دوران کیپٹن مرزا حسن خان سے رابطہ ہوا جس نے نہ صرف یونٹ کے مسلمان آفیسرز اور جوانوں کو اعتماد میں لینے کا وعدہ کیا بلکہ انقلاب کا بھرپور ساتھ دینے کا بھی وعدہ کیا۔

ستمبر اور اکتوبر میں VCOs کی میٹنگز جاری رہیں۔ دو تین VCOs کو چھوڑ کر سکاؤٹس کے تمام لوگ تحریک کے لیے تیار تھے۔ اس دوران شاید گنسارا سنگھ کو شک گزرا۔ اس نے ایک دربار بلایا جس میں ”ڈوگرہ فائر پاور“ کا مظاہرہ کیا گیا اور یہ اتنا طاقتور مظاہرہ تھا کہ جو لوگ تحریک میں آنے کا سوچ رہے تھے یا تحریک کے ہمدرد تھے وہ بھی ڈر سے دور ہو گئے۔ تحریک کے سربراہوں کے خیال میں ان کا راز افشا ہو چکا تھا۔ کسی بھی وقت انہیں اٹھا کر گولیوں کا نشانہ بنایا جا سکتا تھا۔ اس لیے وہ ادھر ادھر چھپ گئے۔ اس مرحلے پر براستہ چلاس پاکستان بھاگنے کا بھی پروگرام بنایا گیا۔ دو تین دن انتظار کیا جب کچھ نہ ہوا تو یہ لوگ پھر اکٹھے ہوئے اور اپنے پلان پر عمل کا فیصلہ کیا۔

اس دوران ایک اور اہم فیصلہ یہ کیا گیا کہ حکومت پاکستان سے مدد کی درخواست کی جائے۔ لیکن کیسے؟ وائرلیس کا نظام ڈوگرہ حکومت کے تحت تھا۔ اس لیے اس کا استعمال ممکن نہ تھا۔ دوسرا اس سے راز افشا ہونے کا بھی خطرہ تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا کہ حکومت پاکستان کو خط لکھا جائے۔ سکاؤٹس کے ان VCOs میں شاید خط لکھنے کی استطاعت بھی نہ تھی۔ اس مقصد کے لیے صوبیدار میجر محمد بابر خان کے ایک عزیز راجہ شاہ رئیس خان کی خدمات حاصل کی گئیں۔ ایک ہی مضمون کے چار خطوط لکھوائے گئے۔ ایک قائداعظم کے نام۔ دوسرا نوابزادہ لیاقت علی خان کے نام۔ تیسرا جناب عبدالرب نشتر کے نام اور چوتھا صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ خان عبدالقیوم خان کے نام۔ نزدیک ترین محفوظ ڈاکخانہ ایبٹ آباد تھا۔ اس مقصد کے لئے گلگت سکاؤٹس کے سپاہی امیر جہاندار شاہ کو یہ خطوط دے کر پیدل ایبٹ آباد روانہ کیا جو درہ بابوسر عبور کر کے دو ہفتوں میں ایبٹ آباد پہنچا اور خطوط ڈاک میں ڈالے۔

اس دوران تاریخ کا اپنا سفر جاری تھا۔ سکاؤٹس کے تمام لوگ تحریک میں شامل ہو چکے تھے۔ کیپٹن مرزا حسن خان سے رابطہ ہو چکا تھا۔ کشمیر میں قبائلی لشکر داخل ہو کر بارہ مولا پہنچ چکا تھا جو اب سری نگر کی طرف بڑھنے والا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان لوگوں کی تحریک کا راز تا حال افشا نہیں ہوا تھا۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ ان کی سوچ کو کسی نے سنجیدہ لیا ہی نہیں تھا۔ بہت سے

لوگوں نے اسے ایک احمقانہ فعل اور پاگلوں کی اختراع سمجھا۔ اسی دوران چلاس۔ داریل۔ تانگیر میں ڈوگروں کے خلاف مظاہرے ہوئے۔ میجر براؤن نے گنسارا سنگھ کو حالات سے آگاہ کرتے ہوئے مشورہ دیا کہ یہ مسلمان علاقہ ہے۔ یہاں کے لوگ ڈوگرہ حکومت کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں لہٰذا ان کی خواہشات کا احترام کرنا چاہیے۔ یہ سن کر گنسارا سنگھ کا پارہ چڑھ گیا۔ میجر براؤن پر سخت ناراض ہوا اور یوں اسکی وفاداری بھی مشکوک ہوگئی۔

اسی دوران گلگت کا ایک اور رہائشی آفیسر میجر احسان علی خان جو کہ ڈوگرہ فورس میں سری نگر تعینات تھا گلگت چھٹی پر آیا۔ اسے سری نگر سے بونجی تبدیل کر دیا گیا تھا۔ اس نے اپنے دوستوں کو بتایا کہ ڈوگروں نے فیصلہ کیا ہے کہ سٹیٹ فورس کے تمام مسلمان آفیسرز کو دور دراز کے علاقوں میں بھیج دیا جائے اور پھر ایک ایک کر کے ان کے ساتھ نمٹا جائے۔ اس سے سکاؤٹس میں خوف لازمی تھا۔ 26/27 اکتوبر کی رات کو مہاراجہ نے بھارت کے ساتھ الحاق کر لیا اور 28 اکتوبر کو بھارتی فوج سری نگر ایئر پورٹ پر اتر گئی۔ ادھر بریگیڈیئر گنسارا سنگھ نے کرنل عبد المجید کو بونجی سے گلگت بلایا۔ صلاح مشورے کے بعد اسے ایک کمپنی فوری طور پر گلگت بھیجنے کے احکامات دیئے۔ 31 اکتوبر کو کرنل عبدالمجید نے کیپٹن مرزا حسن خان کی کمپنی گلگت روانہ کی۔ سکھ یا ڈوگرہ کمپنی بھیجنے میں مسلمانوں کی طرف سے ردعمل کا خطرہ تھا۔ چونکہ دونوں کا راستہ تھا اس لیے دوسرے دن شام تک اس کمپنی نے گلگت پہنچنا تھا۔ ان کے آنے کے بعد حالات کچھ بھی ہو سکتے تھے۔

سکاؤٹس ہیڈ کوارٹر کے VCOs نے 31 اکتوبر شام 6 بجے آخری میٹنگ شروع کی اور فوری طور پر اسی رات کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا۔ سب سے پہلا کام تو یہ کیا کہ سیکنڈ لیفٹیننٹ غلام حیدر کو اعتماد میں لے کر میجر براؤن کے گھر بھیجا کہ اگر وہ سکاؤٹس کے ساتھ شامل ہونا چاہے تو ٹھیک ورنہ اسے حراست میں لے لیا جائے گا۔ رات دس بجے لیفٹیننٹ غلام حیدر میجر براؤن کے پاس پہنچا تو اس کے گھر کے باہر ایک گھوڑا تیار کھڑا تھا۔ دراصل بریگیڈیئر گنسارا سنگھ کی نظروں میں میجر براؤن کی وفاداری مشکوک ہوگئی تھی۔ اسے خطرہ تھا کہ اسے اریسٹ نہ کر لیا جائے۔ لہٰذا اس نے آج کی رات وہاں سے نکل کر پاکستان جانے کا فیصلہ کیا جسکے لئے گھوڑا تیار تھا۔

سیکنڈ لیفٹیننٹ غلام حیدر نے اپنے آنے کا مقصد بتایا تو میجر براؤن خوشی خوشی اس کے ساتھ VCOs میس میں آیا جہاں یہ لوگ سب جمع تھے۔ سکاؤٹس کے دوسرے مسلمان آفیسر کیپٹن محمد سعید درانی سے بہرحال اس رات رابطہ نہ ہو سکا کیونکہ وہ گلگت سے باہر دورے پر تھا۔ میجر براؤن نے سکاؤٹس کے پلان پر نظر پھیری۔ معمولی تبدیلیوں کے ساتھ کاروائی کی اجازت دیدی جو فوری شروع کر دی گئی۔ لیفٹیننٹ غلام حیدر کو ایک پلاٹون سکاؤٹس کے ساتھ بریگیڈیئر گنسارا سنگھ کو حراست میں لینے کے لیے ایجنسی ہاؤس روانہ کیا۔ گلگت اور بونجی کے درمیان ٹیلیفون لائن کاٹ دی گئی۔ وائرلیس اور ڈاکخانہ پر قبضہ کر لیا گیا۔ غیر مسلم افسران کو حراست میں لے لیا گیا۔ میجر براؤن کی طرف سے چلاس میں مقیم کیپٹن میتھیسن کو پیغام بھیجا گیا کہ وہ فوری طور پر سکاؤٹ پارٹی کے ساتھ بونجی کی طرف روانہ ہو اور راستے میں پڑنے والے تمام پل اور دریائے سندھ میں کشتیوں کو قبضے میں لے لیں۔ یہ اس لیے ضروری تھا کہ بونجی دریا کی دوسری جانب تھا اور خطرہ تھا کہ 6 جموں اور کشمیر کی سکھ اور ڈوگرہ کمپنیاں ان پلوں اور کشتیوں پر قابض ہو کر گلگت سے رابطہ نہ کاٹ دیں۔ کیپٹن میتھیسن دوسری صبح روانہ ہوا۔ رات کو صوبیدار صفی اللہ بیگ کو کیپٹن مرزا حسن خان

کے پاس بھیجا کہ وہ اپنی کمپنی کو ڈیفنس میں رکھ کر فوری گلگت پہنچے جو وہ دوسرے دن 9 بجے پہنچا۔

سیکنڈ لیفٹیننٹ غلام حیدر ایجنسی ہاؤس پہنچا۔ اندر بریگیڈیئر گنسارا سنگھ کو باہر آنے کے لیے پیغام بھیجا تو شاید وہ حالات سمجھ چکا تھا۔ بجائے باہر آنے کے اندر سے فائرنگ شروع ہوگئی۔ گنسارا سنگھ نے اندر بہت سا اسلحہ جمع کر رکھا تھا۔ ساری رات دونوں طرف سے فائرنگ کا تبادلہ جاری رہا۔ اس فائرنگ میں سکاؤٹس کا سپاہی امیر حیات گولی لگنے سے شہید ہوگیا اور یہ جہاد آزادی کا پہلا شہید تھا۔ بہرحال منصوبہ کے مطابق تمام مقامات پر قبضہ ہوگیا سوائے بریگیڈیئر گنسارا سنگھ کی حراست کے۔ دوسرے دن صبح گلگت کے پولیس انسپکٹر راجہ سلطان حمید خان کے ساتھ ایک ہندو اہلکار مسٹر سدو سنگھ کو گنسارا سنگھ کے پاس بھیج کر اسے تمام حالات سے مطلع کیا گیا۔ اتنی دیر میں مقامی لوگوں نے ایجنسی ہاؤس گھیرے میں لے لیا۔ گنسارا سنگھ کو بتایا گیا کہ اس کی زندگی خطرے میں ہے ان کی حفاظت سکاؤٹس کی ذمہ داری ہے۔ اس پر وہ ہتھیار پھینک کر باہر آگیا۔ اسے باعزت طور پر VCOs میس لایا گیا۔ اس کی طرف سے بونجی کرنل عبدالمجید کو گلگت آنے کے لیے پیغام بھجوایا گیا۔ وہ روانہ ہوا اور اسے راستے میں ہی گرفتار کرلیا گیا۔

یکم نومبر کا سورج اہالیان گلگت بلتستان کے لیے آزادی کا پیغام لے کر طلوع ہوا۔ آزادی کی خبر جنگل کی آگ کی طرح تمام وادیوں میں پھیل گئی اور لوگوں کا ایک جمِ غفیر جمع ہوگیا جو پاگلوں کی طرح خوشی سے ناچ رہے تھے۔ اس جمِ غفیر کے سامنے ایجنسی ہاؤس سے ڈوگرہ پرچم اتارا گیا اور اس کی جگہ پاکستان کا پرچم بلند کردیا گیا۔ پرچم بلند کرنے کی سعادت صوبیدار میجر محمد بابر خان کے حصے میں آئی۔ گلگت کو ایک خودمختار ریاست قرار دے کر آزاد جمہوریہ گلگت کا اعلان کیا گیا جس میں راجہ شاہ رئیس خان کو اس آزاد ریاست کا صدر۔ کیپٹن مرزا حسن خان بھی پہنچ چکے تھے۔ انہیں اس آزاد ریاست کا کمانڈر انچیف۔ سیکنڈ لیفٹیننٹ غلام حیدر کو سول حکومت کا انتظامی آفیسر اور میجر براؤن کو صدر کا مشیر مقرر کیا گیا۔

گلگت آزاد تو ہوگیا لیکن یہ آزادی محض وادی گلگت تک محدود اور مصائب کی ابتدا تھی۔ حکومت پاکستان کی طرف سے تاحال کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ سول ایڈمنسٹریشن کا کسی کو تجربہ نہ تھا۔ 35 میل کے فاصلے پر سکھ اور ڈوگرہ فورس کی دو کمپنیاں موجود تھیں۔ سکردو میں سٹیٹ فورس کا ایک مضبوط فوجی دستہ بھی موجود تھا۔ اور جب یہ خبر سری نگر پہنچے گی تو یقیناً وہاں سے مزید کمک کا آنا لازمی تھا۔ یہ آزادی محض چند دنوں کی ہوسکتی تھی۔ ڈوگرے یہاں آکر پوری وادی کو خون سے بھر دیتے۔ بونجی اور گلگت کے درمیان ٹیلیفون رابطہ منقطع تھا اس لیے انقلاب کی خبر وہاں تک نہ پہنچ پائی۔ بونجی کے بالمقابل دریا کی دوسری جانب جگلوٹ سے 50 میل کے فاصلے پر چلاس ہے اور یہ تین دن کا راستہ ہے۔ چلاس سے کیپٹن ہیتھیسن یکم نومبر کی صبح کو روانہ ہوا تھا۔ وہ لوگ 3 نومبر کو جگلوٹ پہنچے۔ وہاں ڈوگرہ فورس کی ایک چوکی تھی۔ اس کا صفایا کیا گیا۔ ادھر سے کیپٹن مرزا حسن خان اور جمعدار محمد شاہ خان روانہ ہوئے وہ بھی 3 نومبر کو جگلوٹ پہنچے۔ بونجی پر شب خون مارنے کی منصوبہ بندی کی گئی لیکن 5 نومبر کی صبح کو بونجی چھاؤنی میں سفید جھنڈے لہرا رہے تھے۔ مخبر بھیج کر پتہ کرایا گیا تو پتہ چلا کہ 4/5 نومبر کی رات کو سکھ اور ڈوگرے چھاؤنی چھوڑ کر پہاڑوں کی طرف بھاگ گئے تھے اور یہ اہم کارنامہ کیپٹن محمد خان جرال نے سرانجام دیا۔ اس نے یونٹ میں افواہ پھیلادی کہ کوہستان سے مجاہدین کا لشکر بونجی اور گلگت پر قبضے کے لیے روانہ ہو چکا ہے۔ کشمیر میں مجاہدین کی کامیابیوں کی اطلاعات پہلے ہی پہنچ رہی تھیں۔ جب 3 نومبر کو جگلوٹ پر سکاؤٹس نے

حملہ کیا تو کیپٹن محمد خان جرال نے مزید افواہ پھیلا دی کہ مجاہدین جگلوٹ پہنچ چکے ہیں تو اسی رات سکھ اور ڈوگرے وہاں سے بھاگ گئے اور یوں بونجی چھاؤنی پر سکاؤٹس کا قبضہ ہوگیا جس سے تمام علاقے اور خصوصاً سکاؤٹس میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

ادھر گلگت سے حکومت پاکستان کو نمائندہ بھیجنے کے لیے مسلسل ٹیلیگرام دیئے جا رہے تھے۔ بالآخر خدا خدا کر کے 16 نومبر کو گلگت کے گرد آلود رن وے پر ایک ہاورڈ طیارہ اترا اور اس میں سے پاکستان کے پہلے پولیٹیکل ایجنٹ سردار محمد عالم خان باہر آئے۔ اسے عوام کے نعروں کی گونج میں ایجنسی ہاؤس لے جایا گیا جہاں اسے خزانے کی چابیاں پیش کی گئیں۔ دسمبر میں میجر محمد اسلم خان گلگت پہنچے اور گلگت سکاؤٹس کا بطور کمانڈنٹ چارج سنبھالا۔ یہ ائیر مارشل محمد اصغر خان کے بھائی تھے اور علاقے میں پہلے بھی خدمات سرانجام دے چکے تھے۔ میجر براؤن کو وزیراعظم لیاقت علی خان کے پاس بھیجا گیا تاکہ انہیں تمام حالات سے ذاتی طور پر مطلع کیا جائے۔ وہاں سے سکاؤٹس کی تعداد 1600 تک بڑھانے اور صوبیدار میجر محمد بابر خان اور جمعدار محمد شاہ خان کے لئے پاکستان آرمی میں خصوصی کمیشن کے احکامات لے کر واپس آئے جن پر فوری طور پر عمل کیا گیا۔ کمانڈنٹ کا چارج سنبھالنے کے بعد میجر محمد اسلم خان کو لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ میجر براؤن اور کیپٹن میتھیسن کو باعزت پاکستان بھیج دیا گیا۔

کرنل محمد اسلم خان نے سکاؤٹس کی سخت تربیت کی۔ انہیں مسلح کیا۔ 6 کشمیر بٹالین میں سے دونوں مسلمان کمپنیوں کو سکاؤٹس فورس میں مدغم کیا اور بجائے دشمن کے حملے کا انتظار کرنے کے دشمن پر چڑھ کر وار کرنے کا فیصلہ کیا۔ تمام موجودہ فورس کے تین کالم ترتیب دیئے۔ آئیبکس (Ibex) فورس میجر احسان علی خان کیپٹن محمد خان جرال اور لیفٹیننٹ محمد بابر خان کی کمان میں سکردو روانہ کی جو بالآخر لیہہ تک پہنچی۔ دوسری ٹائیگر فورس کے نام سے میجر (ترقی ہوگئی تھی) مرزا حسن خان کی زیر کمان استور۔ درہ برزل اور دریائے کشن گنگا کے ساتھ سری نگر روانہ کی جو سری نگر سے 6 میل پیچھے بانڈی پورہ تک پہنچی اور تیسری ایسکیمو فورس سیکنڈ لیفٹیننٹ محمد شاہ خان کی کمان میں کارگل کی طرف روانہ کی۔ اس فورس نے سردیوں میں درہ برزل عبور کیا۔ برف کا صحرا دیوسائی کا میدان عبور کیا۔ شکمہ۔ کارگل کو فتح کرتے ہوئے سری نگر اور لیہہ کے درمیان واحد پاس زوجیلہ پر قابض ہوگئے۔

اب تک ان مجاہدین کا واسطہ کشمیر سٹیٹ فورس سے تھا جسے روندتے ہوئے یہ سری نگر کے نزدیک تک جا پہنچے تھے۔ اب یہاں سے آگے انہیں بھارتی فوج سے لڑنا پڑا۔ بھارت اپنے تین بہترین جرنیل جنرل کری آپا۔ جنرل تھمیا اور جنرل شری نگیش کو میدان میں لایا۔ پہلے دونوں جرنیل بعد میں بھارتی فوج کے کمانڈر انچیف بنے۔ اس کے ساتھ ہی بھارت اپنے ٹینک اور ہوائی جہاز بھی میدان میں لایا جن سے لڑنے کا سکاؤٹس کو کوئی تجربہ نہ تھا۔ ان لوگوں نے تو ٹینک اور لڑاکا جہاز بھی زندگی میں پہلی دفعہ دیکھے تھے۔ ان کے پاس تو برفانی کپڑے اور حسب ضرورت گولہ بارود تک نہ تھا۔ یہ لوگ بہت بے جگری سے لڑے لیکن پیچھے ہٹنا پڑا۔ جنگ ابھی جاری تھی کہ 1/2 جنوری 1949 کی رات کو جنگ بندی ہوگئی۔ جنگ بندی لائن ہی سرحدی لائن بن گئی۔ ان مجاہدین نے 28 ہزار مربع میل تقریباً 73000 مربع کلومیٹر آزاد کرایا جو اب گورنمنٹ آف گلگت وبلتستان کے نام سے جانا جاتا ہے۔ بقول ڈاکٹر علامہ محمد اقبال:

؎ جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

○▲○

اس عاقبت نااندیش کا قصہ جو ببول کا درخت لگا کر آم کھانے کی تمنا رکھتا تھا۔

ببول

نازیہ لیاقت

عاطف کو دیکھ کر وہ پہچان ہی نہیں سکے۔ وہ اتنا بدل گیا تھا۔ جب وہ ان کے ساتھ کام کرتا تھا تو دبلا پتلا ہوا کرتا تھا۔ جسم پر ڈھنگ کے کپڑے بھی نہیں ہوتے تھے لیکن اس وقت اس کے جسم پر کافی مہنگے کپڑے تھے اور جسم کے حجم میں کافی اضافہ ہو گیا تھا۔

انہوں نے آواز دی۔ ''ارے عاطف!''

''کون...... ارے عمران صاحب!'' عاطف انہیں دیکھ کر حیرت میں پڑ گیا۔

''یہ آپ ہیں؟''

''ہاں میں ہی ہوں''۔ ان کے چہرے پر ایک پھیکی مسکراہٹ ابھر آئی۔

''یہ آپ نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟'' عاطف نے حیرت سے انہیں دیکھا اور بولا۔ ''آپ کتنے دبلے ہو گئے ہیں، آنکھیں اندر دھنس گئی ہیں۔ کیا آپ بیمار ہیں؟''

''دنیا میں بیکاری سے بڑھ کر اور کیا بیماری ہو سکتی ہے؟'' انہوں نے تاسف سے کہا۔

''کیا آپ کے کیس کا ابھی تک فیصلہ نہیں ہو سکا؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں''۔ انہوں نے کہا۔ پھر موضوع بدلنے کے لئے پوچھا۔ ''اور بتاؤ کیسی گزر رہی ہے؟''

''خدا کا کرم ہے عمران صاحب!'' عاطف بولا۔ ''ترقی ہو گئی ہے۔ ترقی کر کے ہیڈ بن گیا ہوں۔ بڑے لڑکے کو سوفٹ ویئر کروا دیا تھا۔ وہ ایک فرم میں لگ گیا ہے۔ چھوٹا ہارڈ ویئر کر رہا ہے۔ اس کی دکان کھولنے کا ارادہ ہے۔ چھوٹی لڑکی کالج کے آخری سال میں ہے۔ لال حویلی والا چھوٹا گھر چھوڑ دیا ہے اور گلبرگ میں ایک فلیٹ لے لیا ہے۔''

گزشتہ پانچ سالوں کی کہانی عاطف نے چند جملوں میں بیان کردی اور باقی کا اندازہ انہوں نے اس کی حالت سے لگایا۔

''عمران صاحب!'' پھر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد۔ عاطف نے آخر تیر چلا ہی دیا۔ ''میں آپ کو بار بار سمجھاتا تھا، مانا ہم جہاں کام کرتے ہیں وہاں پیسہ ہی پیسہ ہے۔ وہاں بیٹھ کر ہم اپنی کرسی کے ذریعہ بے شمار دولت کما سکتے ہیں لیکن وہ پیسہ ہمیں سکون نہیں دے سکتا۔ کبھی نہ کبھی تو اس کا انجام بُرا ہوتا ہی ہے اور ہوا بھی وہی۔ آپ رشوت لیتے پکڑے گئے اور معطل کر دیئے گئے۔ آپ کا کیس ابھی تک چل رہا ہے اور اب آپ خود کہتے ہیں کہ اس کیس میں آپ کا بچنا مشکل ہے۔ آپ کو رشوت لینے کے جرم میں پانچ چھ سال کی قید ہو جائے گی۔ نوکری سے نکال دیئے جانے کے بعد آپ کا گھر ٹوٹ کر بکھر گیا۔ میں اُس راستہ پر نہیں چلا جس پر آپ جاتے تھے۔ آج بھی اپنے اصولوں پر قائم ہوں۔ پہلے تکلیف کے دن تھے، آج خدا نے راحت دی ہے۔ کاش! آپ بھی میری رائے پر چلتے''۔

گھر آ کر وہ بہت دیر تک عاطف کے بارے میں سوچتے رہے۔ کیا عاطف کی راہ پر چل کر انہیں وہی راحت مل سکتی تھی جو عاطف کو ملی ہے؟ ممکن ہے مل جاتی۔ انہوں نے جو راستہ اپنایا تھا اس وقت انہوں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ان کا انجام ایسا ہو سکتا ہے۔ کل ہی وہ اپنے وکیل سے مل آئے تھے۔ وکیل نے فیس کا مطالبہ کیا تھا۔ جب انہوں نے اسے اپنی حالت بتائی تو وہ ان پر غصہ ہو گیا۔

''عمران صاحب! آپ کا کیس آخری سٹیج پر ہے''۔ وکیل نے کڑوے لہجے میں کہا۔ ''اور اس سٹیج پر آپ کو پیسوں کی سخت ضرورت ہے۔ ہر فیصلہ آپ کو اپنے حق میں کروانا ہے تاکہ آپ باعزت طریقے سے دوبارہ ڈیوٹی پر بحال ہو جائیں اور آپ پر لگا رشوت لینے کا الزام جھوٹ ثابت ہو جائے۔ اس کے لئے عدالت کے کلرک، چپڑاسی سے جج تک ہر کسی کو پیسہ دے کر فیصلہ آپ کے اپنے حق میں کروانا ہوگا اور آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ کے پاس پیسہ نہیں ہے۔ یاد رکھئے! اس وقت آپ کے پاس پیسے کی کمی آپ کو مجرم ثابت کر سکتی ہے۔ آپ کو رشوت لینے کے جرم میں سزا ہو جائے گی اور آپ دوبارہ پھر کبھی نوکری پر بحال نہیں ہو پائیں گے''۔

وہ اسے کیا بتائیں اس وقت وہ پینے کے لئے ایک سگریٹ کے محتاج ہیں تو بھلا فیصلہ اپنے حق میں کروانے کے لئے اتنا پیسہ کہاں سے لائیں۔ واپس گھر آتے وقت راستہ بھر ان کے دماغ میں وکیل کی باتیں گونجتی رہیں اور آنکھوں کے سامنے جیل کی سلاخیں منڈلاتی رہیں۔ اس وکیل کو انہوں نے گزشتہ پانچ سالوں میں چار پانچ لاکھ روپیہ فیس کے طور پر دیا ہوگا لیکن وہ اب بھی مزید فیس مانگ رہا تھا اور صاف کہہ رہا تھا کہ اگر انہوں نے فیس کا انتظام نہیں کیا تو فیصلہ ان کے خلاف ہو سکتا ہے۔

''وکیل کے پاس گئے تھے؟'' گھر واپس آئے تو بیوی نے ترش لہجے میں پوچھا۔

''ہاں!'' انہوں نے مری سی آواز میں جواب دیا۔

''پھر، اس نے کیا کہا ہے؟''

''کہہ رہا ہے کہ اگر ہم نے فیس کا انتظام نہیں کیا تو فیصلہ ہمارے حق میں نہیں ہو پائے گا''۔

''گھر میں کھانے کے لالے پڑے ہیں''۔ بیوی نے کہا۔ ''میں کس طرح گھر چلا رہی ہوں، میرا حال مجھ کو معلوم ہے۔ ایسے میں بھلا فیس کا انتظام کہاں سے ہو سکتا ہے؟ اس کیس سے تو اب طبیعت بیزار ہو گئی ہے۔ دو ٹوک جو بھی فیصلہ ہو جائے تو چھٹی مل جائے گی۔ رشوت لیتے وقت آپ کو سوچنا چاہئے تھا کہ اس بُرے کام کی وجہ سے آپ پر ہمارے گھر پر بُرا وقت بھی آ سکتا ہے''۔

بیوی کی باتیں انہیں بھالے کی طرح چبھتی محسوس ہوئیں۔ اب بیوی بار بار انہیں کوستی ہے۔ انہوں نے رشوت کیوں لی، رشوت لینے کا غلط کام کیوں کیا۔ جس کی وجہ سے وہ اس مصیبت میں پڑے ہیں لیکن جب وہ اس کے لیے نئی نئی ساڑھیاں، بچوں کو اچھے اچھے کپڑے، گھر کے لیے قیمتی سامان لاتے تھے اس وقت بیوی نے نہیں پوچھا تھا کہ آپ کی تنخواہ تو اتنی کم ہے، ہماری آمدنی کا کوئی ذریعہ بھی نہیں ہے پھر یہ اتنا قیمتی سامان اور اس کے لیے اتنا پیسہ کہاں سے آتا ہے؟ جب لوگ گھر پر ان سے ملنے کے لیے آتے تھے تو وہ ان کی چائے پانی اور دیگر لوازمات سے خوب خاطر مدارت کرتی تھی۔ کبھی اس نے انہیں اس بات کے لیے نہیں ٹوکا کہ یہ لوگ ان سے ملنے گھر پر کیوں آتے ہیں۔ آفس کا کام ہے تو آفس میں کیوں نہیں ملتے؟ بڑی بڑی رقمیں جب بیوی کے پاس رکھنے کے لیے دیتے تو بیوی نے کبھی نہیں پوچھا تھا کہ اتنی بڑی رقم کہاں سے آئی؟ اور اب بات بات پر انہیں اس بات کے لیے طعنہ دیتی ہے۔ شاید اس وقت وہ انہیں ایک بار بھی ٹوک دیتی تو جس راستے پر وہ چل رہے تھے اس سے واپس مڑنے کے بارے میں سوچتے۔

پانچ سال میں وہ کتنی بدل گئی تھی صرف بیوی کو کیوں دوش دیں؟ گھر کا ہر فرد بدل گیا تھا۔ تینوں بچے بھی اب انہیں خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ جب انہیں رشوت لیتے گرفتار کیا گیا اور سروس سے معطل کر دیا گیا تھا اس وقت بڑے لڑکے نے ایف ایس سی پاس کی تھی۔ وہ پڑھنے لکھنے میں بہت ہوشیار تھا۔ اسے وہ انجینئر بنانا چاہتے تھے اور اس کے لیے انہوں نے پورا انتظام کر لیا تھا۔ ایک بڑے کالج کی فیس ان کے پاس تیار تھی مگر وہ گرفتار کر لیے گئے اور حوالات جانے سے بچنے کے لیے انہیں پولیس کو ساری رقم دینی پڑی۔ رقم دینے کا صرف یہ فائدہ ہوا کہ ان کے خلاف آگے اور کوئی انکوائری نہیں ہو سکی ورنہ ان کی ہر چیز کی انکوائری کا ڈر تھا۔

لڑکا انجینئرنگ کالج نہیں جا سکا۔ اس نے بی ایس سی میں داخلہ لے لیا لیکن چھ مہینے کے بعد ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ اُسے کالج چھوڑنا پڑا اور گھر چلانے کے لیے مجبوراً وہ چھوٹے موٹے کام کرنے لگا۔ چھوٹا لڑکا دسویں میں فیل ہو گیا۔ اس کی وجہ سے وہ آگے تعلیم جاری نہیں رکھ سکا۔ نہ کوئی کام کر سکا، آوارہ لڑکوں کی صحبت میں پڑ گیا۔ اس کے بارے میں انہیں پتا چلا کہ وہ غلط دھندے بھی کرنے لگا ہے۔ کئی بار اسے پولیس پکڑ کر لے گئی لیکن اسے چھڑانے کے لئے انہیں پولیس سٹیشن جانے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ وہ خود ہی چھوٹ کر اور سارے معاملات کو نپٹا کر آ گیا۔ وہ جن لوگوں کے ساتھ رہتا تھا انہوں نے ہی اسے رہا کرا لیا۔

چھوٹی لڑکی کا دل بھی اسکول میں نہیں لگتا تھا۔ اس نے پڑھائی چھوڑ دی اور سلائی سیکھنے لگی۔ اس کے بعد وہ چھوٹے موٹے کام کرنے لگی۔ پھر اس کے بعد انہیں پتا چلا کہ وہ آوارہ لڑکوں کے ساتھ بدنام جگہوں پر گھومتی ہے۔ رات دیر سے گھر واپس آنے لگی تو ایک بار انہوں نے اسے ٹوکا جس پر وہ ان سے جھگڑا کرنے لگی۔

"میں کام کرنے کے لئے گھر سے باہر جاتی ہوں"۔ اس نے تیز لہجے میں کہا۔ "تاکہ دو پیسے ملیں تو گھر چل سکے۔ آپ کی طرح گھر بیٹھی نہیں رہتی"۔

"خود تو کوئی کام دھندا نہیں کرتے"۔ ماں بھی بیٹی کی طرفداری کرتے ہوئے ہوئے بولی۔ "دن بھر گھر میں بیٹھے رہتے ہو۔ ہم گھر چلانے کے لئے کوئی چھوٹا موٹا دھندا کرتے ہیں تو ہمارے پیچھے پڑ جاتے ہو"۔

ماں بیٹی کی طرف داری کیوں کر رہی تھی۔ اس کی وجہ وہ جانتے تھے۔ کیوں کہ وہ بھی اس کے رنگ میں بہت پہلے رنگ چکی تھی۔ ان کے معطل ہونے کے ایک سال بعد ہی وہ چھوٹے موٹے کام کرنے کے لئے گھر

سے باہر جانے لگی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد ہی انہیں رپورٹ ملنے لگی تھی کہ وہ اکم کی آڑ میں آوارہ گردی کرتی ہے۔ ایک دو بار اس بات پر ان کا جھگڑا بھی ہوا تھا۔ اس کا جواب تھا۔

"ٹھیک ہے میں گھر میں رہتی ہوں تم جاؤ کوئی کام کرو۔ کچھ کما کر لا دو اور پہلے کی طرح گھر کا خرچہ چلاؤ"۔

یہ ایسا جواب تھا جس کو سن کر وہ بے حس ہو گئے۔ وہ کام کرنے کے لئے گھر سے باہر جائیں یہ ٹھیک ہے لیکن وہ کیا کام کریں؟

آدمی زندگی سرکاری نوکری کرتے گزری تھی۔ اب وہ دوسرا کام کیا کر سکتے ہیں۔ کسی دکان پر سیلزمین کا کام کر سکتے تھے نہ کسی پرائیویٹ آفس میں کلرک کا۔ ایک ادھیڑ عمر شخص کو کام پر رکھنے سے بہتر وہ کسی نوجوان کو کام پر رکھنا پسند کرتے تھے۔ جہاں وہ پہچان لئے جاتے ان کے ساتھ جانوروں سا سلوک کیا جاتا تھا۔

"ارے عمران صاحب! آپ ہمارے یہاں نوکری کریں گے، آپ تو سارے شہر کو نوکر رکھ سکتے ہیں۔ اس لئے ہمارے یہاں نوکری کر کے اپنی شان کیوں چھوٹی کرنا چاہتے ہیں؟"

مایوسی سے واپس مڑتے تو ایک بازگشت پیچھا کرتی۔

"ارے ایک حرامی سرکاری آفیسر ہے، بنا رشوت کے کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ رشوت لیتے ہوئے پکڑا گیا، آج کل معطل ہے۔ بہت لوگوں کو ستایا ہے۔ اب اس کے پاپوں کی سزا اسے مل رہی ہے"۔

انہیں محسوس ہوتا جب وہ کرسی پر براجمان تھے تو جو لوگ ان کے ساتھ ادب سے پیش آتے تھے ان کی عزت کرتے تھے۔ انہیں بار بار سلام کرتے تھے۔ آج انہیں دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ اگر وہ خود ان سے بات کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ ان کے زخموں

وکریدکران پرنمک چھڑکتے ہیں۔

''کہئے عمران صاحب! کیسے ہیں آپ؟ رشوت لیتے پکڑے گئے تھے نا؟ نوکری تو جاتی رہی، سنا ہے جیل کی ہوا کھانی پڑے گی۔ اب کس طرح گزر بسر ہوتی ہے؟ کیا آج کل آپ کوئی کام تلاش کر رہے ہیں؟ اگر مل جائے تو براہ کرم وہاں بھی وہ کام مت کیجئے گا، وہ سرکاری دفتر تھا جہاں آپ حاکم تھے۔ ہر جگہ آپ حاکم نہیں ہو سکتے''۔

ان طعنوں کی وجہ سے انہوں نے کہیں آنا جانا ہی چھوڑ دیا تھا۔ گھر میں بیٹھے رہتے اکیلے کیونکہ گھر میں کوئی نہیں ہوتا تھا۔ بیوی کام پر چلی جاتی تھی۔ بڑا لڑکا بھی کام پر ہی جاتا تھا۔ چھوٹا لڑکا اور لڑکی کہیں آوارہ گردی کرتے رہتے تھے۔ ان کو ٹوکنے کی ان میں ہمت بھی نہیں تھی۔ ایک زمانہ تھا ان کا بڑا دبدبہ تھا۔ وہ ایسے محکمے میں تھے جہاں پیسہ ہی پیسہ تھا۔ مجبور، ضرورت مند افراد وہاں پیسہ دے کر ہی اپنا کام کرواتے تھے اور انہوں نے بھی پیسہ لے کر کام کرنے کا اپنا اصول بنا لیا تھا۔ جس سے مطلوبہ رقم مل گئی۔ اس کا کام منٹوں میں ہو گیا۔ جس نے پیسے نہیں دیئے سالوں تک ان کے آفس کے چکر کاٹتا رہا۔ وہ غلط صحیح ہر طرح کا کام کرتے تھے۔ صحیح کام کرنے کی بھی قیمت ادا کرنی پڑتی تھی۔ غلط کاموں کے لئے تو کچھ زیادہ قیمت دینی پڑتی تھی۔ گھر میں دولت کی ریل پیل تھی۔ وہ اپنے ساتھ آفس سے روزانہ ہزاروں روپیہ لاتے تھے۔ بیوی قیمتی کپڑوں اور زیورات میں لدی جا رہی تھی۔ گھر میں قیمتی آرائشی سامان آ رہا تھا۔ بچے اس چھوٹی سی عمر میں ہزاروں روپیہ روزانہ اڑا دیتے تھے۔

کچھ لوگ سمجھاتے بھی تھے کہ جس راستے پر جا رہے ہیں وہ غلط ہے۔ کسی دن اس کا خاتمہ کسی تاریک غار میں ہو سکتا ہے لیکن انہیں کسی کی پروا نہیں تھی۔ انہوں نے اس درمیان اپنا رسوخ بھی بنایا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ ان کے ہاتھوں سے کوئی لغزش بھی ہو جائے تو وہ لوگ انہیں بچا لیں گے لیکن انہیں کوئی بھی نہیں بچا سکا۔ انہوں نے گھر کے صحن میں ببول کا پیڑ اُگایا تھا تو اب کانٹے ان کا مقدر تھے۔

ایک سر پھرے سے انہوں نے کام کے لئے رشوت مانگی۔ اس نے انکار کیا تو اسے اتنا مجبور کر دیا کہ وہ رشوت دینے کے لئے مجبور ہو گیا۔ رشوت لے کر انہوں نے اس کا کام کیا لیکن وہ اینٹی کرپشن میں رپورٹ کر چکا تھا۔ اینٹی کرپشن والے جال بچھا چکے تھے۔ وہ جال میں پھنس گئے اور رشوت لیتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑے گئے۔ فوراً معطل کر دیئے گئے اور کیس شروع ہوا۔ اس کیس کو کمزور کرنے کے لئے اور خود کو دوسری کارروائی سے بچانے کے لئے انہوں نے گھر میں جمع سارا پیسہ لگا دیا۔ کل تک وہ لوگوں سے رشوت لیتے تھے، آج وہ خود کو بچانے کے لئے رشوت دے رہے تھے۔ انہوں نے سب کو خرید لیا لیکن جس سے انہوں نے رشوت لی تھی اور جس نے انہیں رشوت دیتے ہوئے پکڑوایا تھا وہ اڑا رہا۔ پیسہ یا کوئی بھی دباؤ اُسے جھکا نہ سکا۔ وہ آج تک اپنی بات پر ڈٹا ہوا تھا۔ جیسے اس نے انہیں برباد کرنے کی ٹھان لی ہو اور ان پانچ سالوں میں اس نے پوری طرح برباد کر دیا تھا۔ عزت، گھر بار، بیوی بچے، دولت، شہرت سب تو لٹ گئی تھی۔ نیم جان تن پر بس آخری وار ہونا باقی تھا۔ فیصلہ ان کے خلاف جائے اور انہیں رشوت لینے کے جرم میں سزا ہو جائے اور ان کو دوبارہ نوکری پانے کی آخری امید بھی ٹوٹ جائے۔ انہوں نے جو راستہ اپنایا تھا وہ تاریکی بھرا ہوا تھا لیکن وہ انہیں روشن محسوس ہوتا تھا۔ اس تاریک راستے پر چلتے ہوئے وہ تاریکی میں گم ہو گئے۔ اس لئے ان کا خاتمہ بھی اسی تاریکی میں ہونے والا تھا۔

❋◆❋

تجسس

اسرائیلی خفیہ ایجنسی موساد کی اندرونی کہانی

روشنی اور ہزیمت

خمینی نے اقتدار سنبھالتے ہی تہران میں اسرائیلی سفارت خانے کی عمارت فلسطینیوں کے حوالے کردی۔ جواب میں اسرائیل نے گردوں کو شہ دے کر ایران کے خلاف گوریلا جنگ شروع کرادی۔

قسط:8 ☆ ---------------------0300-4154083---------------------میاں محمد ابراہیم طاہر

بغداد کے پیلسٹائن میریڈیان ہوٹل (Palestine Meridian Hotel) کی لابی، اپریل 1988ء کے آخری جمعہ کے روز لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی اور ایک خوشی و مسرت اور جشن کا ساماں تھا کیونکہ خلیج بصرہ میں عراق نے ایرانیوں کے خلاف فیصلہ کن فتح حاصل کی تھی اور عام طور پر خیال کیا جا رہا تھا کہ دونوں ملکوں کے درمیان جاری سات سالہ خونریز جنگ اب اپنے اختتام کو پہنچنے کے قریب ہے۔

سب سے زیادہ خوشی اور مسرت کا اظہار لابی میں بیٹھے ان غیر ملکیوں کی طرف سے کیا جا رہا تھا جو اپنے انتہائی نفاست سے تراشے خراشے اور سلے ہوئے قیمتی لباسوں میں ملبوس، مختلف ملکوں اور قومیتوں کی نمائندگی کر رہے تھے اور جو اس وقت انگریزی زبان میں گفتگو کر رہے تھے اور انگریزی بولنے کا انداز اور لب ولہجہ ہر ایک کا مختلف اور جداگانہ تھا۔ یہ سب اسلحہ کے ڈیلر تھے جو اپنا جدید ترین اسلحہ عراق کو بیچنے کے لئے بغداد میں جمع تھے۔ ان میں یورپین، روسی، امریکن اور چینی اسلحہ ساز کمپنیوں کے نمائندے شامل تھے۔ یہ لوگ اپنا ایسا اسلحہ بیچنا چاہتے تھے جس کا انہوں نے اپنے اپنے ملکوں میں بھی استعمال نہیں کیا تھا۔

اُن کے عراقی میزبانوں کو، اُن کی گفتگو کو سمجھنے کے لئے کسی ترجمان کی ضرورت نہ تھی، وہ عراقیوں کو پیش کر رہے تھے۔ مختلف دوری تک مار کرنے والے بم، تارپیڈو، مائنز اور دوسرا جدید ترین تباہ کن اسلحہ، اپنے اپنے اسلحے کی "تباہ کن خوبیوں" پر مشتمل باتصویر چھپے ہوئے پمفلٹ، کتابچے، بروشر وغیرہ ایک دوسرے کو تھمائے جا رہے تھے۔ ان میں کارٹونوں جیسے ناموں والے ہیلی کاپٹر مثلاً سی ٹائنس (سمندری نواب)، جی تنگ، بی ستالین وغیرہ۔ ایک ہیلی کاپٹر کا نام تھا بگ مدر (بڑی اماں) جو ایک مکمل پل کو اٹھا لے جانے کی صلاحیت وطاقت رکھتا تھا۔ ایک اور نام تھا "ان کریڈیبل مشین" (Incrediable Machene) جو ایک پوری پلٹن کو ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ پہنچا سکتا تھا۔ کتابچوں میں ایسی توپوں کی تصویریں تھیں جو ایک منٹ میں دو ہزار گولے فائر کر سکتی تھیں یا تاریکی میں بھی اپنے ہدف کو درست نشانہ بنا سکتی تھیں کیونکہ ان میں کمپیوٹر چپ کی "آنکھ" لگی ہوئی تھی ہر نوع اور ہر قسم کا اسلحہ برائے فروخت موجود تھا۔

میزبان سودا بازی کے لئے مبہم سی زبان استعمال کر رہے تھے، اُس کو یہ یورپین سیلز مین بھی خوب سمجھتے تھے۔ مثلاً "بیس اُس دن"، "تیس نصف نصف پر مبنی ایک" یعنی بیس ملین ڈالر ڈلیوری پر، یا تیس ملین ڈالر مال کی سپردگی کے وقت۔ نصف پیشگی اور تمام باقی رقم اسلحے کی جہازوں سے روانگی سے قبل۔ تمام ادائیگی امریکن ڈالروں میں کیونکہ اس قسم کے تمام خفیہ سودوں میں یہی سکہ رائج الوقت تھا۔

اسلحے کے اس بازار کے روزمرہ اتار چڑھاؤ پر نظر رکھنے کے لئے صدام حسین کے سوتیلے بھائی کی نگرانی میں عراقی انٹیلی جنس ایجنسی "وعلات الخبرات الاماح" کے اہلکار موجود رہتے تھے۔

اسی ہوٹل کی لابی میں سات سال پہلے بھی اسلحے کے کچھ ڈیلر اس دن موجود تھے جب اسرائیل نے عراقی فوجی تنصیبات پر زوردار حملہ کیا تھا۔

جب سے اسرائیلی ریاست کا قیام عمل میں آیا تھا، اسرائیل اور عراق کے درمیان حالتِ جنگ موجود چلی آ رہی تھی۔ اسرائیل کو اعتماد تھا کہ اُس کی افواج روایتی جنگ جیت سکتی ہیں لیکن 1977ء میں اسرائیلی جاسوس ایجنسی "موساد" نے سراغ لگا لیا کہ فرانس، جس نے خود اسرائیل کو ایٹمی سہولیات فراہم کی تھیں، عراق کو بھی ایک

ری ایکٹر اور "تکنیکی تعاون" مہیا کیا ہے۔ یہ ری ایکٹر بغداد کے شمال میں التویطہا کے مقام پر نصب کیا جا رہا تھا۔

اسرائیلی ائیرفورس نے اس ری ایکٹر کے چالو ہونے سے قبل ہی بم باری کر کے اسے تباہ و برباد کرنے کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔ پلانٹ کے چالو ہونے کے بعد اگر اسے تباہ کیا جاتا تو اس سے خارج ہونے والی تابکاری سے نہ صرف بغداد شہر بلکہ عراق کا وسیع و عریض علاقہ صحرا میں تبدیل ہو جاتا اور اسرائیل کو دنیا بھر کی تنقید و مذمت کا سامنا کرنا پڑتا۔

انہی اسباب کی بنا پر "موساد" کے اس وقت کے سربراہ یزہاک ہوفی (Yitzhak Hofi) نے ہوائی حملے کی مخالفت کی تھی کیونکہ اُس نے خدشہ ظاہر کیا تھا کہ ہوائی حملے کی صورت میں پلانٹ پر کام کرنے والے لاتعداد فرانسیسی مشیر، انجینئر اور تکنیکی ماہرین ہلاک ہو جائیں گے اور اس کے نتیجے میں اسرائیل جو یورپین ممالک کو اپنی نیک چلنی کا یقین دلا رہا ہے اور یورپین ممالک مصر کو اسرائیل کے ساتھ امن کے معاہدے کے لئے جو زور ڈال رہے ہیں، سب ختم ہو جائے گا اور اسرائیل تنہا ہو کر رہ جائے گا۔

اپنے محکمے موساد کے مختلف شعبوں کے افسروں کی میٹنگ کی صدارت کرتے ہوئے وہ (ہوفی) اپنے آپ کو تنہا محسوس کر رہا تھا کیونکہ افسروں کی اکثریت عراقی ری ایکٹر کو اس ابتدائی سٹیج پر تباہ کرنے کے حق میں تھی۔ صدام ایک بے رحم دشمن ہے۔ ایک دفعہ اُس نے ایٹم بم بنا لیا تو وہ اسے اسرائیل پر گرانے میں بالکل دریغ نہیں کرے گا۔ جہاں تک یورپی ممالک کی حمایت کا تعلق ہے تو امریکہ کے سوا کسی کی پروا نہیں کرنی چاہئے اور واشنگٹن میں یہ کھسر پھسر چل رہی تھی کہ اگر اسرائیل عراقی ری ایکٹر تباہ کر دیتا ہے تو اسے ایک ہلکی سی چپت لگا کر معاملہ رفع دفع کر دیا جائے گا۔

ہوفی نے ایک مختلف راستہ اپنانے کی تجویز دی کہ امریکہ، فرانس پر سفارتی دباؤ ڈالے کہ فرانس ری ایکٹر تیار کرنے اور عراق کے حوالے کرنے سے باز رہے۔ واشنگٹن کو پیرس سے دھتکار دیا گیا اور بڑا روکھا پھیکا جواب دیا۔ اب اسرائیل نے براہ راست فرانس کے اُس کارخانے کو نشانہ بنانے کا فیصلہ کیا جہاں عراق کے لئے ری ایکٹر زیر تعمیر تھا۔ چنانچہ ہوفی نے "مساد" کے خفیہ ایجنٹوں کی ایک ٹیم "لازینے سور میئر" (Laseyne Sur Mer) کے مقام پر واقع پلانٹ، جو ٹاؤلون شہر کے قریب تھا، فرانس بھیجی۔ چنانچہ اسرائیل ایجنٹوں نے پلانٹ کا اہم حصہ تباہ کر دیا اور اس کی ذمہ داری ایک ایسی تنظیم نے قبول کی جس کا کبھی کسی نے نام تک نہیں سنا تھا۔ یعنی "فرنچ ایکولوجیکل گروپ" (French Ecological Group) ماحولیاتی تحفظ کا فرانسیسی گروپ۔

جب فرانسیسی نیا کور (Core) بنانے میں معروف تھے، عراق نے اپنے اٹامک انرجی کمیشن کے ایک اہم رکن یحییٰ الشاہد کو پیرس بھیجا تاکہ وہ اپنی نگرانی میں انیمی ایندھن بغداد روانہ کرا سکے۔ ہوفی نے مساد کے قاتلوں کی ایک ٹیم یحییٰ کو قتل کرنے کے لئے پیرس بھیج دی۔ اس ٹیم کے دو ارکان مخصوص چابی سے یحییٰ کے ہوٹل کے کمرے کا تالا کھول کر اس کی خوابگاہ میں داخل ہو گئے جبکہ ٹیم کے باقی ارکان ہوٹل کے اردگرد کی گلیوں میں گھومتے رہے۔ قاتلوں نے یحییٰ کا گلا کاٹ کر ذبح کر دیا پھر اس کے دل پر تیز دھار آلے کے کئی وار کئے۔ پھر انہوں نے کمرے کا سامان اِدھر اُدھر بکھیر دیا تاکہ ڈکیتی کی واردات معلوم ہو۔ بعدازاں ساتھ والے کمرے میں ٹھہری ہوئی ایک "پیشہ ور" عورت نے پولیس کو بتایا کہ اُس نے گھنٹہ بھر پہلے ہی اس سائنسدان کی خدمت کی

تھی۔ اس کے کچھ دیر بعد جب وہ ایک اور گاہک کی خدمت میں مصروف تھی تو اُس نے مشاہد کے کمرے سے کچھ عجیب و غریب حرکات کی آواز سنی تھی۔ خاتون کے پولیس کو بیان دینے کے چند گھنٹے بعد ہی اُسے سڑک پر جاتے ہوئے ایک تیز رفتار کار سے گولی مار کر قتل کر دیا گیا۔ اس کار کا پولیس کبھی سراغ نہ لگا سکی۔ قاتل ٹیم کے ارکان اسرائیلی فضائی کمپنی ایل ال کا جہاز پکڑ کر واپس تل ابیب پہنچ گئے۔

ان تمام حادثات کے باوجود عراق نے ایٹمی طاقت بننے کا کام جاری رکھا۔ دوسری طرف اسرائیلی ائرفورس نے بھی اپنی تیاریاں جاری رکھیں اور اسرائیل کی دوسری انٹیلی جنس ایجنسیوں کے سربراہ ائر ریڈ کی حمایت اور ہوفی کی مخالفت میں ڈٹ گئے۔ موساد کے سربراہ ہوفی کو ایک ایسی جگہ سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑ گیا جس کی اُسے قطعی توقع نہ تھی۔ یہ تھا اُس کا اپنا ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل، ناہوم ایڈمونی، جس کی دلیل یہ تھی کہ عراق کے ری ایکٹر کو تباہ کرنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ باقی عرب ملکوں کو سبق سکھایا جا سکے کہ آئندہ وہ ایسے خواب دیکھنے (ایٹمی قوت بننے) کی جرأت نہ کر سکیں۔

اکتوبر 1980ء میں میناچم بیگن کی زیر صدارت ہونے والی کابینہ کی ہر میٹنگ میں ایک ہی موضوع زیر بحث رہتا تھا۔ حملے کے خلاف ہوفی کے دلائل وہی ہوتے تھے اور آخر میں وہ اپنے آپ کو اکیلا اور تنہا محسوس کرنے لگا تھا۔ اُس نے جو بھی زبانی اور تحریری دلائل پیش کئے تھے لگتا تھا کہ وہ اپنی پیشہ وارانہ موت کا پروانہ تحریر کر رہا ہے۔

ایڈمونی کی نظر ہوفی کے عہدے پر تھی اور اُس نے اپنی اس خواہش کو چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ دونوں کسی وقت بہت اچھے دوست تھے لیکن اب دونوں کے درمیان سرد مہری پیدا ہو چکی تھی۔ موساد کے سربراہ ہوفی اور اُس کے سینئر سٹاف کے درمیان اختلافات مزید چھ ماہ تک چلتے رہے، تاوقتیکہ جنرل سٹاف نے ائر ریڈ کے لئے 15 مارچ 1981ء کی تاریخ کی منظوری دے دی۔

یہ حملہ منصوبہ بندی کا شاہکار تھا۔ آٹھ F-16 بمبار جہاز، جن کی حفاظت پر چھ F-15 مامور تھے، صحرائی راستے سے ریت کے تودوں کی سطح پر نیچی پرواز کرتے ہوئے اردن سے گزر کر عراق کی طرف بڑھے اور اپنے مقررہ وقت 5:34 بجے شام، مقامی وقت، اپنے ہدف پر پہنچ گئے۔ یہ وہ وقت تھا جب فرانسیسی ورکر چھٹی کر کے پلانٹ سے جا چکے تھے۔ لمحوں میں نیوکلیئر پلانٹ ملبے کے ڈھیر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس میں 9 افراد ہلاک ہوئے۔ تمام جہاز بحفاظت واپس آ گئے۔ اس کے ساتھ ہی موساد میں ہوفی کا عہد بھی اختتام کو پہنچ گیا اور اس جگہ ایڈمونی (Admoni) نے لے لی۔

اب اپریل 1988ء میں وہی اسلحہ ڈیلر جو سات سال پہلے اسی ہوٹل کی لابی میں اپنے میزبانوں کے ساتھ ساتھ خود بھی گھبراہٹ اور سراسیمگی سے دوچار ہوئے تھے۔ عراق کو ترقی یافتہ اور جدید ترین راڈار سسٹم بیچنے کی کوشش کر رہے تھے، وہیں موساد کا ایک ایجنٹ ان ڈیلروں کا نام اور عراق کو بیچے جانے والے اسلحے کی تفصیلات خفیہ طور پر نوٹ کر رہا تھا۔

قبل ازیں اسی جمعہ کے روز اسلحہ کے سوداگروں اور اُن میزبانوں کے درمیان ہونے والی سودابازی میں کچھ دیر کے لئے خلل پڑا تھا۔ جب عراقی خفیہ پولیس کا سربراہ اور صدام حسین کا سوتیلا بھائی صباح الطریقی اپنے محافظوں کے ساتھ لابی میں داخل ہوا تھا لیکن وہ لفٹ کی طرف بڑھ گیا جو اُسے ہوٹل کی سب سے بالائی منزل پر اُس کے لئے مخصوص کمرے میں لے جانے کے لئے تیار کھڑی تھی۔ وہاں اس کی خدمت کے لئے پیرس سے بلائی گئی ایک خوبصورت، نازک اندام اور سڈول جسم والی

طوائف پہلے سے موجود تھی جسے پیرس سے خصوصی پرواز سے بغداد لایا گیا تھا۔ یہ ایک انتہائی مہنگا اور بہت ہی خطرناک کھیل تھا۔ کہا جاتا ہے کہ قبل ازیں جو بھی طوائفیں صباح کی عیاشی کے لئے پیش کی جاتی رہی تھیں وہ سب بعدازاں غائب ہوجاتی رہی ہیں۔

سکیورٹی چیف سہ پہر کے وقت واپس چلا گیا۔ اس کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد طوائف کے ساتھ والے کمرے سے ایک لمبا تڑنگا نوجوان، نیلے رنگ کی کاٹن کی جیکٹ اور ٹائی میں ملبوس، باہر نکلا۔ وہ اچھی شکل وشباہت کا تھا لیکن اسے بار بار اپنی مونچھوں کو مروڑنے اور چہرے پر ہاتھ پھیرنے کی عادت سی تھی جس کی وجہ سے وہ دوسروں کی نظروں میں آرہا تھا۔

اُس کا نام فرزاد بازوفت (Farzad Bazoft) تھا۔ ہوٹل کے رجسٹر میں درج تفصیل کے مطابق جس کی ایک نقل معمول کے مطابق صباح کے دفتر میں بھجوادی گئی تھی، بزوفت نے اپنے آپ کو لندن کے اتوار کے روز شائع ہونے والے قومی اخبار ''دی آبزرور'' (The Observer) کا چیف غیر ملکی نمائندہ ظاہر کیا تھا۔ یہ تفصیل غلط تھی۔ اخبار کے وہ نمائندے جنہیں کسی مشن پر خصوصی طور پر تعینات کر کے بھیجا جاتا تھا صرف وہی اپنے آپ کو غیر ملکی نمائندہ کہلانے اور لکھنے کے مجاز تھے۔ بزوفت نے بغداد میں اسی کی طرح آئے ہوئے غیر ملکی صحافیوں کے سامنے کئی بار اس بات کا تذکرہ کیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو دی آبزرور کا چیف غیر ملکی نمائندہ اس لئے ظاہر کرتا ہے کہ اس طرح اُسے سستے داموں ہوٹل کا بہترین کمرہ مل جاتا ہے، اُس کی اس حرکت کو ایک معصومانہ اور بچگانہ فعل سمجھا جاتا تھا۔

اُس کے اخباری دوستوں کو بالکل علم نہ تھا کہ بزوفت کی بغداد میں موجودگی کا ایک تاریک اور گھناؤنا پہلو بھی تھا کہ اگر ظاہر ہوجاتا تو وہ سب اُس کے ساتھ اور رازدان ہونے کی بناء پر دھر لئے جاتے۔ بزوفت حقیقت میں موساد کا ایجنٹ اور جاسوس تھا۔

اسے تین سال پہلے موساد کا ایجنٹ بھرتی کیا گیا تھا جب وہ نیا نیا تہران سے بھاگ کر لندن آیا تھا۔ تہران میں اس کی زندگی کو اس وقت خطرہ لاحق ہوگیا تھا جب اس نے خمینی اور اس کی حکومت کے خلاف برسرعام اپنے خیالات کا اظہار شروع کر دیا تھا۔ اپنا ملک چھوڑ کر پہلے لندن آنے والے غیر ملکیوں کی طرح اس نے بھی محسوس کیا کہ لندن میں غیر ملکی اور گورے بھی کسی نئے آنے والے سے زیادہ فری اور بے تکلف نہیں ہوتے اور سرد مہری سے پیش آتے ہیں۔ اپنے جلاوطن ساتھیوں کے درمیان اپنے سیاسی خیالات اور موجودہ ایرانی صورت حال کے تجزیوں کی بنا پر ہر کھانے کی میز پر اس کی پذیرائی ہونے لگی لیکن جلد ہی اپنے ہی لوگوں کے چہرے دیکھ دیکھ کر اس کی طبیعت میں ہیجان اور اضطراب پیدا ہونے لگا اور اُس نے اپنی اونچا اڑنے کی خواہش کی تکمیل کے لئے ادھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیا۔

اس نے ایران کے دشمن عراق سے تعلقات پیدا کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ 1980ء کی دہائی میں لندن میں کافی تعداد میں عراقی موجود تھے کیونکہ ان کا وہاں خوش دلی سے استقبال کیا جاتا تھا۔ وجہ یہ تھی عراق اس وقت برطانوی مال کا ایک بڑا خریدار تھا اور دوسرے برطانوی حکومت کے خیال میں صدام حسین ایران میں خمینی کی اسلامی بنیاد پرستی کی راہ میں رکاوٹ بن سکتا تھا۔

لندن میں بزوفت کو عراقیوں کی دعوتوں میں بلایا جانے لگا۔ اس کے نئے میزبان، ایرانیوں کی نسبت زیادہ فراخ دل اور خوش طبع تھے۔ پھر وہ تہران کے آنت اللاؤں کے بارے میں اس کی تنقیدی اور ظریفانہ گفتگو سے بھی حظ اٹھاتے تھے۔

ایک پارٹی کے دوران اس کی ملاقات ایک عراقی

تاجر ابوالحمیدی سے ہوئی جس نے توجہ سے بزدفت کی باتیں سنیں۔ ہلکے سے نشے میں وہ ڈینگیں مار رہا تھا کہ وہ باب ووڈ ورڈ (Bob Woodward) اور کارل برنشین جیسا عظیم صحافی بننا چاہتا ہے جنہوں نے صدر نکسن کی حکومت الٹادی تھی۔ وہ اسی طرح آیت اللہ خمینی کی حکومت ختم کرا کے دم لے گا۔ اب تک بزدفت ایرانی تارکین وطن کے ایک چھوٹے سے اخبار میں مضامین لکھا کرتا تھا۔

ابوالحبیب، عراقی النسل موساد کے ایک ایجنٹ کی عرفیت تھی۔ اُس نے اپنی اگلی رپورٹ جو تل ابیب بھیجی اس میں بزدفت کا مختصر تعارف، اُس کے موجودہ کام اور آئندہ کی آرزوؤں کا ذکر تھا۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ ہر ہفتہ موساد میں شامل کئے جانے کے لائق سینکڑوں افراد کے نام کمپیوٹر ڈاٹا بیس میں درج کرنے کے لئے بھیجے جاتے تھے۔

لیکن اُس وقت ناہوم ایڈمونی (Nahum Admoni) موساد کا سربراہ تھا اور وہ عراق میں اپنے رابطے بڑھانے کا زبردست خواہشمند تھا۔ لندن کے ایجنٹ کو کہا گیا کہ بزدفت کو موساد میں شامل کرنے کے لئے ترغیب دی جائے۔ کھانے کی پُرتکلف دعوتوں کے دوران بزدفت اکثر اس بات کا روزنا روتا رہتا تھا کہ اس کا ایڈیٹر اس کی صلاحیتوں سے فائدہ نہیں اٹھا رہا۔ اس کے میزبان الحبیب نے اسے مشورہ دیا کہ وہ انگریزی کے باقاعدہ اور معروف اخبارات میں قسمت آزمائی کرے اور اپنی صحافتی صلاحیتوں کو جلا بخشے۔ انہیں ہمیشہ ایرانی امور کو سمجھنے والے رپورٹر کی، جو اچھی انگلش بھی لکھ سکتا ہو، تلاش رہتی ہے۔ نیز الحبیب نے مشورہ دیا کہ وہ ابتدائی طور پر بی بی سی میں کوشش کرے۔

اس نشریاتی ادارے میں بھی بے شمار موساد کے مخبر گھسے ہوئے تھے جو اسرائیل کے بارے میں پروگراموں کی پیشگی اطلاع تل ابیب کو پہنچا دیتے تھے بلکہ بی بی سی کی طرف سے عربی زبان کے نئے بھرتی کئے جانے والے رپورٹروں پر نظر رکھتے تھے۔ بی بی سی میں بزدفت کو نوکری دلانے میں موساد کے کسی مخبر کا ہاتھ تھا یا نہیں اس بارے میں یقینی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے لیکن الحبیب کے مشورے کے فوراً بعد اسے ایران پر کسی ریسرچ پیپر کے لئے بی بی سی نے اس کی خدمات حاصل کر لیں۔ اس نے بہت اچھا پیپر لکھا جس کی وجہ سے اسے مزید کام مل گیا۔ پھر اُسے ایرانی ڈیسک کا ایڈیٹر بنا دیا گیا کیونکہ وہ ایران کے اندرونی رونما ہونے والی سازشوں سے خوب آگاہ تھا۔

تل ابیب میں ایڈمونی نے فیصلہ کیا کہ اب اسے نئی چال چلنی چاہئے۔ چونکہ "ایران گیٹ" کے بارے میں امریکہ میں نئے نئے انکشافات سامنے آرہے تھے، موساد کے سربراہ نے جان بوجھ کر اسرائیلی ملٹری انٹیلی جنس امان کے افسر یکنوف نمرودی کا نام اس سکینڈل میں افشاء کر دیا۔ یہ اس کنسورشیم کا ایک ممبر تھا جو ڈیوڈ کمشے نے قائم کیا تھا اور جس کی خفیہ سرگرمیوں سے موساد کو باہر رکھا گیا تھا۔ چرب زبان اور گرم گفتار نمرودی نے امریکن سیکرٹری آف سٹیٹ (وزیر خارجہ) جارج شولز کو یہ بیان دینے پر مجبور کر دیا تھا کہ

"ایران کے بارے میں اسرائیل کا ایجنڈا وہ نہیں ہے جو ہمارا ہے اور اس کی مہیا کردہ خفیہ اطلاعات پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا"۔

جب کمشے نے اپنے آپ کو کنسورشیم سے الگ کر لیا تھا تو نمرودی پھر بھی اس کے ساتھ کام کرتا رہا تھا لیکن جب واشنگٹن کی طرف سے ناراضگی اور ناپسندیدگی پُرزور اور بلند آواز میں ظاہر ہونے لگی جس سے اسرائیل میں سراسیمگی پھیل گئی تو نمرودی منظر سے غائب ہو گیا۔ ایڈمونی نے جہاں ایک طرف برسرعام نمرودی کو ہراساں کیا وہیں دوسری طرف اس نے بزدفت کی حوصلہ افزائی

تا کہ وہ بہتر انداز میں موساد کی خدمات انجام دے سکے۔

الجیب نے رپورٹر کو کافی تفصیل مہیا کی اور اُسے بتایا کہ اس سے تمہاری کامیابی کے دروازے کھل جائیں گے۔ وہ سٹوری لکھ کر ''دی آبزرور'' کے پاس لے گیا اور یہ اس طرح سے چھپ گئی۔ ''ایک پراسرار اسرائیلی نمرودی ایران گیٹ میں ملوث ہے''۔ اس کے فوراً بعد وہ باقاعدگی سے ''دی آبزرور'' میں چھپنے لگا۔

آخر کار ایک ایسا شخص جس کا نام سٹاف کی فہرست میں ہی نہ تھا، اُسے اپنا الگ ڈیسک مل گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اب وہ گھر میں بیٹھ کر بھی کسی سٹوری کے سلسلے میں ٹیلیفون کا استعمال کرے گا تو اس کا اخبار دے گا۔ نیز وہ چائے پانی کے خرچے کا بھی حقدار ہو گا لیکن اب بھی بزوفت کو ادائیگی اُس کے شائع شدہ میٹر کے حساب سے ہی کی جاتی تھی، یا اگر وہ کسی سٹوری کے سلسلے میں مڈل ایسٹ آتا جاتا تھا تو اس کے اخراجات ملتے تھے۔ البتہ متفرق اخراجات کے نام پر وہ کچھ مزید رقم بھی کلیم کر سکتا تھا۔ پیسے کی کمی ہمیشہ ہی بزوفت کا دردِ سر بنی رہی تھی لیکن وہ یہ بات اپنے ''دی آبزرور'' کے دوسرے ساتھیوں سے چھپاتا تھا۔ یقینی طور پر اس کا کوئی بھی ساتھی شک شبہ نہیں کر سکتا تھا کہ اُن کا ایک محنتی رپورٹر جو خصوصی ذرائع سے فارسی میں بات چیت کرنے میں گھنٹوں صرف کرتا تھا، ایک سزا یافتہ چور تھا۔ بزوفت نے ایک بلڈنگ سوسائٹی میں چوری کے جرم میں 18 مہینے تک جیل کی ہوا کھائی تھی۔ سزا سنانے والے جج نے حکم دیا تھا کہ سزا بھگتنے اور رہائی کے بعد اُسے ڈیپورٹ کر دیا جائے۔ بزوفت نے اس سزا کے خلاف، اس بنیاد پر اپیل کی تھی کہ واپس ایران بھیجے جانے کی صورت میں اُسے وہاں سزائے موت دے دی جائے گی۔ اگرچہ اپیل نامنظور ہو گئی تھی لیکن اُسے خلاف معمول برطانیہ میں نامعلوم مدت تک رہنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ اسے یہ غیر معمولی اور خصوصی اجازت کیوں دی گئی؟ اس کا راز ماسوائے وزارتِ داخلہ کے کسی کو معلوم نہیں ہے۔

کیا موساد نے اپنے کسی اعلیٰ سطح کے وائٹ ہال میں موجود ایجنٹ کے اثر ورسوخ سے اسے یہ خصوصی اور غیر معمولی رعایت دلوائی تھی، ہمیشہ پردہ اخفا میں ہی رہا لیکن اس امکان کو رد بھی نہیں کیا جا سکتا۔

جب بزوفت قید سے رہا ہوا تو ڈیپریشن کا مریض بن چکا تھا جس کا اس نے ہومیوپیتھک دوائیوں سے علاج کیا۔ ان ساری چیزوں کا سراغ موساد کے ایجنٹ نے لگایا تھا۔ بعدازاں ایک انگریز رائٹر کنزرویٹو (Conservative) پارٹی کے ممبر پارلیمنٹ اور انٹیلی جنس ریکروٹمنٹ کے ماہر روپرٹ ایلی سن (Rispert Alison) نے بتایا کہ ایسے ہی نوجوان موساد میں بھرتی کے لئے آسان ہدف ہوتے ہیں۔

بزوفت سے اپنی پہلی ملاقات کے تقریباً ایک سال بعد الجیب نے اسے موساد میں بھرتی کر لیا۔ اسے کیسے اور کہاں موساد کا ایجنٹ بنایا گیا یہ راز بھی کسی کو معلوم نہیں ہے۔ یقینی طور پیسے کی کمی اور شدید ضرورت ہی اس کے لئے موساد میں کشش کا باعث بنی ہو گی یا جس طرح ایک روسی جاسوس نے اپنی اصلیت کی پردہ پوشی کے لئے، فلبی کے نام سے ''دی آبزرور'' کے رپورٹر کے طور پر اخبار میں شمولیت کر رکھی تھی، بزوفت نے بھی اسی روپ میں اپنے آپ کو ''دی آبزرور'' کے روپ میں چھپایا ہوتا کہ اُس کا جاسوس بننے کا دیرینہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکے۔

بزوفت کے انگریزی لکھنے میں جو خامیاں اور کمزوریاں تھیں، اب وہ بھی دور ہونے لگی تھیں اور ایران کے بارے میں اُس کی ریسرچ رپورٹیں نہ صرف ''دی آبزرور'' کے صفحات پر شائع ہو رہی تھیں بلکہ اُسے ''انڈیپنڈنس ٹیلی وژن نیوز'' اور ''مرر'' گروپ کے اخبارات سے بھی کام ملنے لگا تھا جس کی وجہ سے اس کی

مقبولیت میں بھی اضافہ ہورہا تھا۔ اس وقت "ڈیلی مرر" کا فارن ایڈیٹر نکولس ڈیویز تھا۔ موساد کے اس وقت کے سربراہ ناہوم ایڈ مونی نے بھی اس کو موساد کا ایجنٹ بنانے کی اجازت دے دی تھی۔

ڈیویز ہمیشہ اس بات پر مصر رہا کہ اسے موساد کا ایجنٹ بننے کی دعوت ضرور دی گئی تھی لیکن اس نے موساد کے ایجنٹ کے طور پر کبھی کام نہیں کیا اور اپریل کے اس جمعہ کی سہ پہر بغداد کے ہوٹل کی لابی میں اس کی موجودگی بطور صحافی اسلحہ کی سودا بازی کا مشاہدہ کرنا تھا۔ بعد ازاں اس کو یاد نہیں آرہا تھا کہ اس روز بزوفت نے ہوٹل کی لابی میں کیا بات چیت کی تھی لیکن اس نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ وہ بات چیت اسی اسلحہ کی سودا بازی کے بارے میں ہی ہوئی ہوگی"۔ اس نے مزید وضاحت سے انکار کر دیا اور ہمیشہ اپنے اس موقف پر قائم رہا۔

دونوں بزوفت اور ڈیویز نے لندن کے چند دیگر صحافیوں کے گروپ کے ساتھ بغداد کا سفر کیا تھا، جن میں اس کتاب کا مصنف بھی شامل تھا جسے برطانیہ کی قومی وائر سروس، "پریس ایسوسی ایشن" نے ایک مضمون کی تیاری پر مامور کیا تھا۔ لندن سے بغداد جاتے ہوئے جہاز کے سفر کے دوران ڈیویز نے اپنے صحافی ساتھیوں کو رابرٹ میکسویل کی بدزبانی اور شہدا پن کے قصے سنائے تھے۔ جس نے آخر کار "مرر" اخبارات خرید لئے تھے۔ ڈیویز اسے جنسی عفریت جو اپنے سٹاف میں موجود سیکرٹریوں کو ورغلانا اپنا حق سمجھتا تھا۔ اس نے اپنے بارے میں صاف طور پر کہا کہ وہ میکسویل کے بہت قریب ہے۔ اس کے سننے والوں نے اس کی باتوں کو صرف لاف زنی قرار دیا تھا۔

پرواز کے دوران بزوفت نے اپنے ساتھیوں سے بہت کم بات کی۔ وہ زیادہ تر فضائی میزبانوں سے اپنی فارسی زبان میں محو گفتگو رہا۔ اس کی زبان دانی کی وجہ سے اس کے باقی ساتھیوں نے بغداد ائیرپورٹ پر اُسے اپنا ترجمان بنا لیا۔ ڈیویز نے سرگوشی میں بتایا کہ وہاں ڈیوٹی پر موجود سب عراقی انٹیلی جنس کے کارندے ہیں۔

فلسطین میریڈیان ہوٹل پہنچ کر "دی مرر" کے رپورٹر نے ساتھیوں کو بتایا کہ وہ محض اس لئے یہاں آیا ہے کہ وہ لندن کے ماحول سے بور ہو چکا تھا لیکن اس نے واضح کر دیا کہ وہ سرکاری پروگرام کے مطابق یہاں سفر نہیں کرے گا جس میں بصرہ کے میدان جنگ کا دورہ، جہاں عراقی آرمی ایرانیوں پر اپنی فتح کے ثبوت اور ایرانیوں کی تباہی کے آثار پریس کو دکھانا چاہتی تھی۔ بزوفت نے کہا کہ گلف کے جنوب کی طرف سفر میں اس کے اخبار کو کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

اپریل 1988ء کے اس جمعہ کی شام کے کئی گھنٹے ہوٹل کی لابی میں اسلحے کی سودا بازی، اسلحہ ڈیلروں کی آمدورفت کو دیکھنے کے دوران بزوفت نے کئی مرتبہ ڈیویز سے بات چیت کی لیکن اس نے رات کا کھانا ہوٹل کی کافی شاپ میں اکیلے ہی کھایا۔ اس نے اپنے گروپ کے لندن سے آئے ہوئے دیگر ساتھیوں کے ساتھ کھانے سے یہ بہانہ کر کے جان چھڑائی کہ اُسے اپنا پروگرام چیک کرنا ہے۔ کھانے کے دوران اُسے لابی میں ٹیلی فون کال اٹینڈ کرنے کے لئے بلایا گیا۔ وہ چند منٹ بعد واپس آیا تو کچھ گھبرایا ہوا اور پریشان نظر آرہا تھا۔ اس نے میٹھے کا آرڈر دیا لیکن اچانک میز سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے اپنے ساتھی کا بیہودہ سا لطیفہ بھی نہیں سنا جو کسی لڑکی کے بارے میں تھا اور چل پڑا۔

وہ اگلے دن تک کسی کو نظر نہیں آیا۔ اگلے دن وہ پہلے سے زیادہ پریشان اور الجھا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے دوسروں کے علاوہ کم للیچر، ایک فری لانس جرنلسٹ، جو اُن دنوں لندن کے اخبار "ڈیلی میل" کے لئے کام کر رہا تھا، بتایا کہ "تم سب کے لئے صورت حال

معمول کے مطابق ہے کیونکہ تم سب لندن میں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے ہو۔ میں ایرانی ہوں یہی میری پریشانی کا باعث ہے۔" للیچر دوسرے انگلش رپورٹروں کی طرح یہ سوچنے میں اکیلا نہ تھا کہ کیا بزوفت کا پس منظر پھر اُس کے لئے کسی مصیبت کا باعث بنے گا۔

بزوفت نے دن کا بیشتر حصہ لابی میں متر گشت کرتے ہوئے یا اپنے ہوٹل کے کمرے میں گزارا۔ دو دفعہ وہ مختصر وقت کے لئے ہوٹل سے باہر بھی گیا۔ ہوٹل کی لابی میں اُس نے کئی مرتبہ نکولس ڈیویز سے بھی گفتگو کی اور جس نے بعد میں بتایا کہ ہر رپورٹر کی طرح بزوفت کسی سٹوری کی تلاش میں تھا اور پریشان تھا کہ اُس کو مطلوبہ سٹوری مل بھی سکے گی یا نہیں۔ جہاں تک اس کا تعلق تھا بحیثیت مرر کے فارن ایڈیٹر کے اس نے اعلان کر دیا کہ وہ کچھ بھی نہیں لکھے گا۔ "کیونکہ یہاں ایسا کچھ بھی نہیں تھا جس میں کیپٹن باب (ایڈیٹر) کے لئے کسی دلچسپی کا سامان ہو"۔

اُس روز شام کے بعد بزوفت ایک دفعہ پھر ہوٹل کے باہر چلا گیا۔ معمول کے مطابق وہ اکیلا تھا۔ ایک عراقی خفیہ والا اس کے تعاقب میں تھا لیکن جب وہ واپس آیا تو پھر اکیلا ہی تھا۔ دیگر رپورٹروں نے بزوفت کو ڈیویز کے سامنے یہ کہتے ہوئے سنا، اس کا اس طرح تعاقب نہیں ہونا چاہئے جس طرح ایک گرم کتیا کا کتے کرتے ہیں"۔

ڈیویز کے زوردار قہقہے نے بزوفت کے موڈ میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی۔ ایک دفعہ پھر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ جب وہ اگلی دفعہ لابی میں نظر آیا تو اس نے کئی رپورٹروں کو بتایا کہ وہ ان کے ساتھ واپس لندن نہیں جائے گا۔ "کچھ ہونے والا ہے"۔ اس نے ایک خاص پُراسرار لہجے میں بتایا۔

"یہ ایک ایسی شاندار سٹوری ہے جس کی وجہ سے میں یہاں رُک رہا ہوں"۔ للیچر نے بتایا۔

گھنٹہ بھر کے بعد وہ پھر ہوٹل سے باہر نکل گیا۔ اس کے بعد کسی نے اُس کی شکل نہیں دیکھی۔ تاوقتیکہ گرفتاری کے ہفتے بعد عراقی حکومت کی طرف سے دنیا بھر میں تقسیم کی گئی ویڈیو میں وہ اپنے آپ کو موساد کے خفیہ ایجنٹ ہونے کا اعتراف کرتا ہوا نظر آیا۔

بغداد میں قیام کے دوران بزوفت موساد کی طرف سے ایک ایسے مشن پر مامور تھا جس کے لئے ایک نہایت تربیت یافتہ اور تجربہ کار ایجنٹ کی ضرورت تھی۔ اس کو حکم دیا گیا تھا کہ یہ سراغ لگائے کہ جنرل بُل کی طرف سے عراق کو سوپر گن (Supergun) مہیا کرنے کا منصوبہ کس سطح پر ہے؟ ایک صحافی کو ایسا ہدف دینے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو استعمال کرنے والے اس کا کس طرح استحصال کر رہے تھے۔ موساد نے اس بات کا بھی انتظام کر رکھا تھا کہ اگر وہ پکڑا جائے تو لندن کی کسی کمپنی کا کارندہ ظاہر کیا جائے جس کا نام تھا "ڈیفنس سسٹم لیمٹڈ" (DSL)۔ جب بزوفت سوپر گن کی تجربہ گاہ کے قریب گرفتار ہوا تو عراقی خفیہ ایجنٹوں نے اس کے قبضے میں سے ایسی دستاویزات و کاغذات بھی برآمد کر لئے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے ہوٹل سے ڈی ایس ایل کو کئی فون کالیں کی تھیں۔ کمپنی اس بات سے صاف انکاری ہو گئی کہ وہ بزوفت کو جانتی ہے یا اس کا موساد سے کوئی تعلق ہے۔ برطانوی پارلیمنٹ نے ایسے رپورٹر کو بغداد بھیجنے پر "دی مرر" کی مذمت کر دی۔

بزوفت کو مارچ 1990ء کو بغداد میں پھانسی دے دی گئی۔

تل ابیب میں جن لوگوں نے بزوفت کی ویڈیو دیکھی اور اس کے انجام پر اظہار افسوس کیا، ان میں اسرائیلی انٹیلی جنسی کمیونٹی کی ایک انتہائی نمایاں اور قابل احترام شخصیت اری بن مناشے (Iri Ben-Menashe) کی تھی۔ اس وقت تک اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ بزوفت نامی کوئی شخص بھی موساد کے ایجنٹوں

میں موجود ہے لیکن اس نے تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”ایک اور معقول آدمی کو غلط وقت پر غلط جگہ پر بھیجا گیا“۔

اری بن مناشے، انٹیلی جنس کی ایک نہایت اہم اور حساس نوعیت کی پوسٹ پر اسرائیلی افواج کے ایکسٹرنل ریلیشن ڈیپارٹمنٹ (External Relations Department) میں گزشتہ دس سال 1977ء تا 1987ء فائز رہا تھا جو محکمہ دفاع کی سب سے زیادہ طاقتور اور خفیہ انٹیلی جنس تنظیم تھی۔

ای آر ڈی (ERD) کا قیام 1974ء میں اس وقت کے وزیراعظم یزہاک رابن کے حکم سے عمل میں لایا گیا تھا جب ملٹری انٹیلی جنس کی ناکامی کی وجہ سے یوم کپور پر شام اور مصر نے مشترکہ طور پر اچانک اسرائیل پر یلغار کردی تھی۔ اس خفیہ ایجنسی کا بنیادی کام دوسری خفیہ ایجنسیوں کے کام پر نظر رکھنا اور خود اپنے طور پر اطلاعات و معلومات اکٹھی کرنا تھا۔

ای آر ڈی کی چھتری تلے کام کرنے کے لئے مزید چار شعبے قائم کیے گئے تھے۔ ان میں سب سے اہم ”سیم“ (SIM) تھا جس کا کام ایران، عراق، شام اور سعودیہ میں ابھرتی ہوئی آزادی کی تحریکوں کی نگرانی اور انہیں ہوا دینا تھا۔ دوسری ”ریش“ (Resh) کہلاتی تھی جس کا کام دوست ملکوں کی خفیہ ایجنسیوں کے ساتھ مل کر جاسوسی کا کام کرنا تھا۔ اس میں سب سے اہم ساؤتھ افریقن بیورو آف سٹیٹ سکیورٹی تھی۔ موساد کا بھی اسی قسم کا ایک شعبہ ٹی ویل (Tevel) کے نام سے قائم تھا اور اس نے بھی جنوبی افریقہ کی خفیہ ایجنسی سے اسی قسم کے روابط قائم کر رکھے تھے۔ اب دونوں ایجنسیوں کے ایک ہی نوعیت کے کام کی وجہ سے ریش اور ٹی ویل کے درمیان کشیدگی اور تناؤ کی کیفیت پیدا ہوتی رہتی تھی۔

ای آر ڈی کا تیسرا شعبہ فارن لیاژان (Foreign Liasion) تھا۔ اس کا کام اسرائیل کے غیر ملکوں میں قائم سفارتخانوں میں تعینات ملٹری اتاشی اور IDF کے افراد کی نگرانی اور اسرائیل میں قائم غیر ملکی سفارتی مشنوں کے ملٹری اتاشیوں پر نظر رکھنا تھا۔ اب ایک دوسری انٹیلی جنس ایجنسی سے اس کی آویزش شروع ہو گئی۔ یہ تھی ”شن بیت“ (Shin Bet) جو قبل ایسی تمام سرگرمیوں کو رپورٹ کرنے کا استحقاق رکھتی تھی۔ ای آر ڈی کا چوتھا بازو یا شعبہ ”انٹیلی جنس ٹویلو“ (Intelligence Twelve) کہلاتا تھا۔ اس کا کام موساد کے ساتھ مل کر جاسوسی کا کام کرنا تھا۔ اس یونٹ نے اپنے دفاتر کی اوپر کی منزل پر کام کرنے والے موساد کے کارندوں سے تعلقات کو مزید کشیدہ بنا دیا جو یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ ای آر ڈی کا یہ یونٹ ان کے اختیارات اور طاقت کو محدود کر دے گا۔ بن مانشے کو ریش کے ساتھ منسلک کر کے اسے ایران پر نظر رکھنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ وہ اس شعبے میں اس وقت آیا تھا جب اسرائیل، اس ریجن کے اپنے ایک بڑے بہی خواہ اور ہمدرد، شاہ آف ایران سے محروم ہو رہا تھا۔ شاہ نے پردے کے پیچھے رہ کر اسرائیل کے عرب ہمسایوں کو یہودی ریاست کے خلاف جارحیت ختم کرانے کی کوشش کی تھی۔ وہ اس وقت بھی خصوصی طور پر اردن کے شاہ حسین سے رابطوں میں مصروف تھا کہ آیت اللہ خمینی کے بنیاد پرست اسلامی انقلابیوں نے اس کا سنہری مور والا تخت فروری 1979ء میں الٹا دیا۔ خمینی نے فوراً ہی تہران میں اسرائیلی سفارت خانے کی عمارت تحریک آزادیٔ فلسطین (PLO) کے حوالے کردی۔ ردعمل میں اسرائیل نے کردوں کی طرف رجوع کر لیا اور ایران کی نئی حکومت کے خلاف گوریلا جنگ شروع کروا دی اور ساتھ ہی ساتھ ایران کو عراق کے خلاف استعمال کرنے کے لئے ہتھیاروں کی سپلائی بھی جاری رکھی۔ ڈیوڈ کمشے اور موساد

کے دوسرے دماغوں کی یہ پالیسی جاری رکھی کہ "دونوں دشمنوں کو آپس میں لڑا کر ختم کرو"۔

بن مناشے نے اپنے آپ کو جلد ہی ڈیوڈ کمشے کی اس حکمت عملی کا حصہ بنا لیا جو ایران کو ہتھیاروں کی سپلائی کے بدلے یرغمالیوں کی رہائی کے لئے تیار کی گئی تھی۔ دونوں اشخاص نے اکٹھے واشنگٹن کی یاترا کی۔ بن مناشے کے دعوے کے مطابق اس نے وہاں وائٹ ہاؤس کے برآمدوں میں چہل قدمی کی، صدر ریگن سے ملاقات کی اور صدر کے سینئر مشیروں سے مذاکرات کئے۔

پُرکشش شخصیت ہنس مکھ لا اُبالی طبیعت کا مالک بن مناشے انٹیلی جنس ایجنسیوں کی پارٹیوں کی ایک ہردلعزیز شخصیت تھا جہاں سینئر سیاستدان اور جاسوسی کے ماہرین آپس میں دلچسپ واقعات، مشاہدات سے ایک دوسرے کو آگاہ کیا کرتے تھے۔ بن مناشے سے بڑا کہانی کار کوئی نہ تھا۔ جس وقت کمشے ایران کے ساتھ "ہتھیار برائے یرغمالی رہائی" ڈیل پر کام شروع کرنے والا تھا، بن مناشے کو وزیراعظم یزہاک شامیر کا انٹیلی جنس پر ذاتی مشیر مقرر کر دیا گیا تھا جس نے شامیر کو بتایا تھا کہ وہ جانتا ہے کہ سب مُردے کہاں دبائے گئے ہیں۔ کمشے نے بن مناش کی تعیناتی کو ایک اچھا انتخاب قرار دیا تھا اور خیال ظاہر کیا تھا کہ اب بن مناشے کو انٹیلی جنس کے ایک ایسے افسر کے ساتھ مل کر کام کرنے کا موقع ملے گا جسے میں سب افسروں پر ترجیح دیتا ہوں، میری مراد ہے رافی ایتان۔

وزیراعظم کی مکمل تائید کے ساتھ بن مناشے کو تمام دیگر ڈیوٹیوں سے فارغ کر دیا گیا تھا تاکہ وہ ایتان کے ساتھ کام کر سکے۔ دونوں افراد مارچ 1981ء میں نیویارک چلے گئے۔ اُن کے وہاں جانے کا مقصد جیسا کہ بعدازاں بن مناشے نے بتایا، بڑا سیدھا سادا تھا۔ "تہران میں موجود ہمارے دوستوں کو نئے اور جدید ترین الیکٹرانک ہتھیاروں کی اپنی ائرفورس کے لئے فوری ضرورت تھی جس کے لئے وہ شدید پریشان تھے۔ اسی طرح زمینی افواج کے لئے بھی اسلحے کی ضرورت تھی۔ اسرائیل ہر صورت میں اُن کی امداد کرنا چاہتا تھا اور عراق کے خلاف ہر ممکنہ حد تک تعاون کا خواہشمند تھا"۔

موساد کے ایجنٹ برطانوی (جعلی) پاسپورٹ پر سفر کرنے کو ہمیشہ ترجیح دیتے ہیں۔ انہوں نے نیویارک کے ایک مالیاتی مرکز میں ایک کمپنی کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے خفیہ طور پر الیکٹرانک انڈسٹری کو کھنگالنے کے لئے پچاس دلالوں کی خدمات حاصل کیں جو مناسب مال تلاش کر سکیں۔ مال تل ابیب روانگی کے وقت ہر کنٹینر کے ساتھ یہ سرٹیفکیٹ لگایا جاتا تھا کہ "یہ مال صرف اسرائیل میں استعمال کے لئے ہے"۔ بن مناشے کا کہنا ہے کہ ہمارے پاس بھاری تعداد ایسے سرٹیفکیٹ موجود ہوتے تھے جنہیں ہم خود ہی پُر کرتے تھے تاکہ تل ابیب میں فائلوں کا پیٹ بھرا جا سکے اور کسی چیکنگ کی صورت میں ریکارڈ مکمل نظر آئے۔

یہ سازوسامان ہوائی جہازوں کے ذریعے تل ابیب پہنچایا جاتا تھا جہاں سے کسٹم سے گزارے بغیر اسے آئرلینڈ سے کرائے پر حاصل کئے گئے جہازوں پر منتقل کر کے تہران روانہ کر دیا جاتا تھا۔ آئرش جہازوں اور پائلٹوں کو اس کام کے لئے استعمال کرنے کا خیال بھی رافی ایتان کے اپنے ذہن کی اختراع تھا، کیونکہ اپنے آئرش پس منظر اور تعلق کو نہیں بھولا تھا۔ سودابازی کرتے وقت آئرش لوگوں کی ایک ہی شرط ہوتی تھی۔ ادائیگی نقد کیونکہ ادھار محبت کی قینچی ہے۔

جب اس نیویارک آپریشن میں وسعت پیدا ہوگئی اور کئی بلین ڈالر کی خرید وفروخت ہونے لگی تو ایک ہولڈنگ کمپنی (Holding Company) کی ضرورت محسوس ہونے لگی جو اسلحے کے بھاری بھرکم سودوں کا ریکارڈ تیار کر سکے۔ کمپنی کے لئے جو نام انتخاب

کیا گیا وہ تھا ''اورا'' (Ora) جس کا عبرانی میں مطلب ہے روشنی۔

مارچ 1983ء میں بن مناشے نے ربائی ایتان کو مشورہ دیا کہ وہ ڈیویز کو اورا میں بھرتی کر لے۔ یقیناً کہنہ مشق اور تجربہ کار جاسوس بن مناشے نے نکلس ڈیویز کا نام موساد سے ہی سنا ہوگا اور مجھے سے ڈیویز کا تعارف بزوقت کے ذریعے ہوا ہوگا جو ''ڈی مرز'' کے فارن ایڈیٹر کے لیے صحافی کے روپ میں موساد کے لیے کام کرتا تھا۔

اسی مہینے کے آخر میں لندن کے چرچل ہوٹل کی لابی میں بن مناشے اور ڈیویز کی ملاقات ہوئی۔ جب ان کی ملاقات ہوئی تو بن مناشے کا تاثر تھا کہ ڈیویز ہمارے ڈھب کا آدمی ہے۔

اگلے روز دونوں نے دوپہر کا کھانا ڈیویز کے گھر پر کھایا جس میں ڈیویز کی بیوی جینٹ (Jenet) بھی شامل تھی۔ بن مناشے نے خاموشی سے یہ تاثر لیا کہ غلط استدلال اور سیدھی گفتگو کرنے والا ڈیویز اپنی بیوی کو کھونے سے خوفزدہ ہے۔ یہ تو اچھی بات ہے۔ اس کی اس کمزوری کو اس کے خلاف استعمال کیا جاسکتا ہے۔

آخرکار اورا میں ڈیویز کا کردار بطور مشیر، تل ابیب کے ساحل پر واقع دان اکارڈیا ہوٹل (Dan Acadia Hotel) کی ایک میٹنگ میں منظور کرلیا گیا۔ بن مناشے کو یاد ہے کہ ''ہم نے اس بات پر اتفاق کرلیا کہ وہ لندن میں ہمارا ہتھیاروں کا محافظ اور ایرانیوں اور دوسرے ڈیلروں کے درمیان وچولے کا کام کرے گا۔ اس کے گھر کا پتہ اورا کی سٹیشنری پر استعمال کیا جائے گا اور دن کے اوقات میں ہمارے ایرانی رابطہ کار اس کے دفتر کا فون نمبر 822-2530 استعمال کریں گے۔

اس خدمت کے بدلے میں ڈیویز کو آر مز فار ایران آپریشن میں اپنا نیا کردار ادا کرنے پر مناسب فیس ادا کی جائے گی۔ اس طرح اس کی فیس کی رقم ڈیڑھ ملین ڈالر اس کے بلجیم اور لکسمبرگ بینک اکاؤنٹ میں جمع کرادی جائے گی۔ رقم کا کچھ حصہ جینٹ سے اس کی طلاق کا معاملہ سدھارنے پر خرچ ہوگیا۔ جینٹ کو یکمشت 50 ہزار ڈالر ادا کیے گئے۔ ڈیویز نے اپنے تمام قرضے بھی اتار دیے اور اپنے لیے ایک چار منزلہ نیا گھر خرید لیا۔ یہ اورا کا یورپین ہیڈ کوارٹر بن گیا اور اس کا فون نمبر 231-0051 اسلحہ ڈیلروں سے روابط کے لیے مخصوص ہوگیا جو صحافی کی نئی زندگی کا حصہ بن چکے تھے۔ اپنی فارن ایڈیٹر کی حیثیت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ڈیویز نے امریکہ، یورپ، ایران اور عراق کا سفر کرنا شروع کردیا۔

بن مناشے نے اس بات کو نوٹ کیا کہ وہ سفر کے دوران ہر جگہ اپنے آپ کو اورا گروپ کے نمائندے کے طور پر متعارف کراتا تھا، جسے بن مناشے نے پسند کیا۔ وہ میل ملاقاتوں کے لیے عموماً اختتام ہفتہ کا دن مقرر کرتا اور جہاز سے متعلقہ شہر پہنچ جاتا۔ وہ جو ہتھیار بھجوانے ہوتے، ان کا سودا طے کرتا اور ادائیگی کا طریق کار بناتا۔

سال 1987ء میں ایران کے صدر آیت اللہ علی اکبر ہاشمی رفسنجانی کو اورا کی طرف سے ایک برقی پیغام موصول ہوا جس میں ایران کو چار ہزار ''ٹو'' (Tow) میزائل کی بحساب 13 ہزار آٹھ سو ڈالر فی میزائل فروخت کا ذکر تھا۔ یہ برقی پیغام ان الفاظ پر ختم ہوتا تھا کہ ''نکولس ڈیویز اورا لمیٹڈ کا نمائندہ ہے اور اسے کنٹریکٹ پر دستخط کرنے کا اختیار ہے''۔

یہ مسرت کے لمحے اور اری بن مناشے، نکولس ڈیویز اور اس تمام منصوبے پر پس پردہ کام کرنے کی مضبوط ترین شخصیت رابرٹ میکسویل کے ذہن پر اظہار مسرت کے تھے۔ جب ڈیویز نے ہولی وڈ (Hollywood) میں بولے جانے والے یہ الفاظ دہرائے۔ ''دنیا میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے جسے مفت کا ناشتہ کہا جاسکے''۔

101

خواہشات کی تکمیل جب تسلسل کی ڈور پکڑ لے تو انسان خود کو خدائی کے مرتبے پہ فائز دیکھنے لگتا ہے۔ شکر گزاری کو پاؤں کی ٹھوکر میں رکھ کر غرور کی منزلیں طے کرتا چلا جاتا ہے۔

انحراف

رحمیٰ شاہد

نیاز احمد کے پاس قدرت کا دیا سبھی کچھ تو تھا، بس کی تھی (بظاہر) تو صرف اپنے نام لیوا کی۔ اپنی سانسوں کے بند ہو جانے کے بعد اپنی بے شمار دولت کو سنبھالنے اور اپنے نام کی مصنوعی تنفس دینے والی ہستی کی کمی تھی۔

نیاز انڈسٹریز ملک کی جانی پہچانی صنعتوں میں ایک نمایاں مقام کی حامل صنعت تھی جس کے زیر سایہ کئی اور صنعتیں وقت کے ساتھ ساتھ استحکام کی منزل کو پہنچنے کو تھیں۔

نیاز احمد کے والد عبدالمجید نے ایک چھوٹے سے کارخانے سے زندگی کا آغاز کیا۔ وہ کوئی خاندانی رئیس نہ تھے، نہ کوئی اُن سے ناطہ رکھتے تھے بس اپنی محنت اور لگن سے ایک چھوٹے سے کام کا آغاز کیا تھا اور پھر قسمت کی مہربانی کہیں یا نیاز کی صورت میں ملنے والی خوشی اور اس کے مبارک قدم کہ مٹی کو ہاتھ لگاتے تو سونے کی مہک آنے لگتی۔

حالات اور واقعات عبدالمجید کے حق میں تھے۔ سو خوابوں کی تکمیل کو پانا ممکن لگنے لگا۔ ترقی اور خوشیوں کی منزلیں خود چل کر ان کے قدموں کو چومنے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کا شمار ملک کے نامور صنعتکاروں میں ہونے لگا۔ ان کی خاندانی روایات کے مطابق کئی نسلوں سے ان کے ہاں پہلی اولاد بیٹا ہی ہوا کرتی تھی۔ یہ روایت اب بھی قائم تھی۔ ان کی زندگی کا چراغ بھی مردذات کے مضبوط شعلے نے ہی جلایا تھا۔ اب اس وسیع کاروبار کو سنبھالنے اور آگے بڑھانے کی ذمہ داری نیاز احمد کے

کندھوں پر تھی جسے اس نے بخوبی نبھایا اور اس کام کو ترقی کے چاندوں کی ڈوری میں باندھ دیا۔

خواہشات کی تکمیل جب تسلسل کی ڈور پکڑ لے تو انسان خود کو خدائی کے مرتبے پہ فائز دیکھنے لگتا ہے۔ شکرگزاری کو پاؤں کی ٹھوکر میں رکھ کر غرور کی منزلیں طے کرتا چلا جاتا ہے۔ ان کی نسل نے غرور اور عطائیت کے اس زیور کو برسوں پہنا۔ دیکھنے والوں نے کبھی رشک اور کبھی حسد سے دیکھا۔ کچھ نے خدا کی بے نیازی اور کچھ نے خدا کی رسی کے دراز ہونے سے تشبیہ دی۔ وقت کی رفتار اپنے ہونے کے احساس کو بنا محسوس کروائے آگے ہی آگے رواں دواں تھی۔

اس روز نیاز احمد کی شادی تھی، عبدالمجید اور بی بی جان اپنے بیٹے کے صدقے واری تھے، آخر ان کی نسل کے چلنے کا تسلسل کامیابی سے ہمکنار ہونے کو تھا۔ پوتے کو کھلانے کی خواہش ان کے لئے زندگی کی آخری اور انمول خواہش بن چکی تھی۔ اس سود کو وصول کرنے کے لئے وہ بے چینی سے تیار بیٹھے تھے۔ خدا کی بے نیازی اپنی آغاز کی پہلی کرن سے یا تو بندوں کو عطا کی بلندیوں تک لے جاتی ہے یا آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں کا راستہ دکھا دیتی ہے۔ نیاز احمد کی شادی کو دو سال کا عرصہ ہونے کو تھا لیکن رخشندہ بیگم کی گود پہلے دن کی طرح سُونی اور خالی تھی۔ بہتیرا علاج معالجہ کروایا مگر معاملہ خدا کی رضا سے آگے نہ بڑھ پایا۔

اُن کے خاندان میں دوسری شادی اور شادی کے بعد لڑکی کی ذات کی آمد کا تصور ناممکنات میں سے تھا۔ آخر نسلوں اس خاندان نے صرف اور صرف 'وارث' کا چہرہ ہی دیکھا تھا۔ اسی لئے انتظار کی کوفت اور کڑواہٹ نیاز اور رخشندہ کے حصے میں چلی آئی لیکن جلد ہی یہ انتظار اپنے اختتام کو پہنچا جب ڈاکٹر نے رخشندہ بیگم کو ماں بننے کی نوید سنائی تو مانو پورے خاندان میں خوشی اور تسکین کی لہر دوڑ گئی۔ خوشیوں کی آہٹ کو دولت کی شیرینی میں ڈبو ڈبو کر منایا گیا۔ پورے گھر میں جشن کا سماں رہنے لگا آخر عید سے پہلے عید کی خوشیاں آنے کو تھیں۔ نیاز احمد اور عبدالمجید کی نیک نامی اور دولت کے چراغوں کو جلانے اور آگے بڑھانے والا آنے کو تھا۔

ایک ایک دن انتظار اور خوشی کے لمحوں کو پوری شدت سے محسوس کیا جانے لگا اور دوسروں کو کروایا گیا۔ امید پیہم تھی کہ نسلوں سے چلی آنے والی روایت اپنے 'مسند خاص' پر ہی براجمان ہوگی۔ پہلا ہی ہوگا دوسرا کا تصور کسی نامحرم کے خیال کی طرح ذہن کی حدوں اور سوچ کی وسعتوں سے کوسوں دوری کے سفر پہ تھا۔ خدا نے اپنی خدائی کی رتی تو مخلوق کو دکھانی ہی ہوتی ہے۔ تب جب مخلوق مایوسی کے اندھیروں میں اپنے اعمال کی سیاہی کو آزمائش کی ڈور میں لپیٹنے لگے اور تب جب مخلوق خدا کے فیصلوں کو اپنی ذات اور ناشکری کے ترازو میں تولنے کو بے تاب ہو، مخلوق کی خدائیت کے بھرم کو ساری کا چونا تو لگنا ہی ہوتا ہے۔

غرور اور بندگی دریا کے دو کناروں کی طرح ہوتے ہیں۔ یہ نہ ملتے ہیں اور نہ ملنے دیتے ہیں۔ آخر وہ دن آ ہی گیا جس کا سب کو انتظار تھا۔ بچے کی پوزیشن کا مسئلہ درپیش ہوا جس کی وجہ سے خوشی کو وقت سے پہلے محسوس نہ کیا جا سکا۔ درحقیقت اگر خوشی کو وقت کی محتاجی ہو تو ہی وہ احساس کی دھن پر رقص کرتی ہے ورنہ کسی سُر کی طرح بکھرتی جاتی ہے اور احساس کی حدوں سے نکل جاتی ہے۔

نیاز احمد نے ہمیشہ کی طرح امید اور غرور کو ایک ہی نقطے کی تحریر بنائے رکھا 'وارث آنے کو ہے' وارث اور وراثت کا دنیاوی تصور تکمیل ہونے کو ہے۔ نیاز احمد کے محل نما بنگلے میں آج ڈاکٹروں کی پوری فوج قطار باندھے اپنے رابعہ کے آنے کی منتظر تھی۔ آخر تخلیق کے مرحلے نے

اذن کی نوید سنائی مگر خوشی کی رمق اجالے کی چاندی کی بجائے تاریکی کی مایوسی کالبادہ اوڑھ کے بیٹھ گئی۔

''یہ ناممکن ہے''۔ نیاز نے غصے اور غرور کی حدوں کو چھوتے ہوئے بے بسی سے کہا۔ ڈاکٹر ایسے شرمندہ کھڑی تھی جیسے سارا کیا دھرا اسی کا ہو۔ محل کی دیوار و در پر ماتم رقصاں ہوگیاں ملازموں نے یہی سمجھا کہ بیٹی ہوئی ہوگی جس نے اس خاندان کی روایتوں کو جڑوں سمیت ہلا کے رکھ دیا ہے۔ یہ خبر تو بعد میں چھپتے چھپاتے سامنے آ گئی کہ پہلا نہ دوسرا، تیسرا ہوا ہے۔ 'تیسرا' نقطہ قبولیت اور حاضری کی تحریر میں الجھنا چاہتا ہے۔ آن کی آن نسلوں کے اس باغی کو وطن بدر کرنے کا حکم صادر ہوا اور ایک ننھی سی جان قصوروار نہ ہوتے ہوئے بھی وطن بدر ہوگئی۔

رخشندہ سکتے کی کیفیت میں تھی وہ کبھی تخلیق کے اس شاہکار کو دیکھتی اور کبھی نیاز کے برسوں کے بنے ہوئے خدائیت کے بت ''ہمارے خاندان میں ایسا کبھی نہیں ہوا'' کو منہ کے بل گرتا دیکھتی۔ مگر جیتے جاگتے اس وجود کو قبولیت کا درجہ دینے کے حوصلے تو اس میں بھی نہ تھے۔ آخر اس 'موتی' کو 'رانو' کی جھولی میں ڈال دیا گیا جس نے اسے کسی قیمتی سرمائے کی طرح سمیٹ لیا۔ 'قدر والے' ناقدروں کے درباروں کے غلام ہوا کرتے ہیں۔ یہی دستور زمانہ ہے۔ منہ بند رکھنے کی قیمت بھی دی گئی اور روزی روٹی کا ذریعہ بھی مل گیا۔

رخشندہ دن بدن اپنے اندر کے خالی پن اور بے وقعتی کو اور زیادہ محسوس کرنے لگی۔ یہی احساس اور جلن اسے مار دیتی۔ یوں جیسے اس کے اندر کچھ نہ بچا ہو۔ اس کی ذات کا مان ریت کی دیوار کی طرح ڈھے گیا تھا۔ نیاز احمد کے کندھوں پہ جیسے کوئی بھاری بوجھ آ گرا تھا حالانکہ یہ بوجھ اتار پھینکا گیا تھا مگر کچھ احساس ہمیشہ بوجھ بن کر بڑھتے ہی جاتے ہیں۔ محل کے در و دیوار کسی نوحہ خواں کی طرح ماتمی دھن کی زد میں تھے۔ وقت نے آہستہ آہستہ ان کے جلتے ہوئے زخموں پہ مرہم لگانا چاہا مگر وقت نے ایک اور وار کیا۔ عبدالمجید قدرت کی (بظاہر) اس ستم ظریفی کی تاب نہ لاتے ہوئے موت کی آغوش میں چلے گئے۔ بی بی جان چپ ہو کر رہ گئیں۔ ایک طرف ان کے جیون کا ساتھی بچھڑ گیا اور دوسری طرف ان کا بیٹا اور واحد سہارا چپ کی مہر لگائے رہتا۔

وقت کا پرندہ اپنی پرواز کی جانب رواں دواں تھا کہ بی بی جان کے فیصلے نے چپ کی فصیلوں اور روایتوں کی زنجیروں کو ہلا کے رکھ دیا۔ وہ رانو سے اپنے خون کو واپس لے آئی تھیں وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کا خون رقص کے لوکیلے ہتھیاروں کا شکار ہو۔ نہ صرف یہ بلکہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ ایک فاؤنڈیشن، ایک ادارہ بنائیں گی جہاں ایسے بچوں کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کیا جائے گا۔ آخر کب تک قدرت کے اس فیصلے کا انکار اور سوگ منایا جاتا رہے گا۔ یہ فیصلہ مخلوق کا نہیں ہے جو مذاق اور بے قدری کی کتابوں میں محصور ہو کے رہ جائے۔ یہ فیصلہ قدرت کا ہے اور قدرت کی ہر حکمت اور فیصلے پہ صبر و شکر سے سرِ تسلیم خم کرنے کا نام ہی بندگی ہے۔ اپنے اختیارات اور خواہشات کی قربانی فلسفہ زندگی کی اصل ترجمان ہے۔

بی بی جان نے ''قدرت'' کے نام سے ایک ادارہ بنایا۔ یہ ایک بہت جرأت مندانہ اور بہترین فیصلہ تھا۔ اشتہارات اور تشہیری اداروں کے ذریعے ایسے بچوں کو ان کے ادارے کو سونپنے کی استدعا کی گئی تاکہ ان کو معاشرے کا فعال رکن اور جیتا جاگتا انسان ہونے کی سند دی جاسکے۔ کچھ شرپسند عناصر کی استہزائی باتوں نے ان کے قدموں کو نہ ڈگمگایا اور وہ مضبوطی سے جمی رہیں۔ آخر ان کے خاندان والوں کی حمایت اور خدا کی رضا جو اس میں شمولیت کا خاص درجہ پا چکی تھی۔

❀❑❀